مضامینِ فلک پیما

1936

فہرستِ مضامین

مضمون	صفحہ
اللہ میاں	۱
پجاری سے	۱۲
میں کیا ہوں	۱۳
بے صبروں کا دوزخ	۱۶
منوالے	۲۸
خود مختار رقاصہ	۲۹
مروجہ اُردو شاعری	۳۱
ابلیس اور عورت	۴۳
موت	۵۰
چاند	۵۱
فاتر العقل سورج	۵۳
میرا زینہ	۶۳
میں اُس کا بن گیا	۶۵
قاضی دیگ بر	۶۷
ایک شام	۷۱
دفینے	۷۳
دقّتیں	۷۴
کبھی تھے	۸۱
گنوار کی دعا	۸۳
لغات الجاہلین	۸۵
اور دقّتیں	۸۶
تسلّیاں	۸۹
میاں رحموں	۹۲
خدائی	۹۵
چشمِ بد دُور	۹۷
دلِ ناداں	۹۹
معترضہ جملے	۱۰۱
اُردو	۱۱۰

مضمون	صفحہ
ہوا	۱۱۲
شملے کی سڑکیں	۱۱۳
رفع دفع	۱۱۴
سنہ ۵۹۲۶ء	۱۱۹
بمبئی سے وینس	۱۲۴
شاید	۱۲۹
موریاں نوں نہ مار	۱۳۰
بچے کھیل رہے تھے	۱۳۲
تین خیال	۱۳۴
نئی تاریکی	۱۳۸
عشق	۱۴۲
گلہ	۱۴۴
ناہید	۱۴۶
کیا؟	۱۵۷
عدالتیں	۱۶۲
مرزا نتھو	۱۶۶
فلسفہ	۱۷۱
تنہائی	۱۷۵
کچھ جھوٹ کچھ سچ	۱۷۸
ہندوستان اور فرانس	۱۹۳
آنکھ کا جادو	۱۹۹
کہاں ہے؟	۲۱۱
پچیس اور تیس	۲۱۶
دو خط	۲۱۹
زیتا	۲۲۳
ساڑھی اور سوٹ	۲۲۸
مسافر	۲۳۳
شیطان اور بزرگ	۲۴۰
نفاست اور طلسم	۲۴۶
اقبال منزل کی نشستگاہیں	۲۴۹
صوفی اور ملحد	۲۵۱
پاپ لوگ کا دیباچہ	۲۵۶
بڑی کتابیں اور چھوٹے آدمی	۲۵۷
فلک پیما کے خطوط	۲۶۹
مشینوں کی موت	۲۷۴
زبان	۲۸۱

مضمون	صفحہ
الفاظ اور رنگ	۲۸۲
فلک پیمائیاں	۲۸۴
دلی خوشی	۲۸۶
روحانی باریکیاں	۲۸۷
رازِ حیات	۲۸۹
ایک سوال	۲۹۰
اقوال	۲۹۲
دائمی شباب	۲۹۴
اقوال	۲۹۷
یاد	۲۹۹
شہنشاہِ ہمایوں کے مقبرے میں	۳۰۱
پھندستان	۳۰۴
میرا سخت ترین نقاد	۳۰۷
نادیدہ	۳۱۵
ایک تصویر	۳۱۸
راگ کا جادو	۳۲۱
دریائے لطف	۳۲۲
بلبلہ ہے پانی کا	۳۲۴
اچھے سے پڑھنے والے	۳۲۸
گرام مرید	۳۳۱
مصلحانِ قوم	۳۳۲
نیک بخت اور ڈارلنگ	۳۳۴
رشتہ دار	۳۳۷
نئی دُکان	۳۴۱
چینی نظم کا تتبع	۳۴۵
پھوہڑ بیوی کی اکیاون لاکھ علامتیں	۳۴۶
از کجاست تا بہ کجا	۳۵۰
شملے میں گفتگو کا خون	۳۶۴
ایک خط	۳۶۸
جَو کی روٹی ۔ مٹی کا پیالہ	۳۶۹
نہ کھچنے والی تصویر	۳۷۸

دیباچہ

اپنے عزیز دوست کے مضامین کا دیباچہ لکھنا چاہتا ہوں ادھر خوشی ہے اُدھر دقتوں کا سامنا ہے۔ خوشی ہے کہ میرے ناچیز ملاحظات ان غیر فانی خیالات کے ساتھ منسلک ہو رہے ہیں دقت یہ ہے کہ کیا کہوں اور کیونکر کہوں کہ اُن کی شان کے شایاں ہو۔ میں مشّاق دیباچہ نویس نہیں باریک بیں نقاد نہیں ہاں اپنے دوست کا دوست ہوں اور ادبیات کا دلدادہ لیکن یہاں بھی دشواریاں ہیں دوست دوست کا ہمخیال ہوتا ہے لیکن میرا دوست جدت طراز ہے اور میں قدامت پسند ادبیات سے میرا شغف سکون پسندی کی بنا پر ہے لیکن میرے دوست کی فلک پیمائیاں زمین و آسمان کو تہ و بالا کرنے والی ہیں تعجب یہ ہے کہ باوجود ان مشکلوں کے یہ دوستی استوار ہے اور یہ مضامین میرے لئے دلفریب۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ میں با اصول نہیں یا کیا اس کا سبب یہ ہے کہ خود زندگی ہی محض منطق کے تابع نہیں اور خوشی کا مقام ہے کہ یوں تابع نہیں رہتی؟ فلک پیما کے خیالات ایک کاہل منجمد ہستی میں بھی کم از کم تھوڑی دیر کے لئے حرکت و حرارت پیدا کر دیتے ہیں۔

فلک پیما کے مضامین کا احاطہ کرنا اُن کے خیالات کو پرکھنا، اُن کے خیالات کی گتھیوں کو سلجھانا انتہائی دشواری کا کام ہے۔ اُن کی زبان سلجھی ہوئی اور سادہ ہے اور اُن کا طرزِ بیان نہایت دلکش اور البیلا لیکن اُن کے خیالات کو سمجھنے کے لئے کبھی غوطہ زنی کی ضرورت ہوتی ہے اور کبھی بلند پروازی کی۔ اس کی وجہ شاید اُن کا یہ فلسفہ ہے کہ:-

"میری تمام کوششوں کا مرکز یہ ہے کہ اپنے آپ کو نہ جانوں میں چاہتا ہوں کہ اپنے لئے ایک نہ یاد آنے والا خواب بنا رہوں"۔

اس لئے گو میرا مصمم ارادہ ہے کہ ان تمام مضامین کو جن میں سے ایک کے سوا باقی سب ہمایوں میں شائع ہو چکے ہیں اور جن کے متعلق میرا ہمیشہ یہ طرزِ عمل رہا ہے کہ مضمون پر ایک سرسری نظر ڈالی اُسے کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا اور واہ وا اور سبحان اللہ کہہ کر چھپنے کو دے دیا اب کتابی صورت میں طبع ہونے پر مکرر پڑھوں اور اُن سے لطف اُٹھاؤں کہ شاید اس طرح وہ میری زندگی کے یاد آنے والے خواب بن جائیں لیکن جس چیز کو محض کچھ نہ کچھ سمجھ کر اُس سے لطف اُٹھایا جا سکتا ہے اُس کو پوری

طرح سمجھنے اور تجزیہ کرنے کا کام میں اب بھی کسی نکتہ رس نقّاد پر چھوڑے دیتا ہوں۔ گویا میرا جی یہی چاہتا ہے کہ فقط اِن پھولوں کے رنگ و بُو سے لُطف اُٹھاؤں اور اِن کی "چیر پھاڑ" کا کام کسی ماہرِ نباتات کے سپرد کر دُوں۔

اِن مضامین کی ترتیب ناممکن نظر آئی۔ اکثر مضامین کے اندر مختلف موضوع یک جا ہو گئے ہیں۔ اگر شروع متانت سے ہے تو انجام ظرافت پر ہے یا ظریفانہ مضمون ہے اور بات بات میں گہرا فلسفہ ہے یعنی ایک ہی پیالے میں رنگا رنگ کا پانی ہے پھر اِسے کہاں رکھیں اور اُسے کہاں؟ میں سمجھتا ہوں کسی کو کہیں بھی رکھ دیں فلک پیما کا جلترنگ ہمیں ہر حال میں مسحور کر دے گا! مصنف سے پوچھا تو انہوں نے بھی یہی مشورہ دیا کہ جس طرح یہ مضامین ہمایوں میں شائع ہوئے اُسی ترتیب سے شائع ہو جائیں۔ جنوری ۱۹۲۲ء میں ہمایوں کا پہلا پرچہ شائع ہونے پر مجھے انہوں نے اپنا پہلا مضمون "میں کیا ہوں؟" دیا۔ اُس وقت سے لے کر آج تک اُن کے اچھوتے خیالات صرف ہمایوں کی زیب و زینت بنے رہے آخری مضمون جنوری ۱۹۳۶ء کے سالگرہ نمبر میں شائع ہوا۔ یہ مضامین جس ترتیب سے لکھے گئے اور ہمایوں میں چھپے اب سوائے پہلے دو مضامین کے بعینہٖ اُسی ترتیب سے کتابی صورت میں بھی چھپ رہے ہیں۔

فلک پیما کا نصب العین ہے کہ ہر انسان کی رگوں میں قوّت و مسرّت کا خون دوڑے اور یہ محض ایک خالی سا اصُول نہیں بلکہ خود اُن کی زندگی اس زبردست خیال کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ جنہیں اُن سے تعارف حاصل نہیں وہ اُن کے مطبوعہ مضامین میں اس کی جھلک دیکھ سکتے ہیں:-

"وہ نورانی موتیوں کا ہار جس کا نام زندگی ہے اور جس کے پرکھنے والے جوہری خدا اب ایشیا میں پیدا نہیں کرتا کیونکہ یہاں کے لوگوں کو مرنے اور مرنے کے قصّوں سے نہ فرصت ہوگی نہ وہ زندگی کا خیال کریں گے....."

"وہ خاتمِ سلیمانی جس کا نام کامیابی ہے اور جو سلطان صلاح الدین کے بعد مسلمانوں سے گم ہوئی اور سمندر میں سے یورپین اقوام کے ہاتھ ایسی آئی کہ اب کبھی نہ نکلے گی دہشت یہ ہے کیا لکھ گیا؟ میں کہاں کا ولی ہوں کہ....."

"اس دُنیا کی قسمت میں اگر ایک بدی تبسّم بننا لکھا ہے تو کیا رونے والوں نے یونہی اپنی عمریں کھو دیں؟"

"انسان کام کاج کی وہ مشین جس کے صاف رہنے اور بے شور چلنے کے لئے خوشی کے نایاب تیل کی اشد ضرورت ہے"

"جس ملک میں موت کے بعد آرزوئیں پوری ہونے کی آرزو ہو وہاں زندگی موت ہے۔"

"ہر انسان کا کم سے کم حق یہ ہے کہ ایک پوری کائنات ازل سے ابد تک محض اُس کی مرضی کے تابع ہو۔"

مضامین فلک پیما میرے سامنے ہیں کبھی اُن کی ورق گردانی کرتا ہوں کبھی اپنے منتخب کئے ہوئے فقروں کے انبار کو دیکھتا ہوں اور کبھی خاص خاص مضامین کے عنوانوں کو۔ یہ نقل کروں؛ اس کی طرف توجہ دلاؤں؛ "یہ فلسفہ" ہے "یہ عشق"، "اُردو" پر دیکھئے کیا لکھتے ہیں؛ نہیں نہیں "اللہ میاں" ایک شاہکار ہے یا پھر وہ دلفریب ڈراما "آنکھ کا جادو" لیکن یہ جادو جائز ہے تو پھر "ساڑھی اور سوٹ" اور "یاد" اور "رقیبیں" اور "اور رقیبیں" اور وہ ستم ظریف "مویاں نوں نہ مار" اور "بیبیوں اور۔ ان کا کیوں ذکر نہ ہو؛ اور "عدالتیں"، "انسان اور کتابیں"، "مشینوں کی موت"، "قاضی دیگ بر"، "رفع دفع"، "۱۹۲۶ء"، "نیک بخت اور ڈارلنگ" اور اُف وہ "معترضہ جملے" اور سب سے پیچھے لیکن کس سے نیچے وہ آخری مضمون وہ افسانہ جو تاریخ کو شرمندہ کردے "جو کی روٹی مٹی کا پیالہ" اور اِن پر ختم کردوں تو "بچھو بہرٹ بیوی کی ایکیا دن لاکھ عاشتیں" پڑی کراہیں؛ واقعہ یہ ہے کہ میں تو یہاں محض ایک فضول قوال اور ایک اور فہرستِ مضامین تیار کر رہا ہوں سو چھوڑوں اس گراموفونی نقل کو۔ اور قارئین کا وقت ضائع نہ کروں وہ بے تکلف جائیں اور اس نگارنگ نگارخانے کی خود سیر کریں!

خوب یاد آیا کسی نے کارلائل سے پوچھا تھا کہ مسیح بڑا ہے یا شیکسپیئر؛ اس نے کہا بلاشبہ شیکسپیئر! پوچھا کیوں؟ کہا شیکسپیئر میں ظرافت تھی مسیح اس سے معرا تھے۔ ہمارے بعض مصنفین یقیناً فلک پیما سے زیادہ بزرگ ہیں لیکن اُن میں متانت ہے ظرافت نہیں، فلک پیما کے ایک ایک مضمون میں متانت اور ظرافت اس طرح ملی جلی اور گُندھی ہوئی ہیں کہ تمیز کرنا قطعاً دشوار ہو جاتا ہے اور دُور نہ جائیے خود "فلک پیما" کا لفظ یہ داستان سنا رہا ہے۔

فلک پیما مصنف نہ تھے ہیں نے انہیں مصنف بنایا ہے کیسے؛ وہ تصنیف و تالیف اور شہرت طلبی سے بے نیاز تھے، ہمایوں نکلا "میں کیا ہوں" چھپا میرے تقاضے بڑھے، اُن کا قلم رواں ہوا فلک پیمائی کا نقاب اوڑھ کر وہ زمین والوں سے دُور اُڑا کئے گو رہ رہ کر جھانکتے بھی رہے سکراتے بھی رہے بجلیاں بھی گراتے رہے، اخیر میں یہ شیریں بلائیں جو پورے چودہ سال تک ہمایوں پر نازل ہوتی رہیں جمع ہو کر ایک دلکش کتاب کی صورت میں پیشِ نظر ہوئیں۔

پچھلے دنوں المنظر میں ایک ادبی صحبت میں آپ نے چند دوستوں کو بلایا کہ اُن سے ملیں، اُن میں لاہور کے ایک بیرسٹر ادیب بھی تھے کہنے لگے "میاں عبدالعزیز کو میں مدت سے جانتا ہوں اور فلک پیما سے بھی سالوں سے گویا نصف ملاقات تھی لیکن اس کا مجھے آج پتہ چلا ہے کہ فلک پیما میاں عبدالعزیز ہی ہیں"۔ اس سے معلوم ہوگا کہ وہ مصنفانہ شہرت سے کس قدر بے نیاز رہے ہیں۔ میرا تقاضا ہے کہ یہ کتاب شائع ہو رہی ہے +

میاں عبدالعزیز صاحب حاجی شیخ محمد عوض مرحوم (ساکن موچی دروازہ لاہور) کے چوتھے صاحبزادے ہیں۔ "جنوری ۱۸۸۱ء" میں پیدا ہوئے۔ گھر پر پورا قرآن مجید ختم کرکے "مولوی کاں" کے سکول میں داخل ہوئے۔ تیرہ سال کی عمر میں انٹرنس پاس کیا۔ ۱۸۹۹ء میں بی۔ اے میں پنجاب یونیورسٹی میں اوّل رہے۔ اس زمانے میں ان کی غیر معمولی قابلیت کے باعث ان پر والد محترم میاں محمد شاہ دین (ہمایوں) مرحوم کی خاص نظرِ عنایت رہی اور وہ ایک عرصے تک اُن کی ینگ مینز محمڈن ایسوسی ایشن کے سکرٹری بنے رہے۔ عبدالرشید چغتی (مرحوم)، شیخ عبدالعزیز (مدیر آبرو رم)، میر نیرنگ، شیخ عبدالقادر، میاں فضل حسین کالج میں یہ ان کے ہم عصروں میں تھے۔ ۱۹۰۱ء میں ایم اے پاس کرکے وہ اسلامیہ کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور میں تھوڑی مدت تک معلّمی کا کام کرتے رہے۔ اکتوبر ۱۹۰۲ء میں وہ ای اے سی کے مقابلے کے امتحان میں اوّل رہے اور سرکاری ملازم ہوگئے۔ جون ۱۹۲۶ء میں انہوں نے یورپ اور امریکہ کا سفر کیا۔ واپسی پر انہیں خان بہادر کا خطاب ملا اور وہ چار سال تک لیجسلیٹو اسمبلی میں سرکاری رکن نامزد ہو کر کام کرتے رہے۔ اکتوبر ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس کے سکرٹری مقرر ہوئے۔ اس کے بعد ساڑھے چار سال تک انبالہ کے کمشنر رہے۔ آخر اکتوبر ۱۹۳۵ء میں وہ پنجاب کے پہلے پنجابی فنانشل کمشنر مقرر ہوئے اور جنوری ۱۹۳۶ء میں پنشن پائی۔ آج کل وہ ریاست جے پور کے ریونیو ممبر ہیں۔ اس وقت اُن کی عمر ۵۵ سال ہے مگر ابھی اُن کو کام کرتے دیکھ کر اور باتیں کرتے سُن کر بڑھاپا اُن سے ڈرتا ہے اور دُور ہی دُور رہتا ہے۔ اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ! ——— میانہ قد، گٹھیلا بدن، جسمانی و ذہنی صحت سے فیض یاب، چہرے پر رونق، آنکھوں میں ایک مطمئن نگاہ، دل کے طوفانوں کی پردہ دار، اپنے کام میں ماہر، گوناگوں تفریحات سے لطف اندوز، غلطیوں سے بے پروا، ناشائستگی سے متنفر، حسن کا ہوشمند شکار، معاشرتی آزادی کا علم بردار، محفلوں میں خونِ حیات دوڑانے والے، الانفع رساں، غرض مند، سیاست، مذہب، فلسفہ اُس کے پھندے میں گرفتار، خود دار، متین، ظریف جس کے خیالات میں گریز در گریز، جس کی تحریر کی ہر دوسری سطر میں ایک نئی انوکھی اچھوتی بات، جس کی زبان میں آزادی بیشی، جس کی طرزِ بیان میں بے ساختگی ——— یہ ہے ہمارے فلک پیما کی ایک نامکمل سی تصویر جس پر پیشِ نظر مضامین اپنی

سہانے جھلملاتے رنگ، روشنی ... [illegible]

غلطیوں، کوتاہیوں، ناکامیوں کا وہ ناتمام ایڈیشن جس کا ماں باپ نے نام

عبدالعزیز

رکھا اور جو اپنے قلم کی آوارگی سے برائے نام

فلک پیما

بن گیا، پڑھنے والوں کے سامنے اس مجموعہ کو کیا لکھ کر پیش کرے ؛

یہ کہ اچھا ہوتا کہ میاں بشیر احمد خواہ مخواہ اِن دو کا باہمی تعارف نہ کراتے ؛ یہ غلط ہے کیونکہ یہ دونوں اب تک ایک دوسرے سے اجنبی ہیں اور کیا ہی اچھا ہو کہ پڑھنے والے بھی ان دونوں سے قطعی بلا تعارف رہیں، جو لکھا ہے اسے پڑھیں اور لکھنے والے کو بھول کر بھی یاد نہ کریں۔

عبدالعزیز کسی غیر معلوم حد تک جو کہتا ہے وہ کرتا ہے۔ غیر معلوم اس لئے کہ بالکل بھی اس انسانی شرافت سے معترا نہیں کہ کبھی کبھی بھول کر یا دانستہ کہے کچھ اور کرے کچھ اور۔ ایشیا کا انسان ہے یورپ کی مشین نہیں۔

فلک پیما بنتا بہت ہے۔ اگلے وقتوں کے مجاہدوں کی شان سے ہر اس تقدیس کو مٹانا چاہتا ہے جو لوگوں کے دلوں پر نقش کالحجر ہے۔

اگر ان پتھر دلوں میں صدائے بازگشت کی کچھ لیاقت موجود ہوئی تو شاید فلک پیما کا یہ پیغام

"زندگی کا لباس غرور سے پہنو جیسے کوئی بادشاہ تاج پہنتا ہے"

کوئی سن لے ورنہ یہی چرچا ہوگا کہ ایسے بہت سودائی آئے اور چل دیئے۔

بہر حال تقدیر کے دروازے پر کان لگائے کھڑا ہے اور بعض باتیں اُس دنیا کی کہہ جاتا ہے جو ابھی بنی کبھی نہیں۔

پڑھیئے، لُطف اُٹھایئے اور بُھلا دیجئے

یا

پڑھیئے، خوب خفا ہوجیئے اور یاد رکھئے۔

میاں عبد العزیز

۱

اللہ میاں

اللہ میاں میں حاضر ہوں۔

کیا کہا کہ اب تک کہاں تھا؛ اللہ میاں یہ نہ پوچھئے۔ کیا ارشاد ہوا کہ ضرور کہوں؛ اللہ میاں کیوں مجھ سے کہلواتے ہو؛ کوئی مولوی غصے میں آگیا تو مصیبت پڑ جائے گی ہیں ہیں یہ کیا ہوا؛ اللہ میاں تم تو خفا ہو گئے، میری تو بسم اللہ ہی غلط ہو گئی۔ کیا کہا کہ مولوی کا لفظ سننا ناگوار ہے؛ مولویوں سے تنگ آگئے ہو؛ مگر اللہ میاں انصاف کی بات تو یہ ہے کہ اب تمہاری خاطر یہ لوگ چھوڑے تو نہیں جا سکتے! کیا کہا کہ کیوں؛ اللہ میاں تمہاری جانے بلا۔ نہ تمہارے کسی سے تعلقات، نہ باپ دادا کے وقت سے مراعات، تم اپنی بے نیازی میں مگن ہماری کٹھن زندگی کو کیا سمجھو؛ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بدتر سے بدتر مسلمان بھی ایسا نااہل ہو جائے کہ لحاظ، وضع بالائے طاق اور قوم سے غداری؛ کیا کہا کہ اس میں کیا مشکل ہے؛ اللہ میاں بڑی بھاری مشکل ہے۔ اللہ میاں تم اپنی تنہائی میں یکتا کنبہ، برادری، میل جول، شادی بیاہ، جلسوں اور جنازوں کا کیا اندازہ کر سکتے ہو؛ اللہ میاں سچ تو یہ ہے کہ خدا ہونا آسان ہے انسان بننا مشکل ہے۔ بازو جب ٹوٹے تو گلے سے بندھتا ہے۔ اب تو مارو یا چھوڑو، ان مولویوں سے ہمیں محبت نباہنی ہی پڑے گی۔ کیا کہا کہ کوئی اور بات کروں؛ اچھا اللہ میاں تھینک یو کہ تم نے اصرار نہیں کیا کہ بتاؤں کہ اب تک کہاں تھا اور ہاں اللہ میاں عقل کی باتیں، نیکی کی باتیں تو جو لوگ تم سے روزانہ ملتے ہیں وہ ضرور سناتے ہی ہوں گے مجھ سے باتیں سننی ہیں تو میری لغویات سنو! کیا کہا کہ ہاں ضرور سنو گے؛ اچھا اللہ میاں! میں کبھی کوئی بات چھپائے نہ رکھوں گا۔ اللہ میاں مسکراتے کیوں ہو؟ کیا یہ مطلب ہے

کہ مَیں جھُوٹ بولوں گا ! کیا کہا کہ وقت ضائع نہ کروں اپنی داستان شروع کروں ؛ اچھا اللہ میاں سنئیے ! مجھ پر تو یہ تمہارا احسان کیا کم ہے کہ تم نے محض میری خوشی کے لئے کتنے لاکھوں جھُوٹ بولنے والے انسان بنائے اور پھر انہیں کیا کیا رُتبہ دیا ؛ نہیں اللہ میاں ناول نویس نہیں ! وہ بچارے تو پھر کچھ سچ بولتے ہیں میرا اشارہ شاعری کے اُن شاہنشاہوں کی طرف ہے جنہوں نے کہیں زوان کا قلعہ آراستہ کیا، کہیں تناسخ کی ندی جاری کی، کہیں یزدان اور اہرمن کو ایک دوسرے سے بھڑوا دیا اور اللہ میاں یہ جھوٹ ہیں کس قدر پیارے ؛ اللہ میاں وہ بھی تم نے بنائے جو تمہارے نام پر ہر وقت سائنس اور مذہب کا عقد کر دینے کو تیار ہیں۔ محض میری تفریح کے لئے ؛ اللہ میاں کس قدر تم نے سوچا ہوگا ؛ پہلے مجھے پڑھایا لکھایا ساتھ ہی مطالعہ کا شوق دیا اور سوچنے کے قابل بنایا۔ اور پھر یہ سمجھ کر کہ میرا مطالعہ بے لطف رہیگا تم نے مجھ سے ہزاروں سال پہلے ہی وہ لوگ بھی بنا دیئے جن کی باتوں پر ہنستے ہنستے انسان لوٹ جائے۔ اللہ میاں کیا کہا کہ غنیمت ہے کہ کبھی بات سے تو کوئی انسان تم سے خوش ہے ؛ اللہ میاں ہیں تو ضرور خوش ہوں ! کیا کہا کہ اور زیادہ خوش رہوں ؛ اچھا اللہ میاں یہ بھی کوشش کروں گا مگر سچ تو یہ ہے کہ اور لوگوں کی طرح مجھے خوشی کی طمع نہیں۔ اللہ میاں بات یہ ہے کہ خالی خوشی سے تو وقت نہیں کٹتا اور انسان خوشی کو ہضم کس چیز سے کرے ، اچھے اللہ میاں یہ بات تو بتا دو ! اللہ میاں بس یہ بات اچھی نہیں کہ مطلب جب آتا ہے تو تم خاموش ہو جاتے ہو۔ کچھ تو ہوں ہاں کرو۔ اچھا اللہ میاں ! خوشی کو ہضم کرنے کی معجون نہیں بتاتے تو ایک بات اَور بتا دو یعنی یہ کہ کونسا پوڈر ملوں کہ تم مجھے خوبصورت سمجھو ! سجدے والا ابٹنا تو بہت پُرانا ہو گیا۔ اللہ میاں ! شرارت سے بھی تو چہرہ چمک اُٹھتا ہے شرارت کا غازہ مل لوں ؛ اللہ میاں ! تم تو پھر چُپ ہو گئے ! کیا کہا کہ کوئی اور بات کروں ؛ اچھا اللہ میاں کوئی اور بات کروں گا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ یہ تمہاری کانفیڈنشل (Confidential) باتیں ہیں کہ انسان خوبصورت کیسے ہو اور خوشی کی غذا کو کس چُورن سے ہضم کرے ؛ ہاں اللہ میاں خوب یاد آیا۔ ایک دن مَیں خواہ مخواہ اپنے آپ کو بُرا

بھلا کہہ رہا تھا کہ مجھے خیال ہُوا کہ تم نے روک دیا کہ فضول وقت مت ضائع کرو یہ کھیل بڑے آدمیوں کا ہے۔ یاد ہے اللہ میاں، اُس دن بہت کوشش کی کہ اپنی روح کو بھی بدل ڈالوں، تم سے نئی اُجلی سی رُوح مانگ لوں مگر یہ بات حاصل نہ ہوئی۔ اللہ میاں یہ کیا بات ہے کہ گمراہوں کے لئے تم نے نبی بھیجے۔ لاکھوں اوروں کی اصلاح ہوگئی میری نہ ہوئی؛ کچھ نہیں بتاتے؛ کیا کہا کہ یہ باتیں چھوڑوں اپنی کج بحثی کے قصّے سناؤں؛ اچھا اللہ میاں میری کج بحثی کے قصّے سُن لو۔ ایک دفعہ مَیں دو معمولی سی باتیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک یہ کہ زیادہ نیک ہونا بڑا بھاری گناہ ہے۔ ٹھیک ہے نا اللہ میاں؛ یہ کیا بات ہے اللہ میاں کہ تم مشورہ نہیں دیتے؛ ہاں میں یہ کہہ رہا تھا کہ زیادہ نیک ہونا گناہِ کبیرہ ہے اور مثال یہ دے رہا تھا کہ ایک نوجوان لڑکے کی دو بہنیں ہیں جو باوجود حسین اور فہیم ہونے کے نیکی کی معصیت میں گرفتار ہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ اس لڑکے کی آنکھوں میں ان دو کا نمونہ کچھ ایسا سما گیا ہے کہ شاید اب تمام عمر وہ مختلف لڑکیوں کو ردی کی ٹوکری میں پھینکتا رہے یہ ہے ان دو لڑکیوں کی نیکی کی برائی اور میں اپنے سامعین پر یہ واضح کر رہا تھا کہ کسی شخص کا حق نہیں کہ وہ غیر معمولی طور پر نیک ہو کیونکہ غیر معمولی نیکی دُنیا کے محدود راس المال پر ایک مذموم قسم کا غصب ہے مگر میرے سامعین کے دل ختم اللہ علی قلوبھم والے دل تھے! ایک نے میری بات نہ مانی! اللہ میاں کیا کہا کہ تم نے کسی کے دل پر مہر نہیں لگائی؛ اچھا اللہ میاں! یوں ہی ہوگا! اُنھوں نے خود لگا لی ہوگی! ہاں اللہ میاں دوسری سیدھی سی بات جو لوگوں کو مَیں سمجھانا چاہتا تھا وہ یہ تھی کہ نیکی کو بدی میں بدلتے رہنا حقیقی مذہب ہے۔ اللہ میاں کیا کہا کہ مَیں مضمون چور ہوں اور یہ خیال کسی اور کا ہے؛ اللہ میاں خفیف سا حصہ اس میں ایک اور شخص کا ہے ورنہ آج تک زبان سے وہ بات نہیں نکالی جو خود اپنی نہ ہو۔ ہاں اللہ میاں اس شخص نے کہا تھا کہ ترقی یہ ہے کہ نیکی کو بدی بناتے رہو۔ میرا خیال ترقی کا نہیں! سوسائٹی چاہے ترقی نہ بھی کرے مذہب کی محتاج ہے مَیں

ایک اٹل قانونِ فطرت بیان کرتا ہوں وہ شخص ایک عارضی کیفیتِ ارتقار کا نقاش تھا۔ اللہ میاں جب چیچک کا ٹیکا نہ تھا اور نالیاں صاف رکھنے کی تجاویز نے عملی جامہ نہ پہنا تھا تو یہ نیکی تھی کہ ہر قسم کی وبا کو تیرا قہر اور اپنے گناہوں کی سزا سمجھ کر تسلیم و حمد سے قبول کیا جائے۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس نیکی کو بدی میں بدل دیا جائے یعنی جو شخص وبا کے معاملہ میں کہے "اللہ کی مرضی" اُسے کافر قرار دیا جائے اور جو شخص ٹیکے اور صفائی میں مدد نہ دے اُسے بدترین گنہگار قرار دیا جائے یعنی اللہ میاں پیشِ نظر ترقی نہ ہو بلکہ تمہاری خوشی یعنی یہ کہا جائے کہ اب تمہارا حکم ہے کہ وبا کو گناہ سے یا قہر سے کوئی واسطہ نہیں یعنی تمہارے نام سے یہ کہا جائے کہ جو صاف نہ رہیں گے، صاف ہمسایوں میں نہ رہیں گے، صاف شہر اور صاف ملکوں میں نہ رہیں گے وہ مریں گے بھی بری طرح اور مر کر اُٹھیں گے بھی بری طرح۔ یہی اللہ میاں تمہارا حکم ہے نا؟ ہاں تو اللہ میاں لوگوں میں یہ سمجھا رہا تھا کہ اپنی پرانی غلیظ نیکیوں کا منہ دھو ڈالو اور انہیں سوٹ بوٹ پہنا کر ایسی طرح بدل دو کہ وہ گناہ کی طرح دلفریب اور دلکش ہوں۔ یہ ہے میرا خیال اللہ میاں! نہ اس خشک مغز کا خیال کہ ترقی یہ ہے کہ نیکی کو گناہ بناتے رہو! میں تو چاہتا ہوں کہ پرانے گناہوں کی کشش کے عطر سے دنیا کو معطر کروں ورنہ اگلے زمانے کی نیکیاں اگلے زمانے کے گناہ میرے کس کام؟ جب کوئی بھوکا ننگا ہی نہ ہوگا تو خیرات خود بخود ایک فضول حرکت بن جائیگی جب ہر بچہ سن بلوغ سے پہلے ہی دس بیس دفعہ دنیا کے گرد چکر لگا لے گا تو حج کے سفر میں کیا صعوبت باقی رہ جائے گی اور بدو بیچارے کہاں حاجیوں کو پتھر ماریں گے؟ میرا نقطہ خیال اللہ میاں بہت بلند ہے اور وہ یہ ہے کہ حقیقی نیکی صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ تجھے حاصل کر کے بھی محض از راہِ محبت اپنے آپ کو تیرا بندہ سمجھنا یعنی جب تک تُو حاصل نہ ہو نیکی کا نام لینا بھی فضول ہے۔ وہ ذرائع جن سے تُو حاصل ہوتا ہے اور جنہیں غلط العام میں نیکی بیان کیا جاتا ہے بدلتے ہیں اور بدلتے رہنے چاہئیں. جو آج ٹھیک ہے وہ اسی صورت میں ٹھیک ہے کہ کل وہ غلط ثابت ہو اور انسان کی قسمت ہے

کہ وہ جھوٹ پہ پلے۔ خیر یہ بات میں لوگوں کو سمجھا رہا تھا۔ کسی نے کہا دہریہ ہے! کسی نے کہا باولا ہے !! اللہ میاں اس لفظ پر تو تم بہت ہنسے! اچھا اللہ میاں اب میں لوگوں سے کہوں گا کہ مجھے یہی کہیں کیونکہ اس سے تم خوش ہو مگر اللہ میاں اتنا ذمہ تم لے لو کہ یہ بات اُن کی سمجھ میں آ جائے۔ اسی وقت ایک صوفی صاحب کہنے لگے کہ "لوگو اس شخص پر کلام پلٹ پڑا ہے اسے کچھ نہ کہو"۔ لوگوں نے اس صوفی کا پیچھا لے ڈالا کہ "بڑا آیا ہے وہاں سے خدا رسیدہ۔ ایسے کافر کی حمایت کرتا ہے!" اللہ میاں بڑا لطف آیا۔ اُس دن تیرا ایک نقلی دوست (یعنی وہ صوفی) ایک تیرے اصلی (دشمن کہوں کہ دوست اللہ میاں؟ کیا کہا کہ نادان دوست کہہ دوں! اچھا یوں ہی سہی!) نادان دوست کے کام آ گیا۔ اللہ میاں اس غریب صوفی کو معاف کر دے اور اسے تصوف کی ذلت سے بچا کر معرفت کی وردی پہنا دے! کیا کہا کہ تمہارے کاموں میں دخل نہ دوں؟ اللہ میاں تو تم دخل دینے دیتے کب ہو؟ برسوں کے بعد تو یہ موقع ملا اور یہ بات بھی یُونہی بے ساختہ زبان سے نکل گئی۔ پرانی کمبخت بھیک مانگنے کی عادت اب تک نہ گئی۔ کیا کہا کہ معاف کر دیا؟ اچھا اتھینک یُو۔ اللہ میاں معلوم ہوتا ہے کہ بھولے کی لغزش تم کبھی کبھی فوراً معاف کر دیتے ہو! کیا کہا کہ اگر معافی مانگتا تو معاف نہ کرتے؟ ہاں ٹھیک تو ہے اللہ میاں! جس کمبخت کو تم پر اتنا بھی اعتبار نہ ہو کہ تم بن معافی مانگے بھی معاف کر دیتے ہو تو اسے تم معافی مانگے پر کیوں معاف کرو؟ یہ تو اللہ میاں انصاف ہے۔ اس میں تمہیں کوئی بُرا نہیں کہہ سکتا۔

اللہ میاں میں سمجھا نہیں کہ کیا تم نے پوچھا؟ وہ بات! اللہ میاں تمہیں خوب وہ بات یاد ہی! اللہ میاں سچ تو یہ ہے کہ تمہارے نام پر کج بحثی میں مجھے بے انتہا لطف آتا ہے میں دل ہی دل میں تمہیں یاد کر لیتا ہوں لوگ سمجھتے ہیں کہ بڑا دہریہ ہے۔ انہیں کیا پتا کہ دیوانہ بکار خویش ہشیار!۔ ہاں اللہ میاں تو بات یہ تھی کہ میں نے کہیں کہہ دیا کہ بھئی مجھے تو پرانا بوسیدہ صدیوں کی

ذمہ داری تلے دبا ہوا خدا درکار نہیں بلکہ میں نے یہاں تک کہہ دیا کہ سیکنڈ ہینڈ (-second
hand-) کپڑا پہن لیں مگر سیکنڈ ہینڈ خدا ہرگز نہیں ۔ تم تو بالکل نوجوان ہونا اسد میاں ؟ کس قدر
یہ لوگ باتیں بناتے ہیں کہ تم وہی ہو جو تھے ! اتنا نہیں سوچتے کہ جس میں خدا ہو کر بھی شباب نہ
ہو اُسے خدائی کا کیا مزہ ۔ اللہ میاں کیا کہا کہ مجھے اس گستاخی کے بدلے پھونک دو گے ؟ اسد
میاں ہرگز نہیں ۔ تم خوب جانتے ہو کہ دُنیا میں گنہ ضرور ہے مگر گنہگار کوئی نہیں ۔ اسد میاں کیا
کہا کہ اس بات کا چرچا کروں گا تو ضرور سزا پاؤں گا ؟ اللہ میاں میں نہیں مانتا ۔ اسد میاں کیا
کہا کہ شاباش ؟ ۔ اچھا اللہ میاں تھینک یُو مگر تم تو بڑے اُستاد ہو اور جو سچ مچ ڈر جاتا ؟ کیا کہا کہ جو
میں ڈر جاتا تو مجھے سیدھا جہنم بھیج دیتے ؟ اسد میاں بات تو ٹھیک کہتے ہو ! ڈرنے والوں کے
لئے جہنم ہی ٹھیک ہے ۔ اسد میاں میں نے تو شروع سے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ دو مصیبتیں اکٹھی
برداشت نہ ہونگی ۔ یعنی ایک یہ کہ تجھ پر ایمان لائیں اور دوسری یہ کہ ڈریں ۔ بندے نے تو پہلی
مصیبت انتخاب کر لی ۔ اب جس کا جی چاہے وہ ڈرے ۔ ہم سے تو یہ نہیں ہوتا کہ تو بھی ہو اور
تیرا ڈر بھی ہو ۔ اسد میاں تو اکیلا ہی کافی ہے ۔ اسد میاں ایک بات پوچھنی تھی ؟ کیا کہا کہ پوچھوں ؟
ہاں تو اسد میاں گناہ تو تم معاف کر دو گے بشرطیکہ معافی مانگی نہ جائے مگر نیکی کون معاف کریگا ؟
کیوں اسد میاں جواب کیوں نہیں دیتے ؟ یا کہیں یہ مطلب تو نہیں کہ نیکی رہی جو رسمی نیکی ہے)
قطعی طور پر ناقابلِ تلافی ہے ؟ اچھا نہ بتاؤ ۔ کبھی نہ کبھی تو یہ عقدہ بھی کھل ہی جائے گا ۔ اسد میاں کیا
بات پوچھی ؟ بنئے والی ؟ اللہ میاں وہ بات تو میں بھول ہی گیا تھا ۔ کیا کہا کہ اب میرا کیا خیال ہے ؟
اسد میاں بڑی دیر کی بات ہے کہ ایک دِن یونہی میرے منہ سے شکر کا کلمہ نکلا کہ شکر ہے کہ خدا
نے ہندوستان میں پیدا کر کے بھی مجھے بنیا نہیں بنایا ۔ اِس بات پر اسد میاں تم بہت بگڑے اِدھر
میں بھی جل گیا کہ اسد میاں کی جو بات ہے نرالی ۔ سید کی جائداد بنیا اُڑا لے اور اسد میاں بس

دیکھا کرے۔ خیر اِدھر میں پیچ و تاب میں تھا اُدھر اسد میاں تمہیں یہ ضد تھی کہ بنئے کو کوئی بُرا نہ کہے کہ مسٹر سمتھ آ گئے ۔ مجھے درہم برہم دیکھ کر کہنے لگے کہ کیا بات ہے ؛ اس انگریز کو اصل بات تو میں نے نہ بتائی مگر اس سے پوچھا کہ تم اِس ملک میں اجنبی ہو تمہاری بنیوں کی نسبت کیا رائے ہے ؛ سوچ کر کہنے لگا " ول بنیا بہت اچھا لوگ ہے ۔ وہ دولت جمع کرکے کارخانے بناتا ہے ۔ ہمارے ملک کی مشین خریدتا ہے ۔ انکم ٹیکس دیتا ہے ۔ بنک میں روپیہ رکھتا ہے ۔ بنیا بہت کام کا آدمی ہے " یہ تھی اس کی رائے ۔ جواب میں اسے میں نے یہ کہا کہ بنیا غریب کا خون چوستا ہے ۔ اس پر اس انگریز نے کہا کہ غریب آدمی کو خدا اسی لیے بناتا ہے کہ ہشیار آدمی اُس کی محنت سے فائدہ اُٹھائے خیر اسد میاں اُس سے تو بات ختم ہوئی مگر میں پھر سوچنے لگ گیا کہ اسد میاں اس قدر غریب آدمی کیوں بناتا ہے ؛ کیا اسے غریب پیارے ہیں ؛ بہت دیر تو یہی میرا خیال رہا کہ تمہیں غریبوں سے محبت ہے اگر پھر مجھ پر واضح ہُوا کہ نہیں در اصل تمہیں بنیوں سے محبت ہے اور غریب آدمی تم اپنے لئے نہیں بناتے بلکہ بنیوں کے لئے ۔ خیر تمہارے کام میں مجھے کیا دخل ؛ ہاں مگر اسد میاں اُس دن تمہاری ایک بات پر بہت تعجب ہُوا ۔ پوچھا تھا کہ تم نے مسلمانوں کو کیوں چھوڑ دیا ؛ تم نے جواب میں کہا کہ ہرگز نہیں ۔ پھر جو میں نے پوچھا کہ اسد میاں تم کن مسلمانوں کے ساتھ ہو تو اسد میاں تم نے کہا جاپان میں ۔ پھر جو پوچھا کہ وہاں کون مسلمان ہیں تو اسد میاں تم نے کہا کہ مسلمان وہ ہے جو محنت سے کام کرے ، تھوڑا کھائے ، بہت نہائے ، ہر وقت مسکرائے اور میرا نام لے کر طارق کی طرح رخشِ عمر کو غلطی کے سمندر میں ڈال دے ۔ پار لگانا میرا کام ہے ۔ یہی بات پوچھتے تھے نا اسد میاں ؛ مگر اسد میاں میں تو اس نئی تعریف سے ایسا ڈرا کہ اسے اب تک چھپائے رکھا آج تمہارے پُوچھے پر ظاہر کرتا ہوں ۔ مگر اسد میاں سینکڑوں دفعہ جی میں آیا کہ لوگوں سے کہوں کہ "بھئی نمازوں کو صدیوں ہم سب نے آزمایا ۔ اسد میاں بھی اکتا گیا ہوگا کہ یہ کمبخت فرصت ہی نہیں

دیتے۔ آؤ نمازوں کو چھوڑ کر دیکھیں!" اسد میاں کیا کہا کہ پھر اب تک یہ بات کیوں نہ کہی؛ اسد میاں میری کمزوری۔ کیا کہا کہ بنتا بہت ہوں؛ ہاں اللہ میاں یہ بھی کمزوری مجھ میں ہے مگر اسد میاں مجھے بالکل ہی فیل تو نہ کرو۔ کیا کہا کہ نہیں یہ خیال نہیں ہے۔ اچھا تو اسد میاں یہ کام کیسے ہو کہ مذاق مذاق میں مسلمان کام کے آدمی بن جائیں؛ کیا کہا کہ کوشش کروں! اسد میاں کچھ تم بھی تو مدد کرو! تمہیں کیا پتا کہ مسلمان کی کھوپری کیا آفت ہے؛ گولی سے یہ نہ پھٹے، علم سے یہ نہ پھوٹے، عقل سے عاری اور دولت پر بھاری کچھ تم اسے قدرے نرم کر دو!۔ کیا کہا کہ مسلمان بجائے تمہارے ہاتھ بکنے کے تمہیں خریدنا چاہتے ہیں اور یہ تمہیں ناگوار ہے؛ بچارے مسلمان خود بھی کچھ نہ بنے اور تم سے بھی گئے!

اچھا اسد میاں ایک بات اور بتا دو! کیا کہا کہ پوچھوں؛ ہاں اسد میاں میں کیا کروں؛ کیا کہا کہ جو جی میں آئے کروں؛ نہیں اسد میاں یہ بات نہیں۔ میں چاہتا ہوں تم کچھ میرے جی میں ڈال دو۔ نہیں؛ اچھا یہ بھی نہیں تو پھر یہ کرو کہ میرے دل میں رہا کرو۔ کیا کہا کہ اچھا؛ اسد میاں تم تو میرے ہو نا؛ اسد میاں میں تمہیں کسی کو مانگے نہ دوں گا۔ لوگوں کی طرح گلی کوچے میں تمہارا ذکر نہ کروں گا۔

اسد میاں! اسد میاں! اب کیوں نہیں سنتے؛ کہاں گئے؛

ارے ابھی تو مجھے کیا کچھ کہنا تھا۔ اسد میاں تم سنتے تو تمہیں سناتا کہ کل رات تمہیں کس کس طرح یاد کیا۔

۲

اسد میاں! وہ حقیقی بیداری کی زندگی جس میں تم اور میں رُو در رُو تھے کس قدر جلد ختم ہوئی؛ اب پھر وہ کمبخت خواب ہے جس میں زر کے زور سے عقل فرمانروائے کار ہے، جس میں آج اور کل کا

گورکھ دھندا ہے۔ اسد میاں! اسد میاں!! سنتا نہیں دیکھ! دیکھ!! عقل کس طرح میری گردن دبوچے ہوئے ہے!
اسد میاں اس خواب میں میرا ہونا اور تیرا نہ ہونا دونوں غضب ہیں۔

اسد میاں! کاش ذرا تم اَور ٹھہرتے! ایک بات تم سے کہتا۔ تمہیں بتلاتا کہ باوجود اِس مساوات کے کہ تم میرا خواب ہو اور میں تمہارا خواب ہوں (اور یہ کون کہے کہ دونوں میں سے کس کا خواب بہتر ہے ؟) میں تم سے معذرت کرتا۔ تم سے صرف ایک جملہ کہتا۔

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا

اسد میاں! تم خود سمجھ لیتے کہ کس کا حق کس نے ادا نہ کیا مگر میرا مطلب یہی ہوتا کہ قصور میرا تھا۔ اسد میاں! اسد میاں!! دیکھ! عقل کمبخت مجھے کھائے جا رہی ہے مجھ سے کہتی ہے کہ میرا جسم اپنا نہیں۔ اس پر ملک کے، شہر کے، ہمسایوں کے، ماں جایوں کے حقوق ہیں۔ کہہ رہی ہے کہ میرے خیالات میرے اپنے نہیں کیونکہ وہ عکس ہیں اُن حالاتِ گذشتہ و حاضرہ کا جن کا ظہور میرے قربِ ذہنی میں وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔ کہہ رہی ہے کہ ندی میں اگر ابر کی پرچھائیں ندی کی جدّتِ طبع کا نتیجہ ہے تو میرے خیالات بھی میرے اپنے ہو سکتے ہیں ورنہ ہرگز نہیں۔ اسد میاں جب نہ جسم نہ خیال کچھ بھی میرا اپنا نہیں تو دُنیا مجھ سے چاہتی کیا ہے ؟۔ میرے کچھ نہ ہونے پر یہ دُنیا مجھ پر کیوں اس قدر حاوی ہے ؟ اسد میاں! جلدی پہنچ نہیں تو عقل مجھے مٹا دے گی! اسد میاں! تم نہیں آتے! اچھا وہ تو سُن لو کہ تمہیں کس طرح یاد کیا! اسد میاں! میرا ایک بھائی ہے جو حاجی اور حافظ ہے اور تمہیں دوست بھی رکھتا ہے۔ اسے اپنا دوست بنا کر تمہیں میں یُوں یاد کر رہا تھا۔

اے دوست!

سورج اور تاروں کا، چاند اور بادلوں کا ذکر تو کر دوں مگر زبان کہاں سے لاؤں ؟ کس خلوص کس تپاک سے فطرت کے یہ معجزے انسان کو اپنی طرف مائل کرتے ہیں ؟ ان کی ثقاہت میں کیا

رعنائی ہے؟

اے دوست!

کیا تم نے سورج کی (Courtesy) پر کبھی غور کیا ہے؟ سورج میرا اُستاد ہے تو چاند میرا بھائی جسے گھٹنے بڑھنے کا گلہ نہیں، جیسے نور اور سایہ برابر ہیں۔ استاد کو یا بھائی کو ترقی کی فکر نہیں، تنزل کا غم نہیں اور ہو تو کیوں ہو؟ جو اپنے کام پر مستعد ہیں غم فردا اُن کی بلا کو۔

اے دوست!

مجھے لمبا سفر درپیش ہے۔ زادِ راہ کے لئے سورج اور چاند کی مثال کو اپنے دل میں سوا احتیاط سے سنبھال لیا ہے۔ بادل مجھے پانی پلا دیں گے، تارے مجھے رستہ بتا دیں گے۔ نہ سہموں گا، نہ بھٹکوں گا سیدھا چلا جاؤں گا۔

اے دوست!

دل میں سب کچھ ہوگا مگر خالی ہاتھ جو وہاں جا نکلا تو میرا کیا حال ہوگا؟۔ کیا تمہیں پتہ ہے کہ وہاں کیا تحفہ قبول ہوتا ہے؟ اتنا مجھے معلوم ہے کہ وہاں پوچھا جاتا ہے۔

"کیا لائے ہو؟"

اے دوست!

میں کیا جواب دوں گا؟ اپنے استاد سورج سے پوچھ چکا ہوں وہ کچھ نہیں بتاتا۔ بادلوں سے پوچھو تو غائب ہو جاتے ہیں، تاروں سے دریافت کرو تو ہنسنے لگتے ہیں۔ انسانوں سے بہت پوچھ گچھ لیا۔ یہی کہتے ہیں کہ کوئی دلفریب سا جھوٹ پیش کر دینا۔

اے بھائی اور دوست!

اس دنیا میں کہیں کہیں صداقت کی خوشبو ہے۔ تم تو اس کا عطر پیش کر دینا اور جب مجھ سے

پُوچھا جائے گا کہ "کیا لائے ہو؟" تو میں یہ کہہ دوں گا

"حضور میں تو کہیں گیا نہ تھا"

- اور یہ سچ ہوگا۔ یہاں ہونے پر بھی وہیں ہوں۔

۳

اللہ میاں! یہ تھا تمہیں یاد کرنے کا ایک طریقہ مگر سچ پوچھو تو تصنّع چاہے کتنا ہی لیاقت کے عمامے اور اعتقاد کے جُبّے میں ملبُوس ہو پھر تصنّع ہے۔ اور تمہارے اور میرے درمیان تصنّع کیوں ہو؟ اللہ میاں کیا کہا کہ ٹھیک کہتا ہوں؟ اللہ میاں! تم آگئے؟ ہپ ہپ ہرّے۔ اللہ میاں! تم کہاں تھے؟ کیا کہا کہ یہیں کہیں؟ اللہ میاں تم چھپتے کیوں ہو؟ کیا کہا کہ چھپیں نہ تو اور کیا کریں؟

کس سے ملیں؟ کس سے نہ ملیں؟؟

پجاری سے

پجاری جی

مجھ پاپی کے من میں بھی تپسیا کی بڑی اچھیا ہے پر مہاراج مُورتی کوئی بڑی من موہنی سی ہو۔ مہاراج جی جس طرح تم ماتھا ٹیکنے کے بلی وان ہو، گنتو ہو کہ ناگ ہو، تمہارا ماتھا جھک جاتا ہے اسی طرح مہاراج جی یہ پاپی بھی پریم کی پوجا پاٹ میں چوکس ہے پرماتما نگر میں پریت کی جمنا بہتی ہے اور یہ کرشن جی کا چیلا بن دیکھے بھالے اشنان کا دھنی ہے۔ مہاراج جی اس ندی میں جو بہہ گیا سو جی گیا۔

پجاری جی

تم ملیچھوں کی کتھا پر نہ جاؤ۔ وہ جو مُسلا کہتا ہے

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدے کے بُت ہو گئے پرانے

انت جھُوٹ ہے۔ مہاراج جی بُت پرانے اچھے پر تپسیا نئی بھلی۔ مہاراج! میں سوتی مورتیوں کو جگاتا ہوں کہ شور ہو۔ تم جاگتی مورتیوں کو سُلاتے ہو کہ شانتی ہو۔ تم مہاراج! کاشی جی چل کے جاؤ گے یا چل کے پہنچو گے مگر اس پاپی پاس کاشی جی چل کے آئے! مہاراج! میری مانو، گلے ملو، ملاؤ اور رہو

پاپی

مُدیر "ہمایوں" کا ایک مضمون "پُوجا" پہلے ہمایوں میں اور پھر "طلسم زندگی" میں شائع ہُوا۔ "پجاری سے" اُس کے جواب میں لکھا گیا۔

میں کیا ہوں؟

پھُولوں سے بارہا پُوچھا۔ سُنا سمجھا سب نے، گردن ہلاتے بھی نظر آئے مگر ہمیشہ مُسکرا کر چُپ رہے۔ اے ظریف طبع پری زادو! تمہیں سب کچھ معلوم ہے مگر تم بتاتے نہیں ۔

بادلوں سے۔ کن بادلوں سے؟ وہ جو شبِ ماہ میں چاندنی کی جھولیاں بھر بھر بچپن کی ادا لئے بھاگے بھاگے پھرتے ہیں بارہا یہی سوال کیا مگر وہ ہمیشہ یہ کہہ کر کہ پھر ملیں گے تو بتائینگے ٹالتے رہے۔

تاروں سے۔ اُن پیارے تاروں سے جن کی پیامِ محبوب رساں کرنیں ولولہ انگیزی تخیّل پروری کی سحرکاریاں کرتی ہیں برسوں یہی تکرار رہی مگر نتیجہ ندارد!

پھُولوں میں، بادلوں میں، تاروں میں ایک ہی سازشِ خموشی کا اثر ہے یہی میرے دوست ہیں اور یہی دلدادۂ "حسنِ ستم روائی"!

کیا کروں! کس سے پُوچھوں؟

ہاں! وہ ایک بھولی بھالی لڑکی پانی بھرنے، گاگر سر پر تولے، دامنِ کوہ والے چشمے کی طرف خوشی خوشی جا رہی ہے۔ کیا مجھے معلوم ہوتا ہے یا واقعی زمین اُس کے پاؤں چُوم رہی ہے! نہیں نہیں! سچ مچ پگڈنڈی کے اِدھر اُدھر کے پھُول اُس کی طرف جھک رہے ہیں۔ اے لو! دیکھو! وہ چھوٹی چھوٹی شرمیلی جھاڑیاں جھوم جھوم کر اُس پر نظر کا دم کر رہی ہیں۔ اُسے دیکھ کر ایک کبوتر نے خوشی سے بازی لگائی۔ چڑیاں ناچ کرنے لگیں ۔

ارے ! ایک دلیر تنکے نے لپک کر اُس کا دامن جا لیا ۔ ہیں ہیں وہ اُس سے کیا کہہ رہا ہے ؟

تنکا ۔ آپا تم کل کیوں نہ آئیں ؟

لڑکی ۔ لو اُلٹی بات ۔ میں تو کل آئی تھی، تم میں سے کوئی تھا ہی نہیں !

تنکا ۔ یہ بھی کبھی ہو سکتا ہے ! آپ نے کل وہ بُرقع پہن لیا ہو گا جس کی تاثیر سے بھولی لڑکیاں ہماری نگاہ سے اوجھل ہو جاتی ہیں ۔

لڑکی ۔ کیسا بُرقع ؟

تنکا ۔ بی آپا بُرا نہ مانو تو صاف کہہ دوں ؟

لڑکی ۔ (مسکرا کر) بھائی ! تمہاری دِل لگی کی عادت نہ گئی ۔ میں اور تمہاری بات کا بُرا مانوں ؟

تنکا ۔ بی آپا ! اِس بُرقع کا نام خود بینی ہے ۔

ارے غضب پھر تم نے وہی پہنا ۔ اچھا رُخصت !

یہ کیا ہُوا ؟ پھُول، تنکے، جھاڑیاں، کبوتر، چڑیاں سب اپنے اپنے کام میں لگ گئے ۔ اِس بھولی لڑکی کو اب کوئی پُوچھتا بھی نہیں ۔ چلوں اِس لڑکی سے پُوچھوں کہ یہ کیا ماجرا ہے ۔ نہیں کیا پُوچھنا ہے نہ اس کی وہ چال ہے نہ وہ نگاہ ہے ۔ یہ پل کی پل میں کیا طلسمات کا کھیل ہُوا ۔ وہی دامنِ کوہ، وہی گاگر مگر لڑکی بدل گئی ۔ لو نیا گُل کھلا ۔ گاگر میں اور پانی میں باتیں ہونے لگیں :-

چشمے کا پانی ۔ کب سے تمہاری راہ تک رہے ہیں ۔ دیر سے بُلا رہے ہیں کہ تم آؤ اور ہم تمہاری گود میں شہر کے گھروں کی سیر کر آئیں ۔ لو آؤ ۔ اُٹھا بھی لو ۔ ہم اور تُم مل کر گائیں گے ۔

گاگر ۔ مجھے تمہارے بغیر کب چین آتا ہے ۔ آؤ شوق سے مگر ذرا میں بھی تو نہا لوں ۔

کیا خوب! پھر سین بدلا۔ پھر وہی اصلی لڑکی ہے۔ گاگر کو مانجھ رہی ہے۔ گاگر خوب چھم چھمانے لگی۔ چشمے کا پانی تالیاں بجانے لگا کہ آپا آئیں آپا آئیں۔ چلوں اب اِس لڑکی سے پُوچھوں کہ مَیں کیا ہوں؟

مَیں۔ کیوں بُوا! مَیں کیا ہوں؟

لڑکی۔ کانوں میں اُنگلیاں دیجیئے تب میں بتاؤں۔

اس لڑکی کی، پانی کی، ہوا کی آواز اس وقت ایک ہے! میرے جسمانی کان بند ہوگئے آنکھیں بھی! مَیں مَیں نہیں ہوں اور یہ سُن رہا ہوں:۔

پانی۔ ہوا۔ لڑکی۔ پھُول۔ تنکے۔ رینگ ہاں ہو کر آپ دیوتا ہیں۔ بلکہ اِس سے بھی بالاتر۔ آپ کچھ بھی نہیں بلکہ اِس سے بھی کمتر۔ انحصار صرف اِس بات پر ہے کہ آپ کی نیت کیا ہے۔ اے عزیز! اپنا دھوبی آپ بن اور دِل کو دھو ڈال۔ قلی بن اور نیکی کی گٹھڑی اُٹھا۔ خودپسندی چھوڑ، جگ پسند بن۔ سمجھ سمجھ! خدمت کو ایمان۔ ایمان کو جان!!

بات تو صرف اتنی تھی کہ مَیں گزر رہا تھا اور مَیں نے معمولی طور پر ایک بھری گاگر کو سر پر دھروانے میں مدد دی۔ اس ایک ثانیے میں اتنا ڈراما کِس طرح ہو گیا؟ مگر میں نے حقیقتہً سب کچھ دیکھا۔ سب کچھ سُنا۔

میں بعض دفعہ آناً فاناً کِس طرح بدل جاتا ہوں۔ کیا میری بیداری غفلت ہے اور میرے یہ کبھی کبھی آنے والے خواب حقیقی بیداری؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ مَیں کیا ہوں؟

———•———۞———•———

بے صبروں کا دوزخ

میرے دوست یقین نہیں کرتے۔ میرے ذاتی تجربہ کو وہ افسانہ نویسی بیان کرتے ہیں۔ ناچار پبلک کو منصف قرار دیتا ہوں۔ تمہیداً اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ میرے دوست کبھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں دروغ گو ہوں۔ دشمن تو واقعی مجھے راستباز خیال اور بیان کرتے ہیں کیونکہ محض از روئے بغض میں انہیں کبھی موقع نہیں دیتا کہ وہ مجھے عملاً یا قولاً جو فروش گندم نما ظاہر کر سکیں۔ یہ واقعی میری کمزوری ہے کہ میں ہمیشہ دشمنوں کی عداوت کا ناجائز فائدہ اُٹھاتا ہوں اور دانستہ انہیں "مجھے جھوٹا" ثابت کرنے کی خوشی سے محروم رکھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ہر شریف آدمی کا فرض ہے کہ دشمنوں کی خاطر چند عیوب کو اچھی طرح سے پال لے تاکہ ان کو جھوٹی تہمت لگانے کے فضول عیب سے بچائے۔ یسوع مسیح کا قول ہے کہ "دشمن سے محبت کرو" اور محبت اصلی اور سچے معنی میں یہی ہے کہ جس سے محبت کی جائے اس کی اخلاقی عظمت کا پورا خیال رکھا جائے۔ دشمن سے محبت کرنے کے یہی معنی ہیں کہ اپنے میں وہ برائیاں پیدا کرو جو تمہارا دشمن چاہتا ہے کہ تم میں ہوں تاکہ وہ تم کو بغیر جھوٹ بولنے کے بدنام کر سکے اور اس کی اخلاقی عظمت قائم رہے۔ میں یہ نہیں کرتا اور یہ بخل میرا طبعی ہے اور میں اللہ جلّ شانہٗ سے ہزار بار دعا کر چکا ہوں کہ میری طبیعت سے یہ بخل کم ہو مگر نہیں ہوتا۔ ہاں مگر دوستوں سے میں نے کبھی اس قسم کی پردہ بازی نہیں کی۔ پھر وہ مجھے کیوں صادق تصوّر کرتے ہیں؟ اصل وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ عادت سے مجبور ہو کر اس قدر ذلیل ہو گیا ہوں کہ دوستوں سے بھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ گویا ان سے بھی دشمنی کرتا ہوں۔ مگر

یہ غنیمت ہے کہ میرے دوست اس قدر میرے محرمِ راز ہیں کہ ان کو میرے بیبیوں اور عیوب معلوم ہیں اور اس لیئے وہ بر سرِ پرخاش نہیں ہوتے۔ بلکہ کیا تعجب ہے کہ وہ میری راستبازی کو ایک قسم کا مرض تصوّر کرتے ہوں اور اس لیئے چنداں معترض نہ ہوں۔ ایشیا میں جہاں اور امراض کا زور ہے یہ بھی فسیل پائی کی طرح کسی کسی شخص میں موجود ہے گو عام نہیں اور ممکن ہے کہ میں بھی اسی مرض میں مبتلا ہوں۔ شاید ایسا ہی ہو کیونکہ آخر میں یورپین تو نہیں۔ ہوں تو وہی کالا آدمی خیر آمدم بر سرِ مطلب۔

۱۹۱۸ء کے انفلوئنزا کی وبا کی اعداد شماری پر میرا بھی احسان ہے۔ صرف اعداد شماری میں ہی نہیں بلکہ ڈاکٹر پروری میں بھی میں نے حصّہ لیا۔ بہت سے لوگ ضرور ایسے تھے کہ جنہوں نے اس نادر موقع پر بھی خسّت سے کام لیا اور جو ڈاکٹروں کو فیس دیئے بغیر چل دیئے یا اس سے بدتر کہ فیس دیئے بغیر اچھے ہو گئے۔ ڈاکٹر حق بجانب ہوں گے اگر انہیں کبھی معاف نہ کریں مگر میں اس زمرہ میں نہ تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے میرا پورا علاج کیا۔ میں سخت احسان فراموش ہونگا، اگر ان کی خدمات کا اعتراف نہ کروں مگر مرض کو دوا سے ضد تھی۔ "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" انفلوئنزا سے ڈبل نمونیا ہوا۔ تھوک سفید سے گلابی، گلابی سے گلنار۔ سانس ایک کی بجائے چار۔ غذا بند غشوں کا انبار۔ سب کچھ ہوا۔ ساتھ والے کمرے میں صنفِ نازک کا ایک لاجواب نمونہ اپنے انفلوئنزا کے باعث نہیں بلکہ میری بُری حالت کی خبر کی وجہ سے جان بحق ہوا۔ جیسا کہ مشہور ہونا چاہئے تھا مشہور ہو گیا کہ میں مر گیا ہوں۔ فرشتوں نے بھی غالباً باہر سے ہی سُنا اور وہ میرے ہی کمرے میں داخل ہوئے۔ فرشتے اس معاملے میں بالکل بے قصور تھے۔ جنگِ یورپ کے تھکے ہوئے۔ لاشیں گھسیٹتے گھسیٹتے چُور ہو چکے تھے۔ اگر جلدی میں ایک کمرے کی بجائے دوسرے میں داخل

ہو گئے تو کیا تعجب؟

ایک نے میری رُوح سے کہا چل، رُوح تھر تھر کانپتی ہوئی نکلی۔ ایک نے اِس طرف ایک نے اُس طرف سنبھالا۔ تھوڑی دُور جاکر رُوح کو پھر اُنہوں نے ایک عجیب قسم کا جسم پہنایا اور آناً فاناً اس میرے پُرانی رُوح والے نئے جسم کو ایک عالیشان عمارت کے بیرونی کمرے میں داخل کر دیا۔ رُوح نکالنے والے فرشتے چل دیئے۔ اس کمرے میں اور بھی میری جیسی بیبیاں ہستیاں تھیں۔ مگر سب خاموش۔ اتنے میں چند محافظ داخل ہوئے اور ہم سب کو ہانک کر لے گئے۔ ایک محافظ نے دوسرے سے کہا کہ ہاں یہ سب ساتویں طبقے والے ہیں۔ میں اپنی کرتوتوں سے واقف تھا۔ کچھ متعجب نہ ہوا۔ سمجھ گیا کہ جہنم کا ساتواں طبقہ میری رہائش کے لئے موزوں خیال کیا گیا ہے کسی حد تک خوشی ہوئی کہ غنیمت ہے کہ گیارھواں نہیں یا اکیسواں نہیں۔ گو مجھے کوئی علم نہ تھا کہ کُل کتنے طبق ہیں مگر خود پسندی نے وہاں بھی نہ چھوڑا۔ یہی جی میں آیا کہ تجھ سے ہزاروں اور بدتر ہوں گے اسی لئے تو تجھے ساتواں طبقہ ملا ہے۔ آناً فاناً ساتویں طبقہ کے دروازہ پر پہنچ گئے۔ (جہنم کے کارندے بلا کے پھرتیلے ہیں۔ رستہ بھی نہ دیکھنے دیا اور جھٹ لے کر پہنچ گئے) وہاں ایک ایک کا جائزہ لیا گیا۔ میرا نمبر سب سے اخیر تھا۔ باقی تو سب داخل کئے گئے۔ مگر میرے داخلہ کے وقت کچھ آپس میں ان محافظوں کے اشارے ہوئے جس سے میں یہ سمجھا کہ کچھ غلطی ہوئی ہے۔ چنانچہ ایک اخیری اشارے سے جس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں "یہاں کا نہیں" مجھے نکالا گیا۔ اب مجھے ایک ایسی جگہ لایا گیا جو میرے خیال ناقص میں جہنم کا (Enquiry Office) تھا یہاں جب تلک کہ وہ رجسٹر دیکھیں مجھے اِدھر اُدھر تاک جھانک کا موقع ملا۔ کوئی ایسی انوکھی بات نظر نہ آئی۔ بھیڑ تھی۔ متوحش بھیڑ تھی۔ مگر اس قسم کی بھیڑ بہت دفعہ ریل کے اسٹیشنوں پر درجہ سوم کے داخلہ پر میں دیکھ چکا تھا۔ محافظوں کے چابک اپنا کام کر رہے تھے مگر آہ و بکا کچھ نہ تھی۔ سب

ہستیاں صرف اس سراسیمگی میں تھیں کہ ہم کہیں رہ نہ جائیں۔ شاید اس حصۂ جہنّم کی یہی مقررہ سزا ہو کہ انسان سفر کی سراسیمگی میں ابدی طور پر گرفتار رہے۔ ریل سامنے، ٹکٹ پاس مگر داخل ہونا نہیں ملتا۔ چابکوں کی جسمانی تکلیف محسوس نہیں ہوتی کیونکہ روحانی خوف طاری ہے کہ ریل کہیں چل نہ دے۔ عورتیں۔ بچے۔ بوڑھے پاؤں تلے روندے جارہے ہیں۔ کوئی کسی کا رفیق نہیں۔ مددگار نہیں، پرسانِ حال نہیں۔ پیچھے سے دھکیلے جارہے ہیں۔ آگے سے پیچھے گھسیٹے جارہے ہیں گٹھریاں لاٹھیاں۔ ڈاڑھیاں۔ پگڑیاں۔ دوپٹے۔ آنکھیں سب خلط ملط ہو رہی ہیں۔ انسانی اضطراب کی واقعی خوفناک تصویر تھی اور بہت سخت سزا۔ میں ابھی یہ دیکھ ہی رہا تھا کہ دفتر کے کسی بڑے صاحب نے کسی ماتحت کو کہا "ڈیم۔ ڈیم فول۔ بہشت کا بچہ (یہ شاید وہاں کی گالی ہو) نکالو۔ بے صبر لوگ کے دوزخ میں لے جاؤ۔"

چنانچہ میں اس دفتر سے نکالا گیا۔ مجھے نکالتے نکالتے بابو صاحب نے کچھ اور بھی نکالا۔ یعنی اپنا غصّہ۔ ایک لات، دو مکّے اور کئی زبانی تبرّکات۔ میرے حصّے میں آئے۔ باقی دفتر کے چپراسیوں میں بٹے۔ مگر اس لکد کوبی میں بلا کی تاثیر تھی۔ میں دھواں دھار خلا میں سے لڑھکتا ہوا قلابازیاں لگاتا ایک عمارت کے دروازہ پر پہنچا۔ دروازہ خود بخود بند ہوگیا۔ از غیب ایک کاغذ میرے ہاتھ میں دیا گیا۔ افلوئنزا سے پہلی زندگی میں مَیں ترقی کے لئے ہمیشہ بے صبر رہتا تھا چنانچہ اس کاغذ پر صرف یہ لفظ لکھے ہوئے تھے:۔

تمہاری ترقی ہوگی

مگر سکنڈ سکنڈ میں یہی فقرہ بدل کر یوں ہو جاتا تھا:۔

ابھی نہیں

میری وہ روحانی ایذا قابلِ بیان نہیں جب کہ 'ترقی ہوگی' والا فقرہ پل پل میں بدل کر ابھی

نہیں، ہو جاتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ میری دائمی سزا ہے۔ الفاظ بیان نہیں کر سکتے کہ یہ سزا میرے لئے کتنی بڑی تھی۔ یا یہ کہ انصافِ الٰہی نے کس قدر موزوں سزا میرے لئے تجویز کی۔ "ہو گی" "ابھی نہیں"۔ "نہیں"، "ہو گی"۔ "نہیں"۔ "ابھی نہیں"۔ کوئی دوزخ ان سیدھے سادھے دو تین لفظوں کے بار بار بامرِ مجبوری پڑھنے اور محسوس کرنے سے بدتر نہیں ہو سکتا۔ اگر میرا بس چلتا تو اپنی اس بے صبر شخصیت کو سو سو طرح سے قتل کرتا جس نے مجھے یہ روزِ بد دکھایا کہ ہمیشہ کے لئے "ہو گی" "نہیں ہو گی" کے چکر میں گرفتار رہوا۔ رنج، غصہ، پشیمانی گھٹا باندھ باندھ کر میرے قلب پر حملہ کرتے تھے۔ "ہو گی"۔ "نہیں ہو گی" کے تازیانے میری روح کی کھال ادھیڑے ڈالتے تھے۔ مجھے تو یہ معلوم ہؤا کہ ہزاروں سال مجھے یہ سزا ملی ہے مگر ایکبارگی آسمان سے شعلہ سا ایک پنجہ گرا اور مجھے اُٹھا کر چلتا بنا۔ تھوڑی دیر کا مجھے پتہ نہیں کہ کیا ہؤا۔ مگر آخر مجھے ہوش آیا اور میں ایک نئی قسم کی عمارت میں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا جسم مجھے مِل گیا ہے۔ ابھی اور کچھ دیکھنے نہ پایا تھا کہ ایک نہایت شاندار بزرگ اس کمرے میں وارد ہوئے۔ فرمانے لگے:۔

"مسٹر—— مجھے آپ سے ایک غلطی کا اعتراف کرنا ہے۔ میں ملک الموت ہوں۔ میرے کارندوں نے آپ کو اُٹھا لانے میں غلطی کی۔ آپ کو قبل از وقت جو تکلیف ہوئی وہ آپ معاف کیجئے۔ چلئے اپنے گھر۔"

میں۔ جناب۔ کیا یہ آپ کا دولت خانہ ہے؟

ملک الموت۔ نہیں۔

میں۔ بہت بہتر۔ پھر آپ تشریف لے جائیے۔ میں آپ کو غلطی معاف کرتا ہوں۔ مگر میں واپس جانا نہیں چاہتا۔ مجھ سے پھر کوئی بے صبری کی بات ہو جائے گی اور میں بے صبروں کے دوزخ میں اب دوبارہ جانا نہیں چاہتا۔ میں اسی جگہ رہوں گا۔ یہ مجھے پسند ہے صاحب خانہ

اگر نکالیں گے تو میں نکل جاؤں گا۔

ملک الموت۔ یہ ضد اچھی نہیں۔

میں۔ ضد جناب کی طرف سے ہے کہ جاؤ اپنے گھر۔ میری طرف سے کوئی ضد نہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں کن صاحب کا مہمان ہوں۔ جب آپ کا یہ گھر نہیں تو آپ بھی مہمان ہیں۔ ایک مہمان کو دوسرے مہمان کے نکالنے کا حق تو کبھی نہیں سُنا۔

ملک الموت۔ اچھا میں صاحبِ خانہ کو بُلاتا ہوں۔

اتنے میں ایک شاندار مگر نہایت ہی پیاری صورت والے بزرگ وارد ہوئے اور مجھ سے مخاطب ہوئے:۔

"مسٹر —— آپ نے ایک ایسا لفظ استعمال کیا ہے جس سے میں تقریباً مجبور ہو جاتا ہوں بالخصوص اس لئے کہ آپ حتے الامکان مہماں نواز ضرور ہیں مگر میرے اختیارات بہت محدود ہیں۔ میں فرشتوں کے کام کا نگران ہوں۔ اگر کوئی سہو ہو جائے تو اسے درست کرنا میرے سپرد ہے۔ آپ کے متعلق محض سہواً کچھ کارروائی عمل میں آئی جسے درست کرنا میرا فرض تھا چنانچہ میں آپ کو دوزخ سے نکال لایا۔ مگر یہاں میں آپ کو رکھ نہیں سکتا۔

میں۔ آپ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ آپ کا گھر ہے۔ آپ خود مجھے یہاں لائے۔ لازمی طور پر میں آپ کا مہمان ہؤا۔ آخر مہمان کا آپ کے ہاں کم سے کم حق کیا ہے؟ میں ناکارہ سہی مگر اس کم سے کم حق سے تو محروم نہیں ہو سکتا۔ آپ کی شفقت سے بعید نہ ہوگا اگر مجھے اس حق سے فیضیاب ہونے دیں۔

نگران فرشتہ۔ میں آپ کو صرف اتنے وقت تک رکھ سکتا ہوں جو آپ کی زبان میں تین دن سمجھا جاتا ہے۔

مَیں ۔ مگر اس عرصے میں مجھے آپ بہشت و دوزخ کی سیر تو کرا سکتے ہیں ۔

نگران فرشتہ ۔ بہشت کی ہرگز نہیں ۔ کیونکہ وہاں کے کام میں سہو کو دخل نہیں ۔ میرا منصب صرف سہوی امور کی درستی ہے ۔

مَیں ۔ بہت بہتر ۔ جس امر میں آپ کا اختیار نہیں اس کے لئے میں آپ سے کیسے کہوں ۔ مگر میری بیوی کہاں ہیں ؟

ملک الموت ۔ یہی تو غلطی ہوئی ۔ ان کو لانا تھا آپ کو لے آئے ۔ ان کو بہشت میں لے جانا تھا وہ اب وہاں جا رہی ہیں ۔

مَیں ۔ کیا میں اُن سے مل سکتا ہوں ؟

ملک الموت ۔ جی نہیں ۔

مَیں ۔ کیوں ؟

ملک الموت ۔ اُن کا یہ رُتبہ نہیں ۔

مَیں ۔ تو آپ مجھے وہاں لے جائیں ۔ میرے معزز مہربان خدا کے لئے میرے حال پر رحم کرو ۔ مجھے اس اپنی ملکہ سے مل لینے دو ۔

نگران فرشتہ ۔ پھر آپ نے وہی بے صبری کی بات کی ۔

مَیں (رو کر) معاف کیجئے ۔ للّٰلہ معاف کیجئے مگر یہ کہاں کا دستور ہے کہ میاں مہمان اور بیوی الگ تھلگ ۔ ختم مرسلینؐ کی خاطر انہیں اپنا مہمان بنایئے ۔

نگران فرشتہ ۔ اے ضدی ذی رُوح ۔ کاش کہ یہ تمہاری ضد نیک کاموں میں صرف ہوتی ۔

مَیں ۔ اِس سے زیادہ کیا نیک کام ہوسکتا ہے کہ میں اپنی رفیقِ زندگی کو دِلی پیار سے دیکھنا چاہوں ؟

نگران فرشتہ ۔ سچ کہتے ہو ۔ اور یہی جذبہ اُس ازلی نُور کا جزو ہے جو تم میں سے

نیک اور صابر لوگوں کو فرشتوں سے بھی بالا رتبہ دیتا ہے۔

میں۔ جزاک اللہ۔

زہرہ۔ میری زہرہ۔ میرے دل، جان کی مالک زہرہ۔ میری ہر نیکی کی محرک زہرہ۔ ہر پاک خواہش کی مؤید زہرہ آئی۔ مسکرائی۔ اس کے پاؤں میں نے چومے۔ نئے انداز سے کہنے لگی:۔

"پیارے صبر کرو گے تو جلد ملیں گے"

پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہوں زہرہ چلی گئی۔

نگران فرشتہ۔ آیئے آپ کو دوزخ کی سیر کرا دوں۔

میں۔ جی حاضر۔

نگران فرشتہ۔ آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ کیوں ایسی ہولناک جگہ کی سیر کرنا چاہتے ہیں؟

میں۔ جی صرف اس لئے چونکہ مجھے دُنیا میں واپس جانا ہے میں دوست دشمن سب کو آگاہ کروں ان کے دلوں میں نورِ ایمان کے شعلے بھڑکاؤں۔ سچے دل سے ان کی خدمت کروں منت سے۔ محبت سے۔ آنسوؤں سے انہیں یقین دلاؤں کہ خدا کی رحمت بے پایاں ہے مگر اس کے رحم کو۔ انصاف کو۔ بخشش کو بہت نہ آزماؤ۔ بچو بچو۔

الھٰکم التکاثر حتیٰ زرتم المقابر

نگران فرشتہ۔ شوقِ خدمت بھی اسی نور کا ایک جزو ہے جو انسان کو باقی ذی الارواح سے ممتاز کرتا ہے۔ مگر تم چاہے کچھ کرو دُنیا میں کوئی تمہاری بات کا اعتبار نہیں کرے گا سب تم پر ہنسیں گے۔ اس بات پر یقین رکھو۔

میں۔ کوشش کرنا میرا فرض ہے اور میں ضرور کوشش کروں گا۔

نگران فرشتہ ۔ شاباش ۔ تمہارے ملک میں صبر کے معنے غلط مشہور ہیں ۔ صبر کے صحیح معنے استقلال کے ہیں اور اسی معنے میں وہ آیۂ رحمت ہے :۔

"اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ"

تکلیف کا برداشت کرنا صبر نہیں ۔ باوجود ظاہری تکلیف کے نیک کام میں مستعدی سے لگے رہنا اور نہ ٹلنا اصل صبر ہے ۔ خدا تمہیں اصلی صبر کی توفیق دے ۔

ہم ابھی دوزخ کے صرف چند قطعات میں پھرے تھے کہ پھر بجلی کی چمک ہوئی ۔ کڑکڑاہٹ سے ایک پنجہ ہماری جانب لپکا اور ہم دونوں کو اُٹھا کر پھر اس نگران فرشتہ کے گھر میں چھوڑ گیا اور جاتے جاتے ایک فرمان نگران فرشتے کو دے گیا ۔ انہوں نے مجھے اس کا مطلب یوں بیان کیا ۔

نگران فرشتہ ۔ اے میرے عزیز مہمان ۔ حکم ربی ہے کہ میں تجھے زیادہ مہمان نہ رکھوں ۔ تو نے ایک بہشتن کے پاؤں چومے ہیں اس لئے دوزخ کی آگ تجھ پر حرام کی گئی ہے مگر گذشتہ گناہوں کی پاداش میں یہ حکم نافذ ہوا ہے کہ جتنی تیری جسمانی زندگی دُنیا میں باقی ہے وہی تیرے لئے دوزخ کا حکم رکھے ۔ اب جا ۔ خدا حافظ ۔

میں اب زندہ ہوں ۔ دوست رشتہ دار سب مبارکباد دیتے ہیں کہ میاں تم بچ گئے ۔ انہیں کیا پتہ کہ یہ زندگی میرے لئے کیا حکم رکھتی ہے ۔ اور انہیں کیا پتہ کہ میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ مجھے اب وہ پرچہ "ہوگی" "نہیں ہوگی" پھر نہیں ملے گا ۔ انہیں کیا معلوم کہ بہشت کا پاس ماں کے بعد اگر کوئی دوسرا دینے والا ہے تو نیک بیوی ۔ انہیں تو صرف یہ خبر ہے کہ میں افسانہ نویسی کرتا ہوں کاش کہ وہ سمجھیں ۔

اخیر میں مَیں اتنا واضح کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ دوزخ کے مشاہدہ کا حال میں پھر بشرطِ صحت و زندگی لکھوں گا مگر جو چند قصص تھوڑے سال ہوئے مشہور ہوئے تھے وہ

بہت حد تک بے بنیاد ہیں۔

مجھے ٹھیک یاد نہیں مگر کسی ایرانی نے مشہد مقدس کے مظالم کے بعد کچھ مشہور کیا تھا جس کا لب لباب یہ ہے :۔

"مسٹر گلیڈسٹون نے دوزخ میں جا کر باقاعدہ میونسپل کمیٹی قائم کی ہے ۔ اس کمیٹی کے انتظام سے دوزخ میں جا بجا Asbestos کے گھر بنائے جا رہے ہیں ۔ Asbestos وہ مصالحہ ہے جس پر آگ کچھ اثر نہیں رکھتی ۔ اب تو وہ ایک عام چیز ہے ۔ یورپ کی ایجاد ہے ۔ جرمن قیصر نے بھی دوران جنگ میں ایک گھر یا کمرہ Asbestos کا طیاروں کے آتشبار گولوں سے بچنے کے لئے بنوایا تھا) اندر ہی اندر سے سرنگ لگا کر بہشت سے پانی لایا گیا ہے ۔ دروازوں پر یورپین فوج کا پہرہ ہے ۔ بغیر پاس کے یورپین بھی اندر نہیں جا سکتا ۔ ایشیائی تو پاس ہے پاس سب محروم ہے ۔ پانی کم ہو جانے سے بہشت کی کساد بازاری ہے بلکہ مسلمان لوگ وضو کے لئے بھی پانی سے تنگ ہیں ۔ دوزخ بڑا بارونق ہوتا جاتا ہے ۔ علمی مشاغل ۔ فلسفیانہ مباحثے ناچ رنگ سب کچھ جاری ہے ۔ مسلمانوں کے لئے جو ایک بڑا طبقہ دوزخ میں محفوظ تھا اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے گلیڈسٹون دوزخ میں الحاق ہو رہے ہیں ۔ بڑے بڑے بادشاہوں کو بھی اب جگہ نہیں ملتی وغیرہ وغیرہ ۔"

جہاں تک میں نے دوزخ کو دیکھا یہ سب قصے مبالغہ آمیز ہیں ۔ صرف ایک جگہ واقعی پہرہ تھا اور اس پر بڑے موٹے لفظوں میں لکھا تھا "Reserved for the Czar" یعنی زار روس کے لئے مخصوص ہے ۔ دوزخ میں کم از کم مسلمانوں کے املاک بدستور قائم ہیں بلکہ ترقی پر ہیں ۔ یہ محض افترا اور مسلمان قوم کی ہتک ہے کہ وہ دوزخ سے بھی بے دخل کئے جا رہے ہیں ۔ بادشاہوں کا بہت بڑا ہجوم ہے ۔ بیسیوں میں نے خود دیکھے جن کے آگے سونے

چاندی کے سکوں کے ڈھیر پڑے ہیں اور وہ بڑی تندہی سے جیب پُر کر رہے ہیں۔ مگر دوزخ کے درزی ناقص ہیں۔ سب بادشاہوں کی جیبیں پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ اشرفیاں ڈالتے جاتے تھے۔ اور گرتی جاتی تھیں۔

بہشت کی تباہی کا حال بھی غالباً قیاسی ہے۔ جب دوزخ والا قصہ سچ نہیں تو یہ بھی ضرور بناوٹ ہوگی کہ اندرونی سرنگوں کے باعث بہشت کی نہروں میں پانی کم ہے۔ پیڑ مرجھا رہے ہیں۔ پھل کا نام نہیں۔ مٹی کے کوزے جا بجا ٹوٹے پڑے ہیں۔ مسواکوں کے ڈھیر۔ ڈھیلوں کے انبار سے قفل گیر ہیں۔ نیلے تہ بند پھٹے پرانے جا بجا لٹک رہے ہیں۔ کھجور کی گٹھلیاں۔ زمزمیوں کے ٹین جانمازوں میں لپٹے پڑے ہیں۔ امام بے تنخواہ۔ مؤذن فاقے سے۔ مسجد میں نہ دری نہ بوریا۔ نہ چراغ۔ میری رائے ناقص میں یہ سب قصے ہیں۔ مگر میں خواہ مخواہ کسی ایرانی پر دروغ گوئی کی تہمت دھرنا نہیں چاہتا۔ ممکن ہے کہ جس طرح مجھے ملک الموت کی غلطی سے دوزخ کی سیر کا موقع ملا۔ انہیں بہشت دوزخ دونوں کی سیر کا موقع ملا ہو۔ پبلک خود انصاف کر سکتی ہے۔ دروغ برگردنِ راوی۔

بہت کوشش کی کہ اصلی مطلب پبلک پر بھی ظاہر نہ کروں مگر ایک طاقت ہے جو مجبور کر رہی ہے۔ مجھے ظاہر کرنا پڑتا ہے۔ اوپر یہ لکھ چکا ہوں کہ میرے دوستوں کو کیا پتہ کہ میری زندگی میرے لئے کیا حکم رکھتی ہے وہ حکم یہ ہے :-

ہر صبح کو میرے ایک گذشتہ زندگی کے بے صبری میں ضائع کردہ دن کو میرے سامنے لایا جاتا ہے۔ اس دن کو انسانی صورت دی جاتی ہے۔ صورت کس کی؟

بعینہ میری

پھر مجھے ایک کند۔ ناکارہ۔ زنگ آلود چھری دی جاتی ہے۔ پھر میں گھنٹوں اپنے

آپ کو ذبح کرتا ہوں۔ مرنے والے کے دم واپسیں کی نگاہیں کلیجہ چھلنی کئے ڈالتی ہیں۔ مگر میں کمبخت قصائی انسانی گلو پر نہیں اپنے گلو پر آرہ کشی کرتا جاتا ہوں۔

شام کو ہر روز میرے یہ گلو بریدہ مقتول مجھے اکٹھے ملتے ہیں۔ ایک کچہری سی ہوتی ہے سب کے سب عجب درد ناک طریقے سے میری طرف اُنگلیاں اُٹھاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں :۔

یہ ہے ہمارا قاتل

ہائے وہ میری مجرمیت۔ اس پر عدالت کا سوال "کیوں ؟" ستم۔ اے دوستو ! اے پبلک ! اے آنے والی بنی نوع انسان کی نسلو ! بتاؤ اُس "کیوں" کا کیا جواب دوں۔ تمہارے لئے یہ قصہ سہی۔ مگر میں تو روز صبح کو یہ ڈراما اور شام کو یہ مقدمہ دیکھتا ہوں میرے لئے تو قصہ نہیں۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

متوالے

او آہن پوش طعن نیوش متوالو! تم جہاں جا رہے ہو وہاں رکھا کیا ہے؟ تمہیں خبر نہیں تم معذور ہو!

باخبر اُستاد کے ضدی سبق خوانو! جب معنی تمہیں نہیں آتے تو دو سطر سبق نوک زبان ہونے سے کیا وجد ہوگا۔ کاش کہ مطلب بھی سمجھو اور سمجھاؤ!

زندان وہ ہے جہاں سے تم جاتے ہو! جہاں رسم کہتی ہے کہ بھائی کو بھائی نہ چھوئے! جہاں تن آسانی سکھلاتی ہے کہ یہ سہل ہے کہ غیر کا بار خویشوں میں حصہ رسدی تقسیم ہو مگر یہ مشکل کہ غیر کو لیاقت کے جادو سے ایسا تسخیر کرو کہ تم سے بارکشی کرانے کا خیال تک بُھلا دے۔

جسے تم بندی خانہ سمجھے ہو وہ مکتب ہے اور درس صرف یہ کہ پرائے کو اپنا بناؤ یہاں تک کہ نہ کوئی زور دست رہے نہ زیر دست۔ اتنا سمجھ جاؤ تو کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ اتنا سمجھا سکو تو بھولے وفا شعار دلوں کی آبادیوں میں جفا کے ہل چل جائیں گے۔ رُکو، سنبھلو او متوالو! یہ مستانہ شیوہ کب تک؟ بس یہی نا کہ چند قدم لڑکھڑاؤ گے اور پھر ہانکے جاؤ گے!!

اس صنم خانہ کے پرستار اب شیوۂ مردانگی کے طلبگار ہیں۔ وہ مردانگی جس پر حریف عش عش کرے۔ جو آنے والی نسلوں کے لئے نمونہ اور ہمارے لئے آئین ہو جو سیکھے سُنے سُنائے نہیں بلکہ دل سے پیدا ہو اور نگاہ سے یوں ٹپکے کہ زبان و بازو کے استعمال کی ضرورت نہ ہو۔ او متوالو! جہاں چلن کی ضرورت ہو وہاں چال کو کوئی کیا کرے ❊

خود مختار رقاصہ

میرا عقل فریب رقص نہ کبھی ختم ہوا نہ ہوگا۔ ہر وقت ہر جگہ میرے پاؤں کی موسیقی اسیر جھنکار سحر آموز حرکت، دلوں کو دماغوں کو اپنا شیفتہ و شیدا بنانے میں شاندار طریقے سے کامیاب ہی رہے اور زندگی مندر، مساجد، کلیسا، بام کوہ، گہوارۂ ابر، سقفِ فلک میری رقص گاہیں ہیں۔ صرف وقت و مقام ہی نہیں بلکہ ساری آفریدۂ خیال دنیا، اُمید کی شگفتگی، عقائد کی درستگی سب میرے رقص کیلئے وقف ہیں۔

میں خود مختار ملکہ ہوں اور میرا پایۂ تخت مقدس کتابوں کے تراجم و فلاسفہ سائنس کے کارخانوں میں میری ٹکسال، مملکتی فرمانوں میں میرا دفتر، تاریخ میری سوانح عمری!!

میں ہی ہوں جو خدا سے بھی کہہ سکتی ہوں کہ اس کی آفریدہ نہیں۔ اس کی دنیا میں رہتی ہوں مگر اس کی نہیں۔

ملک ملک کے عارضی خدا میرے نام پر قربان ہوئے۔ میرے دھوکے میں وہ مٹائے گئے مگر مجھے آسیب نہیں۔

جو بات اصلی و حقیقی خدا، گو وہ مجھ سے بیگانہ ہے، اپنے لئے نہیں کر سکتا وہ اپنے نظر فریب رقص سے اپنے تخیل رہا خرام سے میں اس کے لئے کرتی ہوں۔ وہ چھپ نہیں سکتا میں اسے چھپاتی ہوں کہ فلاسفر عقل کی خردبین سے، عابدہ راستی کی دوربین سے اس کا نشان تک نہ پا سکے۔ وہ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ بنتا ہے اپنے شیوۂ مستانہ کے ایک کرشمہ سے اُسے صاحب اولاد میں نے بنایا۔ اُسے حاضر و ناظر ہونے کا دعوےٰ ہے۔ دہریہ کے دل سے میرے پاؤں کی ایک لغزش نے اُسے قطعی محو کر دیا۔ اُسی خدا کے نام پر مجھے مٹانے کے لئے لاکھوں یورشیں ہوئیں مگر میں ہمیشہ یورش کرنے والوں میں مل گئی۔ خود ناچی انہیں نچایا۔ میں

ہمیشہ فاتح مجھ پر حملہ آور سدا مفتوح !

میں ناچتی ہوں۔ گاتی ہوں۔ جشن مناتی ہوں کیونکہ دُنیا کے گراموفون میں جب کبھی انسانی کارناموں کا ریکارڈ ختم ہوتا ہے تو ہمیشہ میرے نام پر !

میرا نام ہے

غلطی

میری بہار بے خزاں، میرا حسن روز افزوں، میرا رقص عالمگیر۔ میں ثانئے ثانئے میں روپ بدل کر نت نئے رقص ایجاد کرتی ہوں۔ سمندر کی لہریں رُک جاتی ہیں مگر میری موجِ خرام نا منتہاہی ہے۔ میں ایک ہی ترانہ سو سو لَے سے گاتی ہوں۔ کوئی اُسے اناالحق سنتا ہے کوئی ہٰذاالباطل مگر مجھے کیا؟ میں گاتی ہوں رقص کرتی ہوں۔ ثواب کے مزدور۔ حکومت کے غلام۔ شہرت کے اجیر سب میرے رقص کے دلدادہ ہیں اُن کے لئے ناچتی ہوں۔ اُنہیں اپنا بناتی ہوں۔ کوئی گھر کوئی دل میرے لئے بند نہیں مگر، مگر ——— افسوس ——— افسوس ——— باوجود اس تمام اختیار کے اپنے کروڑوں شیدائی تماشائیوں کے اک خاص قسم کے دل کے آگے میں عاجز ہوں۔ کہیں کہیں دُنیا میں ایسے انسان بھی ہیں جن کے دل میں نہ شک نہ شکایت جنہوں نے اپنے آپ کو خدا کے پاس بیچ دیا جو سیدھے راستے پر بلا خوف، بلا تعجیل، کسی اُمید پر نہیں بلکہ محض ادائیگیٔ فرض کی خوشی میں بے مُنہ موڑے چلے جاتے ہیں۔ وہ تسلیم کی خُو والے رضا کار جن کے زبانی اقرار پر تصدیق بالقلب کی مُہر لگی۔ جن کی حقیقت بیں پیار بھری نگاہیں اور سب کچھ دیکھتی ہیں مگر مجھے کہیں نہیں دیکھتیں!

جب میں اک ایسے انسان کو دیکھتی ہوں جو مجھے کہیں نہیں دیکھتا تو میرے برق رفتار پاؤں سُن ہو جاتے ہیں۔ میرا نہ تھمنے والا ترانہ بند۔ میں ڈر جاتی ہوں! میں مر جاتی ہوں!!

مروّجہ اُردو شاعری

مروّجہ اُردو شاعری دو چار کوڑی الفاظ کو لڑا لڑا کر معنی آفرینی کے اکھاڑے کی رونق دوبالا کرنے میں مشغول ہے۔ ان الفاظ کی فہرست کچھ طویل نہیں۔ آئینہ، حیرت، خموشی، غم، سکوت، ذرّہ، قمر، حسُن، جلوہ، تپش، شعلہ، شمع، محفل، شوق، خواب اور ہیچوں قسم تیس چالیس اور۔ کبھی حیرت خم ٹھونک کر آئینہ کے بالمقابل ہوتی ہے کبھی اس سے گتھم گتھا۔ کبھی بالکل اپنے آپے سے باہر کبھی خموشی میں کبھی خواب میں غرض سو سو طرح ذلیل ہوتی ہے۔ یہی حال دوسرے الفاظ کا ہے شوق بیچارہ تو بالخصوص اس قدر ہرجائی ہؤا ہے کہ کہیں کا نہیں رہا۔ کبھی آغوش حیرت میں کبھی شعلہ سے ہم پیالہ و ہم نوالہ۔ کہیں غم کا میاں۔ کہیں چمن کا خانہ زاد غلام۔ دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوستا ہے اور بعض دفعہ بیتاب ہو کر خواہش کرتا ہے کہ کاش میں بھٹیارا ہوتا۔ مگر شوق نہ ہوتا۔ اُردو شعر گویوں کے ظلم سے تو بچتا۔ باقی رہا چاند سو کچھ تعجب نہیں کہ وہ قطعی طور پر ہجرت کر جائے۔ اسے زمینِ شعر راس نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر ان الفاظ کی دُہائی سُنی گئی تو اُردو شعر سازی کے کارخانہ کے کاریگر آئندہ کن الفاظ کو اپنے دماغی ہتھوڑے اور دِل کی بھٹّی سے نرم گرم کر کے توسنِ کلام کی نعلبندی کیا کریں گے؟

اوّل اوّل جب زلف و گیسو کے محلے سے فریاد اُٹھی تو اتفاقیہ طور پر قومی تابوت کی تیاری تھی اس وقت کے شعر بافوں نے میلوں لمبا کفن پیش کر دیا مگر اب تو وہ موقع بھی نہیں۔ اس مُردے کی ہڈیاں تک گل چکیں۔ اصلی نہ نقلی کسی قسم کے آنسوؤں کی گنجائش نہیں۔

چند دن شاعروں نے مناظرِ قدرت پر سواری گانٹھنے کی ٹھیرائی تھی۔ بچارے دشت وکوہسار زخمی ہوئے۔ بادلوں کے پرخچے اُڑے۔ چاندنی بلبلا اُٹھی۔

تصوّف وعرفان بھی شعر کی چکی میں پس کر سُرمہ ہو چکے۔ اس خاک اُڑانے سے بھی کچھ نہیں بنے گا۔

تو آخر پھر اب کیا ہوگا؛ سٹرائک یا ہڑتال!
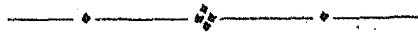
ابلیس اور عورت

ایک شخص کو کسی پرانی کتاب سے شیطان کی طلبی کا وظیفہ مل گیا۔ آدمی تھا ارادے کا پکا۔ لگا پوری تن دہی سے وظیفہ رٹنے۔ کسی عابد و زاہد نے اس قدر یکسوئی سے خدا کی پرستش نہ کی ہوگی جتنی ان حضرت نے ابلیس بازی میں زحمت اُٹھائی۔ فاقوں سے دن کو رات، رات کو دن کر دیا۔ ترکیب کا لازمی جزو یہ تھا کہ تیرہ دن کا ایک ہی روزہ اور پھر چودھویں دن شراب سے افطار وہ بھی اس طرح کہ بلا کسی چیز کے کھائے لگاتار چودہ گلاس شراب کے چڑھائے جائیں تب شیطان صاحب نمودار ہوں گے۔ چنانچہ اس عامل نے ایسا ہی کیا۔ جونہی اس شخص کی گلاس بازی ختم ہوئی تو اس نے سب سے پہلے اپنے جسم میں ایک غیر معمولی تبدیلی محسوس کی یعنی بجائے اس کے کہ تیرہ دن کے روزے کی کمزوری یا چودہ گلاسوں کے نشے کا کچھ اثر ہوتا اس کا جسم اعلٰے سے اعلٰے صحت کی حالت سے بھی ہزار گنا زیادہ چُست۔ اس کی آنکھیں بجائے خمار آلود ہونے کے صاف، دماغ تر و تازہ اور دل مطمئن تھا۔ اور خود بخود ہی یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ اگر اس قسم کی صحت و طمانیت شیطان صاحب کی ملاقات کا پیش خیمہ ہے تو ملاقات کے پُر لطف ہونے میں کچھ شک نہیں۔ اس عمل کے شروع کرنے سے پہلے اس کی نیت تھی کہ شیطان سے دولت، حسن، حکومت، دیر پا جوانی کے حصول میں امداد لی جائے لیکن اب جب کہ وہ وقت اسے قریب معلوم ہوتا تھا تو اس کے دل میں ان خیالات میں سے ایک بھی جاگزیں نہ تھا بلکہ وہ محسوس کرتا تھا کہ شیطان کے سامنے ان خواہشوں سے بھی بڑھ کر کوئی خاص آرزو پیش کرے

تاکہ شیطان بھی قائل ہو جائے کہ انسانی نسل نے دنیا میں لاکھوں سال گنوا کر کم از کم ایک فرد ایسا پیدا کیا ہے جس کے خیالات میں جدت ہے۔

یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر انگریزی طریقے سے کسی نے انگلی سے کھٹ کھٹ کی۔ عامل نے حسب معمول بے تکلفی سے come in (آ جاؤ) کہا۔ دروازہ کھلا۔ ایک صاحب بہادر نہایت خوش قطع لباس میں ٹوپی اُتارتے ہوئے بصد آن بان وارد ہوئے اور فرمانے لگے "آپ کی محنت کی داد دیتا ہوں۔ اس زمانے میں واقعی بہت کم لوگ اس قدر ثابت قدمی سے اپنے عزم پر قائم رہتے ہیں"۔

مسٹر شرید (عامل کا نام شرید تھا۔ ان کے وطن یا دیگر تعلقات کا پتہ نہ چل سکا۔ نو وارد تھے۔ کرائے کی کوٹھی میں رہتے تھے۔ چند ملاقاتوں میں ان سے یہ تمام واردات معلوم ہوئی۔ اب پھر مفقود الخبر ہیں) یہ آپ کی قدر دانی ہے۔ تشریف رکھئے۔ کہئے کچھ نوش کیجئے گا؟

شیطان۔ (اطمینان سے آرام کرسی پر متمکن ہوتے ہوئے) تھینک یو۔ مجھے واقعی پیاس محسوس ہو رہی ہے۔ میں آپ کے پاس سیدھا پریذیڈنٹ ولسن کے ہاں سے آ رہا ہوں۔ اور یہ تو آپ خود ہی قیاس کر سکتے ہیں کہ امریکا سے سیدھا ہندوستان آنا اور رستے میں صرف چند منٹ کے لئے بیت المقدس ٹھیرنا کم از کم پیاس کا موجب تو ضرور ہو گا۔

شرید۔ واللہ آپ نے کافی سفر کیا۔ مگر آپ کے بشرے سے تکان معلوم نہیں ہوتی۔ کیا پیجئے گا۔ وسکی، سوڈا یا کچھ اور؟

شیطان۔ جی نہیں۔ وسکی تو کبھی نہیں پیتا۔ پانی پلوائیے۔ ٹھنڈا ہو اگرچہ آپ کے وطن کے پانی سے بھی ڈر لگتا ہے۔

شرید۔ کیا آپ اتنے سفر کے بعد بھی وسکی نہیں پیتے؟ تعجب ہے۔

شیطان ۔ واقعی بدقسمتی یا خوش قسمتی سے اس نعمت سے محروم ہوں ۔

(اُنوکرجس کے لئے شریدپہلے ہی بٹن دبا چکا تھا دبے پاؤں داخل ہوا ۔ مہمان کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ کیا ارشاد ہو گا اس کے لئے بلاحکم لئے وسکی اور سوڈے کی بوتلوں کی طرف جھکا)

شرید ۔ وسکی نہیں چاہئے ۔ اُبلا ہوا فلٹر شدہ پانی ۔ ایک گلاس ۔

(خادم اعلےٰ درجے کا تربیت یافتہ خادم تھا پھر بھی اس غیر معمولی فرمائش کو سُن کر مہمان صاحب کی طرف بہ نظرِ تحسین دیکھنے سے رُک نہ سکا ۔ دِل میں اِس نووارد کی عظمت کا سکہ جمائے ہوئے گیا ۔ اور فوراً پانی لاکر پیش کیا)

شرید ۔ سگرٹ رکھ دو ۔ بس ۔

(خادم مشین کی طرح تعمیل کر کے غائب ہوا)

شیطان ۔ اس پانی کا کس قدر خوش نما پاکیزہ رنگ ہے ۔ آپ کی خانہ داری کا انتظام قابلِ تعریف ہے ۔ مسز شرید لاثانی منتظمہ ہیں ۔ مجھے لنڈن یاد آگیا ۔

شرید ۔ کیوں بناتے ہیں ۔ چہ نسبت والا معاملہ ہے ۔ لیجئے سگرٹ کا شوق کیجئے ۔

شیطان ۔ چونکہ پہلی ملاقات ہے اس لئے ضرور آپ کو تعجب ہوگا مگر میں سگرٹ بھی نہیں پیتا ۔

شرید ۔ (قہقہہ لگا کر) یک نہ شد دو شد ۔ اب تو ضرور میں اپنے دوستوں میں کہہ سکوں گا کہ شراب اور سگرٹ نہ پینا شیطانی کام ہیں ۔

شیطان ۔ آپ سے تو مجھے بڑی بڑی اُمیدیں ہیں نہ یہ کہ آپ اُلٹا مجھے بدنام کریں گے ۔

شرید ۔ (اور زیادہ ہنس کر) آپ کی گفتگو کس قدر پُرلطف ہے مگر آمدم بر سرِ مطلب ۔ فرمائیے "مجھے کیا کرنا چاہئے"؟

شیطان ۔ یہ سوال ہمیشہ مجھے بڑی دقت میں ڈالتا ہے ۔ اگر میں اپنے ضمیر (ضمیر کا لفظ سنتے ہی شریدصاحب نے ایک اور بے اختیار قہقہہ لگایا) ہنسیئے ۔ ہنسیئے مگر واقعی میرا ضمیر ہے اور وہ کچھ ایسا برا بھی نہیں ۔ میں بدگمانیوں کا شکار رہوں اور اگر کبھی کسی سے صاف صاف دل کی بات کہتا ہوں تو وہ مجھ پر مُلّا ہونے کا شک کرتا ہے ۔ یہ ایذا اور اس پر گالی بھی برداشت کرتا ہوں ۔ خیر اگر میں اپنے ضمیر کے مطابق اور آپ کے فائدے کے لئے صحیح مشورہ دوں تو یہی کہوں گا کہ آپ کو مسز شرید کی اس قدر دل آزاری نہیں کرنی چاہیئے ۔ مانا کہ وہ اولڈ فیشن کی خاتون ہیں مگر ان میں خوبیاں بھی ہیں اور انسانی زندگی کچھ اسی قسم کی معجون ہے ۔

شرید ۔ (Chinese The کہہ کر رُک گیا) معاف کیجیئے ۔ مگر میں خود مختاری چاہتا ہوں ۔ شہرت دولت ۔ حکومت اور ان سب سے بڑھ کر نیچر کی پوشیدہ طاقتوں پر کُلّی اختیار ۔ ایسی کوئی روحانی کشش کہ انسانی ساختہ مشینوں سے آزاد ہو کر دم زدن میں کبھی مریخ کی سیر کروں ۔ کبھی زحل کی ۔ کبھی مشتری کی اُنگلی پکڑ کر کہکشاں کے گلستاں میں چکر لگاؤں ۔ میرے خیال کی پرواز تو یہاں تک ہے اور آپ نے وہی دقیانوسی چھیڑ نکالی کہ بیوی سے دِل بہلاؤ اور بیوی بھی ایسی جس کے بال عید ۔ شب برات کو بھی نیا فیشن اختیار نہیں کرتے ۔ یہ تو میں سمجھتا تھا کہ ملٹن نے جو آپ کا قصہ لکھا ہے وہ فرضی ہے مگر کیا جرمن Goethe کے Faust میں جو آپ کے کرشمے درج ہیں یا وہ جو ماری کوریلی کی کتاب میں آپ کے کارنامے ہیں وہ بھی سب غلط ہیں ۔ مجھے افسوس ہوگا اگر میری محنت رائگاں گئی ۔

شیطان ۔ فاضل شرید ۔ وہ قصص بس کسی حد تک ہی درست ہیں ۔ مگر میں آپ کو مایوس کرنا نہیں چاہتا ۔ جو کچھ آپ چاہتے ہیں اس کے لئے بھی تیار ہو کر آیا ہوں ۔ آپ نے فرمایا تھا " مجھے کیا کرنا چاہیئے ؟ " میرے خیال میں عورت خاوند ایک ہیں اور آپ کی " مجھے " میں در اصل

مسز شریدؔ بھی شامل ہیں۔ اس لحاظ سے میں نے عرض کیا تھا کہ آپ ان کی دل آزاری نہ کریں کیونکہ ان کو رنج دینا گویا اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنا ہے۔ انسان کے لئے دُنیا میں رنج و راحت تمام تر اس کے خیالات پر مبنی ہے۔ اب آپ خود ہی . . . . . .

شریدؔ۔ معاف کیجئے قطع کلام کرتا ہوں۔ مگر . . . . . (رُک گیا)

شیطان۔ جی ہاں۔ کہئے۔ آپ کیوں رُکتے ہیں؟

شریدؔ۔ میرا خیال تھا کہ آپ کو میرے مافی الضمیر سے پوری آگاہی ہوگی۔ آپ نے نصیحت بازی شروع کردی۔ ناصح تو لاکھوں ہیں۔ آپ چارہ ساز بنئے۔

شیطان۔ اچھا آنکھیں بند کیجئے۔

(اگلا حصہ مسٹر شریدؔ کی ڈائری سے لفظ بلفظ نقل ہے)

"مجھے آج ڈاکٹر نے ٹھیک دو دن کی سخت بیماری کے بعد اجازت دی ہے کہ صرف ایک گھنٹہ کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کروں۔ ڈاکٹر سب پاگل ہیں۔ ان کی تشخیص یہ تھی کہ زیادہ شراب نوشی سے مجھے ہذیان لاحق ہوا۔ مجھے غش یا بیہوشی جو کچھ ہوئی وہ محض ایک صدمے سے۔

اس وقت تنہائی ہے۔ میرا دماغ صاف ہے اور میں اس ڈائری کو ٹھیک اسی لمحے سے شروع کرتا ہوں جب شیطان نے مجھ سے کہا کہ" اچھا آنکھیں بند کرو"۔ آنکھیں بند کرنے کے بعد کے واقعات مجھے پورے پورے یاد ہیں اور اس طرح کہ میں اُن کو کبھی ہزار کوشش سے بھی بھلا نہیں سکتا۔ میری جسمانی صحت اس وقت کامل بلکہ اکمل حالت میں تھی اور اب گو میں کمزور ہوں مگر کمزوری صرف جسمانی ہے میں نے آنکھیں بند کیں۔ شیطان کے کُرسی سے اُٹھنے کی آہٹ مجھے سُنائی دی۔ اس نے میرے سر پر نہایت نرمی سے مگر مضبوطی سے اپنا سرد ہاتھ رکھا۔ اس ہاتھ کے رکھنے کی دیر تھی کہ میری آنکھیں پھر کھُلیں مگر میرا کمرہ نہ تھا۔ مجھے اچھی طرح دکھائی دیا کہ میرا لباس بھی متغیر تھا۔ پھر جو میں نے غور

کیا تو معلوم ہوا کہ کسی قسم کی سواری میں ہم نہایت سرعت سے ہوا میں سفر کر رہے ہیں۔ یہ سواری ہوائی جہاز سے مشابہ نہ تھی بلکہ الف لیلہ کی اُڑنے والی قالین یا طلسم ہوش رُبا کے ساحر بادشاہ افراسیاب کے تخت کے طریق کی تھی۔ شیطان کا لباس بھی متغیر تھا۔ وہ بڑی رعونت سے ایشیائی طریق پر اس تخت کی صدر کی جگہ تکیہ لگائے بیٹھا تھا۔ تخت میں خفیف حرکت معلوم ہوتی تھی مگر یہ صاف ظاہر تھا کہ سیدھا بلندی کی طرف لاکھوں میل فی سکنڈ کی رفتار سے بڑھ رہا ہے۔ مجھے کچھ اچنبھا نہ ہوا۔ شیطان نے یوں گفتگو شروع کی :-

شیطان ۔ کہئے کچھ اس طریقِ سفر سے تکلیف تو نہیں ؟

مَیں ۔ جی نہیں۔ کہاں چل رہے ہیں ؟

شیطان ۔ ایک ملکہ سے آپ کی ملاقات کراتا ہوں۔

شیطان کا یہ کہنا تھا کہ تخت ایک عجیب و غریب باغ کے دروازے پر رُک گیا۔ ہم اُتر کر داخل ہوئے۔ باغ کی چار دیواری سے ملحق اندر کی جانب کھلے ہوئے، ہزاروں دلفریب دالان نما کمرے تھے۔ دائیں طرف ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ وہاں دو عورتیں تھیں۔ دونوں ہم شکل، ایک قطع، ایک لباس، ایک عمر مگر اُن میں جو برائے نام بڑی معلوم ہوتی تھی وہ دوسری کو سخت بیرحمی کے ساتھ گھور رہی تھی۔ جو بیچاری اس غضب آلود نگاہ کا نشانہ بن رہی تھی وہ سخت بے بسی کی حالت میں بلاچون وچرا اس قہر کو برداشت کر رہی تھی۔ میں سخت متعجب ہوا۔ کچھ سوال کرنے کو تھا کہ شیطان نے اشارے سے کہا پہلے دیکھ لو۔ دوسرے کمرے میں داخل ہوئے ہاں بھی دو عورتیں۔ ایک قطع، ایک لباس، ایک آن۔ جو پہلے کمرے میں ذرا بڑی تھی وہ یہاں ذرا چھوٹی تھی۔ یہاں والی بڑی ملکہ چھوٹی ملکہ پر نہایت سفاکانہ طریق سے روحانی تشدد کر رہی تھی۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں کمروں میں سے آن واحد میں ہم گزرے، سب جگہ یہی دیکھا کہ دو ہم شکل ایک

ظالم ایک مظلوم ۔ اخیر میں ایسے بھی بہت سے کمروں میں سے گزر ہوا جہاں دو ہم شکل لڑکیاں ایک دوسری کے ساتھ کھیل میں مصروف ہیں ۔ میں بہت سوال کرنا چاہتا تھا مگر شیطان مجھے روک دیتا تھا ۔ سب سے اخیر میں ایک ایسے کمرے میں داخل ہوئے جہاں ایک حسن و جمال کی پری ایک کتاب پر نگاہ جمائے بیٹھی تھی ۔ کتاب کے ورق بغیر اس کی کوشش کے خود بخود بڑی سرعت سے پلٹے جا رہے تھے ۔ بعض صفحوں کو وہ چاہتی تھی کہ زیادہ دیر تک دیکھے مگر کتاب کے ورق پلٹنے والی طاقت اس خواہش سے آزاد تھی اور وہ شاہزادی بامرِ مجبوری اس کتاب کو دیکھ رہی تھی ۔ میں نے بڑھ کر اس کتاب کو دیکھا ۔ فوراً سمجھ میں آگیا کہ جتنے کمروں میں سے جو حالت دیکھ کر میں گزرا ہوں یہ کتاب ان کمروں کی حالت کا مجموعہ ہے ۔ اتنا دیکھا اور بیتابی سے باہر نکلا ۔

شیطان ۔ مسٹر رشید! یہ ملکہ نورجہاں ہیں ۔ اس باغ میں اتنے کمرے ہیں جتنے نورجہاں کی زندگی میں دن تھے ۔ سوائے بچپن اور زندگی کے ابتدائی حصے کے باقی تمام دن اس ملکہ کی یہ کیفیت تھی کہ منگل کی نورجہاں پیر کی نورجہاں کو ملامت کرتی تھی ۔ اور بدھ والی نورجہاں منگل والی نورجہاں کو ایذا دیتی تھی ۔ انسانی خواہشوں کا خاصہ ہے کہ دو دن بھی ایک اصول پر قائم نہیں رہتیں ۔ چنانچہ یہ لاثانی عورت بھی اس مرض میں مبتلا تھی ۔ اور اب اس کی آنکھوں کے سامنے تا قیامت اس کی زندگی کا ڈراما ہوتا رہے گا ۔ کیا تم اس کی حسرت کا اندازہ کر سکتے ہو؟ ہرگز نہیں ۔ یہ یاد رکھو کہ یہ ملکہ بمقابلہ دیگر فرمانرواؤں کے ہزار درجہ بہتر تھی اور یہی وجہ ہے کہ میں نے تم کو ایک اچھا نمونہ دکھلایا ہے ۔

میں ۔ کیا کوئی انسان ایسا بھی گزرا ہے جس کی ساری زندگی ایک اصول پر بغیر تغیر کے گزری ہو؟

شیطان ۔ لاکھوں ۔ سب سے بہتر مثال رسولِ عربی کی ہے مگر وہاں نہ میں جا سکتا ہوں نہ تم ۔ لیکن ہزاروں ڈاکو اور چور بھی ایسے ہوئے ہیں جن کے عزم میں ، خواہشوں میں ، ذرائع میں تغیر

نہیں ہوا۔ جن کا ایک دن دوسرے دن کا قاتل نہیں ہوا۔ مگر عام طور پر انسانی زندگی یہی ہے کہ . . . . نہیں تمہیں لفظوں سے نہیں بتلاتا صحیح صحیح دکھلا دیتا ہوں۔

یہ کہہ کر شیطان نے ایک کتاب میرے سامنے رکھ دی۔ میرے کئی دوستوں کی متحرک تصویریں اس کتاب میں نظر آئیں۔ سب کو یہی کرتے دیکھا کہ جو ایک دن بوتے دوسرے دن اسی کو اکھاڑتے حیران ہو گیا کہ افسوس ہماری آنکھیں کس قدر بند ہیں۔ مثلاً میرے دوست غند ل کی کئی سو تصاویر اس کتاب میں تھیں۔ ہر تصویر میں وہ بڑی تندہی سے اپنے کام میں مشغول تھے مگر کام سب جگہ یہی کہ جو ایک دن کیا اُسے دوسرے دن مٹایا۔

شیطان ۔ یہ تو انسانی زندگی کا معمولی نمونہ ہے۔ آؤ تمہیں عمر خیام سے ملائیں۔

ایک ندی نمودار ہوئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ندی کے دونوں طرف ہزارہا انسان بیٹھے ہیں۔ غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ گو شکلیں ہزاروں ہیں مگر شخص ایک ہی۔ ہر شکل ندی سے پیالے بھرنے میں مصروف تھی۔ جام بھرے جا رہے ہیں اور رکھے جا رہے ہیں۔ نہایت شد و مد سے۔ اور کوئی کام نہیں۔ شیطان نے مسکرا کر پوچھا کہ کہیے حضرت کیا حال ہے؟ سب نے متفقہ جواب دیا "جی سخت متردد ہوں۔ یہ نایاب شراب بہ رہی ہے۔ اسے پیالوں میں سمیٹ لوں تو پھر پیوں" یہ جواب میں نے سُنا اور پھر شیطان میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"دیکھو مسٹر شرید! یہ شخص سینکڑوں برس سے اسی کام میں لگا ہوا ہے۔ اسی دھن میں ہے کہ ندی کو ساغروں میں بھر کر رکھ لے پھر پئیے تاکہ کچھ ضائع نہ ہو اور ندی ہے کہ بہے جا رہی ہے۔ بیچارہ لگا رہے گا اسی طرح۔

مَیں ۔ افسوس ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہ شخص توسیع لاحاصل کی مصیبت سے آزاد ہوگا۔

شیطان ۔ یاد رکھو کہ خیام نوع انسان کے برگزیدہ لوگوں میں سے تھا اور اس کا یہ حال ہے۔

اس واقعے کو دیکھ کر میرے دل پر سخت مایوسی طاری ہو رہی تھی کہ ایک طرف سے قہقہہ کی آواز سنائی دی۔ دیکھا تو سینکڑوں ہم شکل لڑکے بے تحاشا ہنس رہے ہیں۔ شیطان کی طرف میں نے بنظرِ استفسار دیکھا۔

شیطان ۔ کیا تم نے نہیں پہچانا۔ یہ ظہیر الدین بابر ہے۔ ارادے کا پکا تھا۔ مصیبت میں بھی ہمت نہ ہارتا تھا۔ بڑھاپا اس کے شباب کو زوال نہ دے سکا۔ یہ ہمیشہ جوان اور خوش رہے گا۔ یاد رکھنا کہ عالمِ ارواح میں بھی کسی کو مستقبل کی خبر نہیں۔ چنانچہ بابر کو بھی کچھ پتہ نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ شخصی زندگی کا پہلا اور آخری اصول یہ ہے کہ ہر شخص اپنے خیالات کا ذمہ دار ہے۔ افعال یا ان کے نتائج کا ذمہ دار نہیں۔ افعال و نتائج انسانی ارادے سے آزاد ہیں۔

میں ۔ یہ تو نیا قانون ہے۔

شیطان ۔ نیا ہو یا پرانا۔ ہے صحیح۔

میں ۔ مگر جب نتائج کی ذمہ داری نہیں تو ذمہ داری کیا خاک ہوئی؟

شیطان ۔ واقعی باوجود کافی علمیت کے تمہاری سمجھ ابھی خام ہے۔ بیشتر حصہ انسانوں کا اسی غلطی میں ہے کہ انہیں دُنیا میں کچھ کر کے دکھلانا ہے۔ حالانکہ صحیح بات اتنی ہے کہ ہر انسان اپنی ہستی کا ایڈیٹر ہے۔ اور اُسے دیکھنا یہ ہے کہ اس نے اس جزوِ عالم کو کس طرح اڈٹ کیا۔ دولت حکومت۔ اصلاح تمہارے اختیار میں نہیں۔ کبھی نہیں پوچھا جائے گا کہ تم نے اوروں کے لئے کیا کیا؟ بلکہ صرف یہ کہ تم خود کیا بنے؟ کیا سال۔ دس سال کی متواتر کوشش سے اتنا بھی نتیجہ پیدا ہوا کہ تمہارے خیالات میں حسن و اطمینان کی جھلک پہلے سے بیشتر ہوئی۔ نور جہاں کے پاس سب کچھ تھا۔ اس نے تمہارے معیار سے ہزاروں نیکیاں کیں مگر اس کے خیالات اکثر پست رہے۔ اسے حکومت۔ دولت۔ فرمانروائی کے جال سے کبھی آزادی نہ ہوئی۔ تم اپنی نسبت کچھ

کہ آج سے دس سال پہلے کے اور آج کے تمہارے خیالات میں کچھ بیّن فرق ہے؛ کچھ عروج ہے؟
ہرگز نہیں ایک بھی سوال ان دس سالوں میں تم طے نہیں کر سکے۔ ابھی تک تم نے اس بات کا
فیصلہ بھی یقینی طور پر نہیں کیا کہ آیا زندگی اس قابل بھی ہے کہ انسان اُس کا بوجھ برداشت
کرے۔ کوئی اصُول تمہارے نزدیک فیصلہ شدہ نہیں اور اگر ہے تو صرف چند منٹ کے لئے۔
افسوس ہے کہ تم لوگ اپنے عارضی مکانوں کی بنیاد تو مستحکم بناتے ہو مگر خیالات کی بنیاد ہمیشہ ہوائی
بلکہ اس سے بھی زیادہ متزلزل۔"

میں کچھ کہنے کو تھا کہ ایک طرف سے ایک نہایت خوشنما مسجد نظر آئی۔ شیطان نے مجھے
اجازت دی کہ مَیں تنہا جا کر دیکھ آؤں۔ اندر داخل ہوا تو ایک متبرک صُورت پیرمرد وضو میں مصروف
ہیں۔ فرشتہ نما لڑکے اور لڑکیاں ایک طرف سبق کی تلاوت کر رہے ہیں۔ مجھے خیال ہوا کہ پہلے شیطان
سے ان بزرگ کی ہسٹری معلوم کروں۔ باہر نکلا شیطان سے پوچھا یہ کون ہیں؛

شیطان۔ یہ ایک گمنام شخص تھا" الصّلوٰۃ خیرٌ مّن النوم" کا سچا عاشق۔ اس راگ کو دوسروں
سے سُنتا۔ آپ سُناتا۔ اور اس پر عمل کر کے دکھلاتا ہر وقت کام میں لگا رہتا تھا۔ چنانچہ ساری
عمُر اسے کبھی فرصت ہی نہ ملی کہ اپنے لئے متاعِ دُنیا میں سے کچھ جمع کرنے کا خیال بھی کرے۔
شیطان کے ان الفاظ سے خود بخود میری زبان پر لفظ آبا آنے کو تھا کہ یکایک مجھے سخت حیرانی
ہوئی کیونکہ میں پھر اپنے کمرے میں تھا۔ شیطان اسی طرح میرے سامنے آرام کرسی پر تھا۔
پانی کا گلاس جو ابھی میرے نوکر نے اسے دیا تھا نیم پُر تھا۔

شیطان۔ میں نے آپ کو آنکھیں بند کرنے کے لئے کہا تھا آپ تو سو ہی گئے۔

میں سمجھ گیا کہ یہ ان حضرت کی شعبدہ بازی ہے۔ مجھے سب کچھ دکھلا بھی دیا اور پھر اپنے آپ
کو الگ بھی ظاہر کر دیا۔ گویا کہ نورجہاں وغیرہ کی مُلاقات خواب میں میرے ہی خیالات کے تلاطم کا

نتیجہ تھی یہ جونہی میرے چہرہ سے ظاہر ہوا تو شیطان بولا ۔

شیطان ۔ جی نہیں ۔ واقعی آپ کا قیاس غلط ہے ۔ مجھے شعبدہ بازی نہیں آتی ۔ مجھے بھی کیا آپ نے پیر یا جوگی مقرر کیا ہے ۔

میں ۔ اس وقت تو آپ نے میرے دل کی بات معلوم کر لی ۔ پھر اور جو کچھ میرے دل میں ہے اسے آپ کیوں پورا نہیں کرتے ۔ میں فلسفہ بازی سے سخت گھبراتا ہوں ۔ آپ چاہے مجھے ہزار یقین دلائیں کہ آپ کی شعبدہ بازی نہیں اور تورجہاں وغیرہ کے متعلق جو کچھ میں دیکھ چکا ہوں وہ میرے پریشان خیالات کا عکس ہے مگر میں خوب جانتا ہوں کہ آپ ہی کی کارستانی ہے ۔

شیطان ۔ اچھا یونہی سہی ۔ میں تو یہی چاہتا ہوں کہ ہر شخص اپنی ہٹ پر قائم رہے مجھے اس سے زیادہ کیا کامیابی ہوگی کہ جس بُرائی (ہٹ) کے عوض "معلم الملکوت" کے درجہ سے میری معزولی ہوئی وہ بُرائی سب انسانوں میں پیدا ہو ۔

میں ۔ حضرت ۔ یہ چل کسی اور کو دیجئے ۔ آپ کیوں خیال کرتے ہیں کہ میں اُن گنوار گھامڑوں میں سے ہوں جن کے ارادہ میں آپ چکنی چپڑی باتوں سے تغیر پیدا کر سکتے ہیں ۔ میں طاقت چاہتا ہوں ۔ وہ طاقت جو مجھے نیچر پر غالب کر دے ۔ تمام جہانوں میں ایک خدا کی طرح پھروں ۔ چاہوں تو زمین کو سورج کی غلامی سے ۔ چاند کو زمین کی قید سے آزاد کر دوں ۔ قطبی تارے کو جنوب کی طرف بھیج دوں ۔ کہکشاں سمیٹ لوں ۔ مریخ کو زحل ۔ زحل کو آفتاب ۔ آفتاب کو پاکٹ لیمپ بنا دوں ۔ آپ کیا باتیں کرتے ہیں مجھے اخلاق سے ۔ نیکی سے ۔ خیالات کی پاکیزگی سے کیا تعلق ؛ میں ان چیزوں سے بالاتر ہونا چاہتا ہوں ۔ وہ طاقت چاہتا ہوں جو اپنے لئے خود قانون ہو ۔ آپ اپنے پُرانے دقیانوسی وطیرے کو چھوڑ دیئے ۔ انسانی دماغ اب وہ نہیں کہ دنیاوی جاہ وحشم کے واسطے شیطان کی مدد کا محتاج ہو مجھے افسوس ہوگا اگر یہ نتیجہ

نکلا کہ اتنے لکھو کھا سال میں انسان نے تو آخر کچھ نہ کچھ ترقی کی مگر شیطان صاحب بقول آپ کے وہی مکتب کے مُلا رہے۔

شیطان۔ اب مجھے تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ آپ کی گفتگو بڑی پُرلطف ہے۔ جو باتیں ہزاروں سال ہوئے مصر میں سُنی تھیں وہ آج پھر ہندوستان میں ایک نئی شان سے پیدا ہیں۔

مَیں۔ ہیں! کیا یہ خیالات کبھی پہلے بھی کسی نے ظاہر کئے ہیں؟

شیطان۔ کئی دفعہ۔ اگر بالکل یہ نہیں تو ان کے قریب قریب لیکن آپ کو یہ خیال کر کے اگر خوشی ہوتی ہے کہ یہ خاص آپ کی جدّت طبع کا نتیجہ ہیں تو آپ میری بات کا یقین نہ کیجئے۔ اپنے خیال پر قائم رہیئے۔

مَیں۔ جدّت ہو یا نہ ہو۔ یہی خیال ہیں جو ایک بلند حوصلہ انسان کو باقی لکیر کے فقیروں سے متمیّز کرتے ہیں۔ میں طاقت چاہتا ہوں۔ ایسی جو تمام کائنات کی کایا پلٹ دینے کے لئے کافی ہو۔

شیطان۔ مَیں آپ کی مدد کے لئے تیار ہوں۔ وہ طاقت حاصل ہو سکتی ہے۔ صرف محنت اور وقت درکار ہے۔

مَیں۔ (بڑے زور سے) محنت کے لئے تیار ہوں۔ کیسی ہی مشقت کیوں نہ ہو۔ مگر یہ بتایئے کہ وقت کتنا لگے گا؟

شیطان۔ جی زیادہ نہیں۔

مَیں۔ (بڑی بے تابی سے) پھر بھی کتنا؟

شیطان۔ بس یہی دس بیس لاکھ سال۔

جونہی یہ لفظ مجھے سنائی دیئے میرا کلیجہ پاش پاش ہو گیا مگر پھر بھی میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بڑے جوش سے کہا:۔

"اچھا کیا ہُوا۔ میں مر کر پھر پیدا ہوں گا۔ اور ضرور اس طاقت کو حاصل کروں گا۔ میں انسانی نسل کی صدا ہوں۔ ضرور بالضرور آخر الامر انسان کو وہ خدا بننا ہے جس کی تعریف سے متبرک کتابیں پُر ہیں۔"

اسی جوش اور مایوسی کے صدمے سے میں بیہوش ہُوا تھا نہ کہ شراب سے۔ اب میں تھک گیا ہوں اور سوتا ہوں۔

شریر کی ڈائری کا دوسرا حصّہ

میری بیوی میری بیماری میں اور کل جب مجھے ڈاکٹر نے لکھنے پڑھنے کی اجازت دی پروانہ وار مجھ پر نثار ہوتی رہی۔ باوجود اس کے کہ میں موقع بے موقع اسے جتلاتا رہتا ہوں کہ وہ سخت پھوہڑ اور نااہل ہے۔ شکل کی سیدھی ہے۔ اس کی اطاعت و فرمانبرداری اور خدمت میں سرِ مُو فرق نہیں آتا اس پر میرے جور و جفا کا کچھ اثر ہی نہیں۔ اگر میں دُنیا بھر میں بہترین خاوند ہوتا تو بھی کوئی بیوی میری اس سے زیادہ خدمت نہ کرتی جو بانو کرتی ہے۔ آج صبح میری طبیعت پھر اصلی رنگ پر تھی عارضی بیماری کی کمزوری تقریباً دُور ہو چکی تھی۔ واقعی بانو کو محض خفیف کرنے کے لئے اسے میں نے کل کی ڈائری سُنائی اور اس سے ماقبل کے واقعات کا ذکر کیا۔ ڈائری اور سرگزشت سُن کر کچھ گفتگو ہم دونوں کے درمیان ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ اس گفتگو سے میری زندگی آئندہ کے لئے بالکل بدل جائے گی۔ بانو نے مجھے وہ دے دیا ہے جو کوئی بادشاہ۔ کوئی ولی۔ کوئی مذہب کا بانی نہیں دے سکتا۔ بانو۔ بانو کس قدر میری عقل پر پردہ تھا۔ اور کس آسانی سے بانو تُو نے وہ پردہ دُور کر دیا ہے۔ آئندہ میں تجھے پیار نہیں کروں گا، بلکہ تیری پرستش کروں گا۔ تیری گفتگو صرف اس لئے قلم بند کرتا

ہوں کہ مجھے اس کا کوئی جملہ بھول نہ جائے اور مجھے یہ بھی یاد رہے کہ میں تو تجھے خفیف کرنا چاہتا تھا مگر تُو نے مجھے اسفل السّافلین سے اُٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا۔ نہ تیرے دل میں انتقام کا خیال آیا نہ تیور پر بل نہ آنکھ میں آنسو۔ بانو بانو تو عورت نہیں فرشتہ ہے۔

بانو۔ (ڈائری سن کر) شیطان نے ناحق آپ کے دل میں وسوسہ ڈال دیا ہے کہ آپ میری دل آزاری کرتے ہیں۔ (میرے پاؤں پر سر رکھ کر) اگر کبھی اپنی کسی حرکت سے مجھ بیوقوف نے آپ پر یہ ظاہر کیا ہے کہ آپ میری دل آزاری کر رہے ہیں تو للّٰہ آپ معاف کیجئے میں آپ کی کنیز ہوں۔

(میں نے جلدی سے بانو کا سر پاؤں سے ہٹا لیا۔ وہ اپنی دھیمی صادق آواز سے پھر بولی۔)

مَیں آپ کی ایک محبت کی نگاہ کی قیمت ساری عمر کی خدمت سے ادا نہیں کر سکتی۔ اور ایک کیا ایسی سینکڑوں پیار کی نگاہوں کی یاد میرے دل میں ہے۔ میری جان کے مالک! کیا آپ کے خیال میں بنتِ رسولؐ کی نام لیوا مسلمان خاتونیں ایسی گئی گزری ہوگئیں؟ ہرگز آپ یہ خیال نہ کیجئے۔ ہر سمجھدار مسلمان خاتون کا فرض ہے کہ وہ اپنے شوہر کی خاطر اپنے آپ کو بالکل محو کر دے۔ مجھ میں تو ہزاروں کمزوریاں ہیں سخت نامسلم ہونگی اگر جیسے آپ ہیں اس پر فخر نہ کروں بلکہ اُلٹا گلہ کروں۔ پیار کے جواب میں، یا پیار کی اُمید میں یا راحت و آرام کے عوض میں خدمت کی تو کیا کی؟ رنج میں راحت میں، بھوک میں پیاس میں، تشدّد میں تکلیف میں شوہر کی سچے دل سے عزت کرنا۔ اس کی غمگسار بن کر اس کی دل و جان سے خدمت کرنا مسلمان خاتونوں کا خاصہ ہے۔ میں اس نصب العین سے بہت دُور ہوں مگر یہ میرا مذہب ہے۔ اللہ میری کوتاہیوں کو معاف کرے آپ کبھی بھول کر بھی خیال نہ کیجئے کہ میں ناخوش ہوں۔ یا کبھی ہوئی۔ صرف مجھے اپنی خدمت کی عزت کا موقع دیتے رہئے۔ اور مَیں کچھ نہیں چاہتی۔ ہاں چاہتی ہوں اپنی گزشتہ

غلطیوں کی معافی ۔ آپ کی صحت ۔ آپ کی خوشی ۔ آپ کی عزت ۔ آپ کے لئے سب کچھ چاہتی ہوں ۔ اپنے لئے صرف آپ کی خدمت ۔ اگر مجھ سے خدمت میں کوتاہی ہوئی تو قیامت میں آپ کے والد کو کیا مُنہ دکھاؤں گی؟

مَیں ۔ بانو ۔ بانو ۔ خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو ۔ میں تمہارا سخت قصوروار ہوں ۔ تم مجھے معاف کرو ۔

بانو نے میرے مُنہ پر اپنا ملائم ہاتھ رکھ دیا اور کہا "توبہ توبہ! لونڈی سے بھی کوئی معافی مانگتا ہے" یہ لفظ اس نے بالکل بلاتصنع کہے اس کے دل سے نکلے ۔ آخر میں نے اس کا ہاتھ پرے کیا اور کہا "بانو! لونڈی نہیں ملکہ بلکہ ہادی ۔ اب زیادہ میں کچھ نہیں کہتا مگر کوشش کروں گا کہ اس قابل ہوں کہ تمہاری جیسی فرشتہ خصلت بیوی کے قدم بقدم چلوں ۔ اگر اسلام تمہاری جیسی خلق توبنیں پیدا کر سکتا ہے تو مسلمان ہونے سے بڑھ کر دنیا میں کوئی عزت نہیں ۔ آج سے الحاد کو رخصت ۔ بانو بانو ۔ تیرا دل خدا نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔

شریف کی ڈائری کا تیسرا حصّہ

میری زندگی میں کس قسم کے عجائبات کا ظہور ہو رہا ہے؟ آج صبح میں اُٹھا تو میری میز پر ایک خط پڑا تھا حالانکہ میرے کمرے میں کوئی شخص داخل نہیں ہوا تھا ۔ اس خط کو تین چار دفعہ میں نے شروع سے آخر تک بڑے غور سے پڑھا اور پھر رکھ کر بانو کو بلانے گیا ۔ ابھی کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا کہ مُڑتے مُڑتے اسی جگہ پر نظر کی جہاں خط رکھا تھا ۔ دیکھا تو خط غائب ۔ اب اس کا مطلب قلمبند کرتا ہوں ۔ خط میرے نام شیطان کی طرف سے تھا ۔

خط

ڈیر مسٹر شرید! - میری خود پسندی - میری غیر معمولی کامیابی سے اور بھی چمک اُٹھی ہے اور میں خلافِ عادت آج ایک انسان کو اپنا محرمِ راز بناتا ہوں -

سُنئیے! لاکھوں برس میں اسی دھوکے میں رہا کہ بہشت والے معاملے میں مَیں مظلوم تھا اور خدا ظالم - بزعمِ خود مجھے یہ سچی شکایت تھی کہ حوّا نے مجھے ورغلایا اور اُلٹا مشہور کر دیا کہ میں نے اسے بہکایا - مَیں دانت پیستا تھا کہ کس قدر بہتان ہے کہ آدم بہشت سے نکالا گیا - آدم اور آدم کی اولاد نے میرے ذریعہ سے دُنیا میں آکر ہزاروں خود ساختہ باغِ ارم بنائے - جس گھر میں شوہر اور بیوی ایک دوسرے کے سچّے عاشق وہیں بہشت - ایک بہشت چھوڑ دی اور لاکھوں پائیں - بنی نوعِ انسان کو میرا ممنون ہونا چاہیئے تھا نہ یہ کہ اپنا مطلب تو نکال لیا اور مجھے بدنام کر دیا -

یہ میرا وہم میری سزا تھی - میرا دوزخ تھا اور اس میرے وہم نے واقعی مجھے شیطان (جیسا کہ میں مشہور ہوں) بنا دیا تھا - خدا کو مَیں ہمیشہ "بڈھے دشمن" کے جملے سے یاد کرتا اور اس کی ہر بات کو ایک حکیمہ سمجھتا - لاکھوں برس انسانی رُوح کا شکار میرا کھیل رہا مگر وہ زمانہ ختم ہو چکا ہے - اور اس کے خاتمے کی داستان بھی عجیب ہے -

غور سے سُنئیے - ایک دن محض اتفاقیہ طور پر میں اپنی گذشتہ زندگی پر نظر ڈال رہا تھا اور خیال کر رہا تھا کہ گو خدا سے جنگ کر کے مَیں نے پے در پے زک اُٹھائی مگر لاکھوں کروڑوں انسانی روحیں تو مجروح کیں اس خیال سے میں خوش ہو رہا تھا کہ الٰہی قہقہہ نے مجھے بدمزہ کر دیا - مجھ پر صاف واضح ہو گیا کہ درِ اصل ایک روح کا بھی ان لاکھوں سالوں میں کچھ نہ بگاڑ سکا جو گر اسوا اپنے ہاتھوں - میری شیطنت کا کسی کے زوال پر کسی کے گناہ پر سرِ مو بھی اثر نہ تھا -

لاکھوں سال میں محض اپنے آپ کو دھوکا دیتا رہا۔ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ میری ہستی ایک قلمزدہ حرف غلط سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ ایک آخری کوشش میں نے کی اور وہ یہ کہ ایک واقعی سچی مسلمان دل عورت کے ایمان میں خلل ڈالوں۔ جانتیں پتہ ہے کہ کیا نتیجہ ہوا؟ ہرگز نہیں وہ نیک نہاد ویسی ہی پاک صاف رہی اور بجائے اس کے کہ وہ مایوس ہوتی اس نے اپنے دشمنوں کے حق میں یہ دعا کی کہ "یا الٰہی میرے دشمن بے سمجھ ہیں انہیں نیک توفیق دے۔ اور شیطان جو انہیں ورغلاتا ہے اسے بھی راستی کی ہدایت کر۔"

یہ دعا اس نے ایسے وقت کی جب کہ میں اپنے دل میں پیچ و تاب کھا کر یہ کہہ رہا تھا کہ "کمبخت مسلمان قوم مٹتے مٹتے بھی کس قدر دیر لگا رہی ہے۔ نہیں مٹے گی جب تک کہ ایک بھی ایماندار عورت اس قوم میں باقی ہے۔"

میرا یہ خیال اور ایک نیک عورت کی یہ دُعا۔ میں جو کبھی اپنے کیے پر منفعل نہ ہوا تھا جس کے لغت میں ندامت کا لفظ معدوم تھا اس دن مرگیا۔ اس دن سے میرا عہد ہے کہ جہاں کہیں نیک عورت کو پاؤں اس کی خدمت کروں۔ "حوا" پر بدگمانی کرنے کا کفارہ یہی ہے کہ اس کی نیک اولاد کی خدمت کروں۔

یہ وجہ تھی کہ مسز شرید کے اور آپ کے درمیان مصالحت کرانے کی آرزو میرے دل میں تھی۔ میں نازاں ہوں کہ مجھے آپ کے معاملے میں کامیابی ہوئی اور پوری۔"

یہ تھا شیطان کا خط۔ جب ابلیس بھی نیک خاتون کا مدح ہو تو لعنت ہے ان پر جو ایسا خیال کریں جس سے شیطان توبہ کر چکا ہو ۔

موت

نہیں۔ تجھے مجھ سے ذرا بھی پیار نہیں۔ اے زمینوں کو گردش میں مبتلا کرنے والی طاقت
تجھے مجھ سے ذرا بھی پیار نہیں۔ تو نے مجھے کیا سکھایا؟

مانگنا!

میں نے مانگا۔ بار بار مانگا۔ التجا سے، محبت سے، آنسوؤں سے، رو رو کر، بلبلا
کر، کیا؟

بچپن میں چاند۔ جوانی میں چاندنی راتوں کی رفیق اور اب . . . . . اب . . . .
صرف ہری ہری گھاس کا تحمل۔ مگر تیرا وہی سہ حرفی جواب۔

مانگنا چھوٹ گیا، نہیں میں اپنے آپ سے چھوٹ گیا ورنہ مانگتا اور سدا مانگتا رہتا۔

"سبحان ربی الاعلیٰ" کی خوگر جبینِ نیاز گدائی نہ کرتی تو اور کیا کرتی مگر . . . . مگر
اے آسمانوں کی وسعت کو ملیا میٹ کرنے والی طاقت تو نے میری خودی پر ڈاکا مارا۔
میرا مال تو نے چھینا۔

اب میری صدا ختم ہو چکی۔ یہ اس کی بازگشت بھی چند ساعت میں سنائی نہ دیگی۔ تیرے
سہ حرفی جواب (موت) نے آخر کار جیتے جی مجھے آلیا۔

اے زندگی کے مصرعے میں سکتہ کو دور کرنے والے کہنہ مشق استاد تیرا شکریہ۔
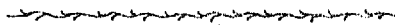
چاند

اے چاند! ممکن ہے کہ تجھے اپنی چاندنی پر ناز ہو کیونکہ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب تو چمکتا ہے تو ایک چاندی کا دریا ہماری اس میلی زمین پر لہریں مار کر اسے خوبصورت بنا دیتا ہے۔ بظاہر پتھر۔ سبزہ۔ پانی سب کو تو پیار کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ان میں ایک نئی رونق، نیا جوبن پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی مشہور ہے کہ تیری نورانی شعاعوں سے انسان کے دل کی مرجھائی ہوئی کلی پھر تر و تازہ ہو جاتی ہے۔ دماغ میں نئی روشنی آتی ہے۔ اور وہ جذبات جو اس دنیا کی کشمکش سے دب جاتے ہیں از سرِ نو جوانی کی مستانہ ادا سے جھومتے ہوئے انسانی دماغ کے باغ میں خوشی خوشی سیر کرنے لگتے ہیں۔ تیری چاندنی کیا ہے پارس پتھر ہے۔ جسے چھو گئی اسے سونا کر گئی۔ آبِ حیات ہے جو مردہ دلوں کو زندہ کرتی ہے۔ پیغامِ بقا ہے جو انسانی روحوں کو دیوتاؤں سے بالاتر رتبہ عطا کرتی ہے۔ لیکن اے چاند! کیا تجھے معلوم ہے کہ تیری سطح پر نہ پانی نہ ہوا نہ کوئی جاندار چیز، تیرا سینہ۔ ایک جھلسا ہوا داغدار بھیانک غاروں اور چٹانوں کا مجموعہ، جوانی کی آگ بجھی ہوئی، بڑھاپے کی پیاس مری ہوئی، زندگی کی آس ٹوٹی ہوئی بلکہ یہ چاندنی بھی تیری اپنی نہیں۔ تیرے گدائی کے پیالے میں سورج کی خیرات ہے۔ اور کیسی خیرات کہ مہینے بھر میں دو چار دن پیٹ بھر کر۔ ورنہ کبھی نصف روٹی کبھی اس سے بھی کم۔ اور کبھی کچھ بھی نہیں۔

اے چاند! کیا تجھے معلوم ہے کہ ہمارے ملک کا بھی یہی حال ہے۔ دُور سے دیکھیں تو

اچھا، سارے زمانے میں مشہور، اغیار کے لئے مالدار، مغربی سورج کا تختۂ مشق، ورنہ دراصل وہی جھلسا ہؤا بے جان صدیوں کا مُردہ۔

اے چاند! مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تو اس زمین سے جُدا ہؤا تو بدبختی کی مٹی کچھ تو ساتھ لے گیا اور کچھ ہندوستان میں ڈالی گئی۔ تیری اور ہندوستان کی مٹی کا خمیر ایک ہے۔ تو دیوانہ وار دُنیا کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ ہمارا ملک غلامانہ دُنیا کے بااقبال زبردستوں کے گرد پھرتا ہے۔ نہ تیرے لئے رہائی ہے نہ ہمارے لئے نجات۔ اے بے نصیب ہندوستان کے بدبخت بچھڑے ہوئے بھائی۔ کاش کہ تو روشن نہ ہوتا اور کاش کہ ہندوستان آباد نہ ہوتا۔ اس زمین کی اولاد میں سے ایک تُو اور ایک ہمارا ملک دونوں نامراد۔ دونوں کے سینے داغدار، دونوں کی آس ٹوٹی ہوئی۔

آ۔ تُو اور میرا ملک یہاں سے کوُچ کریں۔ آسمان کے ہرے بھرے کھیت میں ہزاروں جگہیں اور ہیں۔ چل کہیں اور بسیرا کریں۔

فاترالعقل سُورج

آسمان۔ کہو ننھی اچھی ہو؟

زمین۔ آداب ابا شکر ہے پر ابا آپ سے تو مجھے بڑا گلہ ہے آپ کوئی ایسے دور بھی نہیں۔ مگر خبر بھی نہیں لیتے کہ بیٹی جیتی ہے یا مر گئی ہے (روکر) اوں۔ اوں۔

آسمان۔ ننھی تمہاری یہ عادت نہ گئی کہ بات پیچھے اور اوں اوں پہلے مجھے بیسیوں کام اور ہیں۔

زمین۔ ابا تو میرا اور کون ہے؟ جس کے آگے اپنے دکھڑے روؤں۔ وہ (سورج) روٹھے ہوئے بیٹا چاند پاگل ہیں ایسی نصیبوں جلی تھی کہ جس کے گھر اتنی بیویاں پہلے تھیں۔ وہیں مجھے جھونک دیا۔ اماں کہکشاں کو یہ میاں سورج ایسے انوکھے دکھائی دیئے۔ کہ آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ عقد کر دیا۔ چار دن کا سہاگ اور ساری عمر کا روگ، میرا قصہ پاک کرا دیئے۔ جو ماشہ تولہ روشنی میری غذا ہوگی وہ کسی کے دروازے سے بھیک مانگ لوں گی۔ پیٹ ہی پالنا ہے سو خدا مالک ہے مگر مجھے اس گھر میں رہنا منظور نہیں۔ غضب خدا کا سو دفعہ چیخ چکی ہوں کہ بیٹے کا علاج کرو۔ مدرسے بٹھاؤ مگر وہ سنتے ہی نہیں۔ بیٹا ایسا نافرمان ہے کہ اُسے اپنی آنکھ مچولی کے کھیل سے فرصت ہی نہیں کہ مجھ سے دو لفظ پڑھ لے۔ اتنے بڑے کو مارتے بھی شرم آتی ہے جو کبھی ایک تھپڑ لگاتی ہوں تو نگوڑا اتنا طاقتی سے نیلا پڑ جاتا ہے۔ ابا ابا کچھ تو کہئے اوں! اوں!

آسمان۔ تمہاری رام کہانی تو کبھی ختم ہی نہیں ہوتی۔ مفت میں میرا دماغ پریشان کرتی ہو اور کبھی کوئی بات ہے کہ بس یہی!

زمین ۔ اُوں، اُوں!

آسمان ۔ اچھی ننھی رومت ۔ میں تمہاری اماں سے ذکر کروں گا۔

کہکشاں ۔ ننھی یہ کیا تمہاری عادت ہے کہ ایک کی چار چار کر کے لگاتی ہو۔ بوڑھے باپ کو اِس طرح فضول کا رنج دینا۔ جو مقدر میں تھا سو ہو گیا ۔ صبر کرو۔

زمین ۔ اماں آگ لگے صبر کو۔ آخر صبر کہاں تک؛ نہیں تم سچی ہو۔ خدا کے فضل سے لونڈیاں ماما ئیں گھر، فرش، تمہارے پاس سب کچھ ۔ تمہیں کیا پتہ کہ بیٹی پر کیا بیتی ۔ مرد کی بے پروائی کچھ گھر والی ہی سے کوئی پُوچھے (رو کر) کئی سال سے میرے سر میں دو ٹانگ والی جوؤں کا زور ہے اپنے نکھٹو کے گھر میں تم نے ڈالا کہ دو پیسے کے صابن کے لئے بھی حیران ہوں نہ لونڈی نہ باندی نہ بہن نہ بیٹی کہ سر تو دھلا دیں اس مصیبت سے تو رہائی ہو، ابا سے تو میں نے اِس کا ذکر تک نہیں کیا کہ وہ کہیں گے ننھی خبطن ہے ۔

کہکشاں ۔ (آہ بھر کر) بیٹی اللہ کرے میرا وہم غلط ہو مگر یہ دو ٹانگ والی جُوں کب سے ہے؟

زمین ۔ (سہم کر) کیوں اماں کیا یہ بُری قسم کی جُوں ہے؟

کہکشاں ۔ (بیٹی کا خوف دُور کرنے کے لئے) نہیں بُری قسم کی تو نہیں ۔ تمہاری کئی اور بہنوں کو بھی پڑی ۔ اور آخر مِٹ گئی مگر سچ پُوچھو تو اس کی خارش کی تکلیف بہت ہے اور میں نے تو اِسی لئے تمہاری شادی اِس اُجڑے دیار میں کی تھی کہ یہاں اِس جوں کا بھی نام تک نہ آیا تھا ۔ اچھا بتاؤ تو سہی کب سے ہے، کیا تکلیف ہے؟

زمین ۔ اماں ایمان کی بات ہے ابھی تک مجھے زیادہ تکلیف نہیں پہلے تو مجھے واقعی پتہ بھی نہیں چلا لیکن اب کچھ عرصے سے یہ جوں گویا میرے چمڑے میں گھُسی آتی ہے جسم کے اوپر دوڑتی ہے کبھی کبھی تو بہت بُری طرح کاٹتی ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی سُوراخ کر کے کچھ نکالتا ہو

غضب کی لڑاکا ہے اباقی سب قسم کی جڑوں کو مارتی ہے کھاتی ہے لادتی ہے۔

کہکشاں۔ ننھّی تم نے تو میری جان نکال لی تھی۔ کتنا بات کو بڑھاتی ہو۔ زیادہ تکلیف نہیں تو کچھ ڈر نہیں۔ اس کی آفرینش ہی اسی قسم کی ہے کہ چند سال بہت بڑھتی ہے پھر آپس ہی میں کٹ مرتی ہے۔ ابھی یہ کچھ دِنوں اور تمہارا پنڈا کریدے گی۔ سوراخ کرے گی۔ اُڑتی پھریگی۔ بڑی بڑی پھنسیاں پیدا ہوں گی اور پھر یہ خود ہی اِن پھنسیوں کو چیرے گی اور چیرنے میں ایک دوسرے کو فنا کر دے گی۔

زمین۔ یہ کیا قصہ میں لے بیٹھی۔ اماں تم سے ایک بات پوچھنے کو تھی۔ سُنا ہے کہ دوسری ریاستوں میں آج کل اصلاح کا بہت کچھ چرچا ہے۔ ہمارے ہاں تو اصلاح کے لفظ سے بھی کان ناآشنا ہیں۔

کہکشاں۔ بیٹی تمہاری یہ ریاست تھوڑی ہی ہے سُورج جیسے سینکڑوں جاگیردار تو تمہارے ابا کی رعیت ہی میں ہیں۔ اور تمہارے ابا کی ریاست کچھ ایسی بڑی نہیں۔ ہمارے ساتھ ملتی ہوئی دس بیس ریاستیں ہیں اور کئی ہم سے بہت بڑی۔

زمین۔ اے بی امّاں رہنے بھی دو ابا کی ریاست سے کیا کسی کی بڑی ہوگی۔ میں تو ہمیشہ یہی سمجھتی رہی کہ ابا نہ صرف گھر کے رئیس ہیں بلکہ بڑی سرکار میں مدارالمہام بھی یہی ہیں۔ اور اِن کے آگے اور کسی کی کیا چلے گی۔

کہکشاں۔ مدارالمہام تو خاک بھی نہیں۔ صرف چونکہ ہم لوگ سرحدی ہیں۔ اس لئے آؤ بھگت ہماری زیادہ ہے ورنہ کئی ایسے ہیں جو تمہارے ابا کو خرید لیں اور محسوس بھی نہ کریں۔ بیٹی ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے ایک گھر سے نکلیں دوسرے گھر میں بند۔ وہ بھی ایک طرف کو۔

زمین۔ اچھی امّی یہ بتلاؤ کہ کیا اصلاح ہوگی۔

کہکشاں۔ بیٹی مجھے صحیح علم تو نہیں۔ مگر سُنتی ہوں کہ تمہارے ابا پر ہم چشموں نے بہت بہت چوٹیں

کی ہیں کہ انتظام خراب ہے آبادی اوّل تو بڑھی نہیں اور جو بڑھی سو حفظانِ صحت سے محروم سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ تمہارے میاں کی جاگیر میں جو غیر آباد رقبہ ہے اس میں نُور پاشی کا کوئی انتظام نہیں۔ نو آبادی کا محکمہ قائم ہوا۔ مگر نہ ہونے کے برابر۔ تمہارے میاں پر بالخصوص کچھ اور الزام بھی ہیں کہ سرکاری مال کا حساب نہیں ملتا۔

زمین۔ اماں بالکل جھوٹ۔ چاہے مجھ سے وہ کیسا ہی سلوک کریں لیکن یہ تو میں ضرور کہوں گی کہ اُجڈ ہوں تو ہوں۔ فریبی مطلقاً نہیں۔ حساب نہیں ملتا تو اُن کے منشی کی غلطی ہوگی۔ لو جی اب رئیس زادے حساب رکھنے بیٹھیں۔

کہکشاں۔ بس یہی اصلاح ہے کہ چاہے کوئی رئیس زادہ ہو اور چاہے معمولی باشندہ ہر کوئی اپنی آمدنی کے خرچ کا حساب رکھے اور آمدنی کا جائز حصہ ذاتی مصارف کے لئے محفوظ رکھ کر باقی جمہور کی خدمت کے لئے وقف کرے۔ یہ پہلا اصُول ہے۔

زمین۔ اصلاح وصلاح کیا۔ یہ تو اچھی خاصی لُوٹ ہوئی۔ ریاست کاہے کی رہ گئی۔ نوکری سے بدتر درجہ ہوا۔

کہکشاں۔ ہاں بیٹی اسی سے میں حیران پھرتی ہوں۔ تمہارے ابّا کا حکم ہے کہ کئی سو لونڈیاں کم کر دوں۔ اتنے ہی نوکر وہ کم کریں گے۔ یہ سب تمہارے پچھواڑے کی طرف بسائے جائیں گے مگر محکوم حیثیت سے نہیں بلکہ پُوری آزادی سے۔

زمین۔ پُوری آزادی نہ خاک دھول۔ لو جی اب ہمارے گھر کی لونڈیاں باندیاں ہمارے برابر بیگمات بن کر رہیں گی۔ میاں سے کہہ کر جوتیوں سے نہ پٹواؤں تب سہی۔

کہکشاں۔ یہی تمہاری خام خیالی ہے۔ میاں تمہارے کیا کریں گے۔ بچارے آئے دن بڑی سی کار کے اِنسپکٹر۔ محاسب۔ فوجی افسروں کا دَورہ ہوگا۔ انتظام اُن کا حکم اُن کا۔ سرمایہ اُن کا تمہیں

تو کوئی پوچھیگا بھی نہیں۔

زمین۔ پھوٹی قسمت۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ تم سے لونڈیاں باندیاں لونگی۔ میاں سے کہونگی کہ اپنے یہودی سے قرض لیں۔ اور اس رقم سے اپنے بیٹے کو الگ گذارے کے لئے کچھ جگہ بنا دیں۔ یہاں تو چلنے پھرنے کی بھی دقت ہے۔ وہی ایک جانب اس قابل تھی کہ اس میں دو ٹھیکرے بن جاتے سو وہ بھی ہاتھ سے جاتی نظر آتی ہے۔ اس پاگل کا اور کہیں گزارہ نہیں ہوگا۔ سوچتی تھی کہ اپنی نگاہ تلے اسے بساؤں۔ اس کا بھی گھر بنے، خیر نصیب۔

کہکشاں۔ بیٹی مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ تمہارے ابا بڑے صاحب تدبیر ہیں۔ دیکھو تو سہی کچھ نہ کچھ کریں گے۔ اچھا ہوا جو تم نے مجھ سے کچھ ذکر کر دیا۔ میں ان سے کہہ دوں گی کہ نواسے کے لئے کچھ بند و بست کر رکھیں۔ لو اب خدا حافظ (منہ چوم کر) میری اچھی بیٹی خواہ مخواہ دل بُرا نہیں کرنا چاہئے۔

زمین۔ اماں ذرا تو ٹھیرو۔

کہکشاں۔ نہ بیٹی اب تو جاؤں گی۔ گھر کے سو دھندے ہیں۔

زمین۔ ایلو ذرا تو سستاؤ۔ ہاں اب کے کوئی رت جگا ہو تو مجھے ضرور بلوانا۔ میں کیا اس موئے کی لونڈی ہوں کہ گھر سے قدم نہ نکالوں۔ ایسا جی چاہتا ہے کہ تمہارے صحن میں ناچیں کودیں گائیں۔

کہکشاں۔ ضرور بلواؤں گی اور سورج کی کیا مجال کہ تمہیں رد کے۔ مگر یا تو تم اس جُوں والے معاملے کو چھپاؤ یا جب بالکل دُور ہو جائیں تب آؤ کیونکہ کئی سال سے کوارٹین بیٹھی ہے جس کے سر میں اس قسم کی جُوں ہو اُسے ناچ میں نہیں آنے دیتے۔ یہ خبیث ایک سے دوسرے کو جھٹ چڑھ جاتی ہے۔

زمین۔ بیوی تم جوں کا خیال نہ کرو۔ اُسے تو میں ایک ہی دن میں مار دوں گی۔ تم بلوانا ضرور اور ہاں تم

میرے لئے کیا لائی ہو؟

کہکشاں۔ (انتہائے محبت سے) چڑیل تیری مانگنے کی عادت نہ گئی۔ خیر کا وقت آنے دے۔ سب کچھ لاؤں گی (چلی جاتی ہے)

زمین۔ بیوی آداب۔

سُورج۔ (ایک ننھے سُورج کو دُور سے دیکھ کر) کہئے چھوٹے صاحب تم یہاں کہاں؟

ننھا سُورج۔ آداب بھائی صاحب۔ کالج میں چھٹیاں تھیں۔ آزادی از کشش کا پاس مل گیا تھا۔ چنانچہ فضائے عالم کی اپنی مرضی سے سیر کرتا پھرتا ہوں۔ کچھ دیکھ لوں گا۔ کچھ تجربہ بڑھے گا۔ کالج کی انجمن مباحثہ میں بکواس کے لئے مصالحہ ہاتھ لگ جائے گا۔

سُورج۔ کالج کیسا؟

ننھّا سُورج۔ انجنیئرنگ کالج۔

سُورج۔ لاحول ولاقوۃ۔ تو کیا اب تمہارے ہاں نوبت با اینجا رسید کہ رئیس زادوں کو بھی لوہار، بڑھئی کے کام کی تعلیم دی جاتی ہے۔

ننھّا سُورج۔ (ہنس کر) جی ہاں! ہمارے ہاں تو کچھ اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شریف زادوں کو شک کا فائدہ اُٹھانے دیا جائے اور اس شک کی بنیاد پر فی الحال انہیں ذمہ دار ذی رُوح کی فہرست سے خارج نہ کیا جائے۔

سُورج۔ (دل میں سخت پیچ و تاب کھا کر) سبحان اللہ۔ مگر بھائی اس نئی تعلیم کا نتیجہ؟

ننھّا سُورج۔ (کالج کی آزاد ہوا میں پلا ہوا نوجوان کچھ شوخی سے جواب دینے پر آمادہ تھا مگر یہ سوچ کر کہ دُور نزدیک کی قرابت داری ہے۔ مخاطب ایک طرح سے بہنوئی بھی ہے۔ رُک کر متانت سے

جواب دیتا ہے بھائی صاحب آپ تو کبھی ادھر آتے نہیں ورنہ نتیجہ خود دیکھ لیں۔ لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے تعلیم پاتے ہیں۔ پہلا سا حجاب نہیں۔ سچ پوچھئے تو پہلی سی جہالت نہیں۔ پچھلے سال شہر ہمارے صوبے کے نوجوان سُورج کانفرنس میں جمع ہوئے۔ تجویز ہوئی کہ موجودہ نظام میں روشنی وکشش دونوں کا بے طرح اور غیر مفید خرچ ہو رہا ہے۔ آئندہ دونوں کا بجٹ بن کر جمہور کی رائے کے مطابق اِن ذرائع کی تقسیم ہو۔ سنتا ہوں کہ صدرِ اعلےٰ میں اس تجویز کو پسند کیا گیا ہے اور جلدی احکام جاری ہونے والے ہیں کہ یہ ہزاروں لاکھوں سُورج جو شترِ بے مُہار کی طرح چکر لگاتے پھرتے ہیں، آئندہ مقررہ خدمات پر مامور کیئے جائیں۔ لاکھوں سُورج خود ہی رپورٹ کر چکے ہیں کہ اُنھیں اپنے سابقہ اختیارات کی ترمیم میں کوئی عذر نہیں۔ بلکہ تجویز یہ بھی ہے کہ کوئی سُورج بھی بالطبع محرک نہ رہے جس کا نتیجہ حکمائے ارتقا کی رائے میں نہایت حُسن افروز ہوگا اِس صدیوں کی پُرانی گول گیند والی ہیئت کذائی میں بوجہ سکون قدرتی طور پر تبدیلی ہوگی۔ اور آئندہ سُورج نہایت خوشنما ہزار پہلو قطع کے ہوں گے۔ آپ مفصّلات کے بزرگوار اگر کچھ دلچسپی لیں تو ممکن ہے اور بھی بہتر تجاویز نکلیں۔ جو اہل الرائے ہیں۔ اُنھوں نے محسوس کیا ہے کہ پُرانے نظام کے تحت بعض سُورج اپنی آزادی کا ناجائز استعمال کر رہے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ خاندانی زندگی میں بجائے باہمی امداد کے ایک تحکّم کا پہلو پیدا ہوگیا ہے۔ سچ پوچھئے تو اس زمرہ میں آپ کا بھی ذکر ہوا تھا۔ مگر محض سرسری طور پر

سُورج۔ ڈیم۔ میرا کیا ذکر ہوا تھا؟

ننھّا سُورج۔ اجی جانے دیجئے فرمائیے ہماری آپا تو اچھی ہیں؟

سُورج۔ اچھی ہیں مگر مجھے یہ ضرور بتاؤ کہ میرا کیا ذکر ہوا تھا؟

ننھّا سُورج۔ بھائی صاحب! میں نے صرف اسی قدر سُنا کہ آپ بڑے دقیانوسی خیالات رکھتے ہیں

تعلیم کے خلاف ہیں۔ اور ابھی تک اپنے بچوں کے لئے تعلیم کا مناسب انتظام نہیں کیا۔ کوئی کہتا تھا کہ آپ کے چار بچے ہیں کوئی کہتا تھا پانچ ہیں۔ آخر ان میں کوئی نہ کوئی اس عمر کا ہوگا کہ اسے کالج نہ سہی سکول کی بڑی جماعتوں میں داخل کرایا جائے۔ خدا جانے آپ نے کیوں ایسا نہیں کیا۔

سُورج ۔ سچ پوچھو تو میں تعلیم کا مخالف ہوں۔ ہمارے باپ دادا نہیں پڑھے تو گزارا ہو ہی گیا میں بھی صرف مکتب ہی میں پڑھا۔ اور میرے خیال میں وہ بہت کافی ہے۔ دوم میرے پاس اتنا سرمایہ نہیں کہ تعلیم کے مصارف برداشت کروں۔ چار بیویاں، عیالداری، مہمانداری خدا جانے کس تنگی ترشی سے گزرتی ہے۔ تم سے تو کوئی پردہ نہیں۔ اب صرف نام کی جاگیرداری ہے۔

ننّھا سُورج ۔ بھائی صاحب آپ اپنا کورٹ آف وارڈز کرائیے۔ وہ خود ہی بچوں کی تعلیم کا فکر بھی کرلیں گے۔ اور آپ بھی ذرا پر قبض رہیں گے۔ آداب (جاتے جاتے) آپا کو تسلیم۔

خط مِن جانب سورج بنام آسمان

قبلہ تسلیم ۔ کچھ عرصہ ہؤا کہ اُڑتی ہوئی افواہ سُنی تھی کہ جناب کے علیہ کی جو جاگیر میرے زیرِ اہتمام ہے اِس کی نسبت بڑی سرکار میں بعض بدظن طبائع نے زہر اُگلا ہے۔ قرائن سے کچھ اِس افواہ کی تصدیق ہوتی ہے کہ آئے دن میری سرحد پر غیر مانوس قطع کی ہستیاں چکر لگاتی پھرتی ہیں۔ یہ امر مجھے دو وجہ سے ناگوار ہے۔ اوّلاً اس لئے کہ اگر یہ آنے جانے والے دوست ہیں تو ان کا میرا مہمان نہ ہونا میری سخت توہین ہے۔ اور مجھے ایک جائز خوشی سے بلاوجہ محروم رکھتا ہے۔ دوم یہ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ کسی نیک ارادے سے نہیں بلکہ کسی ٹوہ میں اس طرف چکر لگاتے ہیں۔ اس دوسری

صورت میں "میری پالیسی کیا ہونی چاہئے" کے سوال پر غور و خوض کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں
کہ خاموش رہنا تو یقیناً غلط ہے یا مجھے ان لوگوں کی مدد کرنا چاہئے۔ یا ان سے مقابلہ دونوں طرح
سرمایہ کا خرچ ہے۔ آپ کے مشورہ کی ضرورت ہے۔ اگر مجھے موقعہ دیا گیا تو آپ کے آئندہ
دَورہ میں زبانی بھی کچھ عرض کروں گا۔

آپ کا فرمانبردار غلام سُورج

آسمان کا خط سُورج کے نام

عزیزم! تم شکر کرو کہ آج کل دفتر میں میں خود کام کرتا ہوں اور تمہارا خط میرے ہاتھ آیا
اور ہاتھ سے سیدھا ردی کی ٹوکری میں گیا۔ اگر کسی اہلکار کے ہاتھ آجاتا تو بات شاید
باہر نکل جاتی اور مجھے اور مصیبتوں کا سامنا ہوتا۔ میرے سر پر آج کل تمہاری اور تم
جیسے دو چار اور صاحبزادوں کی بدولت آفت پر آفت ہے۔ برخوردار اتنا تو سوچو کہ تم تو
خیر میری بھی کیا ہستی ہے کہ صدر اعلےٰ کے احکام میں چون و چرا کر سکوں۔

برخوردار! پھر مقابلے کا لفظ بھول کر بھی استعمال نہ کرنا۔ تمہاری خاموشی بے معنی تمہاری مدد
فضول۔ تمہارا مقابلہ ہیچ۔ مدد مقابلہ وہ کرے جسے کچھ لیاقت ہو میں بھی اتنا بوڑھا نہیں
کہ زمانے کا رنگ بدلتا ہؤا نہ پہچانوں پیشتر اس کے کہ صدر اعلےٰ سے احکام جاری
ہوں میں نے اپنے ہاں ریذیڈنٹی کے لئے خود درخواست کر دی ہے۔ آئندہ جو احکام
ہمارے ہاں کی ریذیڈنٹی سے جاری ہوں۔ ان کی تعمیل تمہارا فرض ہے۔ تمہاری نئی ترین
کوشش یہی ہو سکتی ہے کہ تم فاتر العقل ہونے کی بنیاد پر کام سے سبکدوش کئے جانے
کے متعلق تحریری درخواست کر دو۔ درخواست کی منظوری میں کچھ دقت نہیں ہوگی کیونکہ

بات تقریباً سچ ہے اور اطبا تمہیں ضرور سرٹیفکیٹ دے دیں گے۔
سنتا ہوں کہ تمہارے علاقہ میں بھی دوٹانگ والی جوں نمودار ہوئی ہے۔ اگر یہ درست
ہے اور اگر اس کا پتہ محکمۂ صدر اعلےٰ میں چل گیا۔ تو بڑی بے عزتی سے نکالے جاؤگے
یا اسے جلاؤ یا خود کچھ کھالو۔ تھوڑا لکھے کو بہت سمجھنا'
مجھے فضول تحریرات کے پڑھنے کے لئے وقت نہیں مل سکتا۔ فقط

آسمان

(سورج خط پڑھ کر کانپ جاتا ہے اور بے اختیار ہو کر کہتا ہے) افسوس افسوس افسوس! میں اُدھر
سے بھی گیا اور ادھر سے بھی کہیں کا نہ رہا۔ میری چھوٹی دلہن اس کی نیلگوں آنکھیں کس قدر دلفریب ہیں
مجھ سے بیس دفعہ ریڈیم کا صابن طلب کر چکی مگر میں اپنی جہالت نہیں اپنی طبعی کنجوسی کے باعث ہمیشہ
اسے ٹالتا رہا۔ افسوس ریڈیم میرے پاس تھی مگر میں نے اسے اس کی ضرورت کے موافق کافی نہ دی۔
تبھی وہ پہلے سے زرد ہے۔ حرارتِ غریزی اس کی کم ہے۔ وہ مجھ بے وقوف سے بیس دفعہ کہہ چکی کہ میری
طبیعت اچھی نہیں۔ میرا علاج کیجئے۔ بیٹے کا کیجئے۔ مگر میں اُسے مکر و فریب سمجھتا رہا۔ میں بھی احمقانہ
خیال دل میں جمائے رہا کہ محض بنے ٹھنے رہنے کے شوق میں اس کا یہ آئے دن کا تقاضا ہے مجھے جاننا
چاہیے تھا کہ عورت کے لئے خود آرائی بھی ایک اعلےٰ نیکی ہے۔
خیر اب بھی کچھ نہیں گیا۔ اس جوں کا قلع قمع کرنا کیا مشکل ہے؟

میرا زینہ

اپنی رُوح کی چور جیب میں مَیں نے ایک طے ہونے والا زینہ احتیاط سے لپیٹ کر رکھ چھوڑا ہے۔ جب روپے پیسے کی ضرورت ہو مگر بٹوا حکام کے وعدوں کی طرح خالی ہو، یا کوئی ناحق مجھے ستانے کی کوشش میں کامیاب ہوتا نظر آنے لگے، یا بیمار ہوں تو میں اپنے اس زینہ کو نکال کر کھیل میں مصروف ہو جاتا ہوں اور یہ کھیل مجھے اس زندگی کے تمام دھندے بھلا دیتا ہے۔ میرا یہ عجیب و غریب زینہ کھلتے ہی بڑھنے لگتا ہے اور کہیں کا کہیں پہنچتا ہے۔ میں سیڑھی بہ سیڑھی چڑھتا ہوں مگر پل کی پل میں زمین نیچے دُور رہ جاتی ہے۔ بادلوں سے کھیلتا ہوا ان کو رستے سے ہٹاتا ہوا، دن ہو تو سورج کی کسی یکہ و تنہا شعاع کی ڈوری کے سہارے، رات ہو تو کسی تارے کی کرن کو مضبوطی سے تھام کر میں بڑھتا چلا جاتا ہوں۔

بار بار کے آنے جانے سے دو چار مقام پر کچھ شناسائی سی بھی ہو چلی ہے اگر کبھی ان میں سے کسی جگہ ٹھہر جاؤں تو لطفِ مجلس عرصے تک نہیں بھولتا۔ صرف ایک کمی ہے کہ ان میں سے کسی ایک جگہ بھی بات کرنے کی اجازت نہیں۔ سنو، دیکھو، سونگھو، چکھو، لپٹو مگر کلام نہیں۔ جہاں بات کرنے کا خیال بھی دل میں آیا تو اڑا اڑا دھم۔ زینہ صاحب طے ہو کر جیب میں اور چوٹ مُفت میں۔ یا یہ ہے کہ مجھے ان مقامات کی زبان سے واقفیت نہیں۔ شاید زیادہ آؤں جاؤں تو کچھ سیکھ جاؤں مگر اس قدر فرصت کہاں۔

جب گفتگو نہیں تو انسان سنتا کیا ہے؛ سنیئے۔ لطیف صدائیں، بُزدل سے بُزدل کو شجاع بنانے والے بے لفظ نغمے، شرمیلے سے شرمیلے کو دلیر کرنے والی سرگوشیاں، وہ دل ہلا دینے والے نعرے

جن سے بجلی کا ناطقہ بند ہ۔

میرا زینہ ہمیشہ ایک خاص مقام پر جا کر ختم ہو جاتا ہے ، میں اُترتا ہوں اِدھر اُدھر پھرتا ہوں اور پھر ہمیشہ ہمیشہ قبلہ رُخ ایک عالیشان عمارت (جو کسی بہت عظیم الشان یادگار کی محض ڈیوڑھی ہے) کے مقابل پہنچ جاتا ہوں ، جو باغ اس عمارت کی قدمبوسی میں مصروف ہے اس کے پھولوں کو سُونگھتا ہوں۔ ہونٹوں سے چھُوتا ہوں ، نُورانی موتیوں سے لدی ہوئی زمردیں گھاس سے لپٹتا ہوں وہ بُوئے وفا سے معطر گھاس ہمیشہ یہی سُجھاتی ہے کہ پہلے ٹھکانا کرو پھر جی بھر کے تفریح۔ یہ سُنتے ہی میں ہمیشہ اس عالیشان عمارت کی طرف بڑھتا ہوں مگر ایک مقدس اشارہ جس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں "تمہیں سمجھایا جا چکا ہے۔ اب پھر بتلایا جاتا ہے کہ اجازت نامے کے بغیر تم داخل نہیں ہو سکتے۔ یہ دروازہ تمہارے لئے نہیں کھُلے گا تا وقتیکہ تم خود کسی کے بنو یا کسی اور کو اپنا بناؤ" مجھے ہمیشہ واپس کر دیتا ہے۔ میں فوراً اُتر آتا ہوں ، اپنے زینے کو طے کر کے لپیٹ کر چھپانے لگتا ہوں اور ہمیشہ اسے یہ کہہ کر مخاطب کرتا ہوں :-

"اے میرے پیارے زینے ! میں خود اپنا نہیں بنتا تو کسی اور کو اپنا کیسے بناؤں ؛ کاش ! کاش کوئی مجھے اپنا بنا لے !"
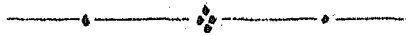
مَیں اُس کا بن گیا

اُس کی اور میری گفتگو اِدھر کی اُدھر کی ہوتی رہی مگر اُس نے نہ مجھے دیکھا نہ سُنا۔ کوئی آج کی سرگذشت نہیں تین سال سے برابر یہی ہو رہا ہے'

اُس نے کبھی بھی مجھے نہ دیکھا۔ کبھی بھی مجھے نہ سُنا۔

ممکن ہے کسی بڑی بوڑھی کو شاید میرے ہونٹوں کی غیر معمولی خشکی سے، میری آواز کے غیر محسوس لرزہ سے کچھ بھانپنے کا موقع ملا ہو مگر مَیں جب اس کے حضور میں گیا تو اپنے آپ کو بالارادہ اچھی طرح دم بخود کر کے انہیں نہیں، اچھی طرح قتل کر کے یعنی آنکھوں سے یہ کہہ کے کہ اگر شوق کی شعاع تم سے چمکی تو تمہیں پھوڑ دیا جائے گا، زبان سے یہ کہہ کر کہ اگر رسمی بے تعلقی کے فقرات کے علاوہ کچھ کہا تو کاٹ دی جاؤ گی۔ گویا سرکارِ حُسن میں دائمی باغی بن کر پیش ہوا۔ گلاب کے پھول کے سامنے بے جان خس کی طرح، قدرت کی گوناگوں دلفریبیوں کے سامنے بے حس دہقان کی طرح، نگاہ کبھی نہ اُٹھی۔ ہاتھ کبھی نہ بڑھا۔ دل کبھی نہ دھڑکا۔ دریا سے ہمیشہ پیاسا آیا۔

مَیں اس کا ہوں وہ کسی کی بھی نہیں

ابھی تک اسے آئینہ دیکھنا بھی نہیں آتا۔ میں نے اسے آنچل سر پر اگلی جانب کو ایک کافر ہاتھ سے کھسکاتے دیکھا ہے۔ وہ کبھی ایک ثانیہ بھی بہ تبسم اس آنچل کے ستم زا خم دیکھنے کے لئے آئینہ کے سامنے نہیں ٹھیری۔ اسے اپنے بالوں کی بغاوت کی شعریت کا کچھ بھی علم نہیں۔ کسی دن یہ ڈھیٹ شوخ، بال اس کے کان میں کچھ کہہ گزریں گے اور کلی پھول بن جائے گی مگر ابھی وہ وقت

نہیں آیا۔ اس کی رعنائی کے گل ہزارہ لاکھوں روزانہ اس کے کمرے میں کھلتے ہوں گے مگر وہ دیکھتی تک نہ ہو گی ۔ بے پروا مسرف حسینہ گرانبہا دولت کو کس بے خبری سے پھینک رہی ہے۔

وہ خود اپنی بھی نہیں

قدرت نے اسے قد دیا ہے، قد کے ساتھ چال بھی لچک بھی مگر ابھی اسے اٹھلا کے ناز کے ٹھکرا کے چلنا تک نہیں آتا۔ کالج کی لڑکیوں کے ساتھ فوٹو اُتروانے میں ایک جانب کو الگ بیٹھ گئی ۔ اسے پتہ ہی نہیں کہ وہ اگر کچھ سمٹ کر کچھ مُڑ کر کھڑی ہوتی تو کیا کیا قیامت برپا ہوتی ۔ اسے مَیں نے کالج میں مصوری سیکھنے کے لئے کہا۔ اتنا بھی نہ بولی کہ میں تو خود تصویر ہوں بغیر نقاشی جاننے کے دوسروں کو تصویر بنا دیتی ہوں ۔ اگر وہ یہ کہہ دیتی تو مجھے یاد آ جاتا ہے کہ ایک دفعہ گاڑی میں سوار ہونے کے لئے جب میرے پاس سے ہو کر نکلی تو میں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ برآمدے میں پاؤں گڑ گئے گاڑی تک نہ جا سکا۔ میں اس کا ہوں گو اس قابل نہیں اور اس لئے خدا کرے کہ وہ

کبھی مجھے نہ دیکھے ۔ کبھی مجھے نہ سُنے ۔ کبھی مجھے نہ سمجھے ۔

کیونکہ مروّجہ دنیاوی پیار کا لُغت میرا لُغت نہیں ۔ میری زبان اور آنکھیں اور دل اور ۔ لوگ عین ۔ شین ۔ قاف کا سہ منزلہ کاغذی محل بنا کر وصل و ہجر کی لفظی کمند بازی کرتے ہیں ۔ ہوا آتی ہے تو نہ وہ لبِ بام نہ وہ کمند ۔ کہاں حُسن پرستی کہاں یہ بوالہوس؟ میرا چاہنا الگ میرا مرنا الگ ۔ میری ساری دُنیا الگ ۔

چاہتا ہوں، مدت العمر چاہوں گا مگر ہاتھ لگ جانے کے لئے نہیں بلکہ محض اس لئے کہ بے لَوث خدمت کا موقع ملے ۔ دل، دل کی ہر نیک آرزو اس کی نذر ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ۔ میرا فرض ادا ہو چکا ۔ میرا انعام مجھے مل گیا۔

مَیں اُس کا بن گیا

قاضی دیگ بر

اس قابلِ رشک سرزمین میں جہاں لوگوں کو کھانا اور کھلانا، ہننا اور ہنسانا، اور گاہے ماہے لوٹنا اور لُٹنا آتا ہے اور خوب آتا ہے، جہاں قلاشوں میں تو ہونا ہی چاہیئے۔ مالداروں میں بھی خوش دلی کا مرض عام ہے، جہاں کی اماں حوّا سوا مرد اور باوا آدم سوا انگریز ہے، جہاں پان کی گلوری کھا کر ماتھے سے پسینہ پونچھنے والوں کی تہذیب کی الف بے سے بھی شناسائی نہیں قاضی دیگ بر عجائباتِ زمانہ میں سے تھے۔ تحقیقی طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ نامہ بر کے وزن پر انہیں دیگ بر کہا جاتا تھا۔ یا اسی رعایت سے کہ ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ پیٹ
مے برد ہر جا کہ دیگ است و پلیٹ

مگر وہ اس نام سے ناخوش نہ تھے۔ وہ اس امر کا زندہ وعظ تھے کہ احتیاط و اہتمام کیا جائے تو سولہ آنے کی بجائے پندرہ آنے صرف کرنے سے کھانا اعلےٰ اور وافر تیار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ان کے لئے یہ معمولی بات تھی کہ زید (جس کے ہاں کسی تقریب سے دعوت ہے اور جو قاضی صاحب کا ہرگز ملاقاتی نہیں) کے ہاں پہنچے اور السّلام علیکم کہنے کے ساتھ ہی کہا۔ " او لالہ[1]! یہ کام تجھ سے نہ ہوگا روپیہ مجھے دے۔" یہ کہہ روپیہ اس سے لے ایک دِن دو دِن جب تک ضرورت ہو اس کا کام

---

[1] افغانی گفتگو میں چاہے وہ پشاور کی پنجابی میں ہو یا یوسف زئی پشتو میں یا نواح کابل کی فارسی میں لفظ "لالہ" مخاطب کے لئے ادباً استعمال ہوتا ہے۔

کیا، خوشی سے لوگوں کو کھانا کھلایا اور چلے آئے۔ کیا مجال کہ برسوں میں کبھی کسی نے سنا ہو کہ ایک پیسہ اِدھر سے اُدھر ہُوا۔ بلکہ ہمیشہ لوگ معترف ہوتے کہ قاضی صاحب نے کھانا بھی اعلےٰ تیار کرادیا اور روپیہ بھی کم لگوایا۔ قسائی سے وہ اوروں کے لئے گوشت خریدتے تو بازار میں ٹھٹھ لگ جاتے۔ قسائی اور پشاور کا قسائی! مگر آخر کار ہار مانتا اور کہہ دیتا کہ قاضی میرا چمڑہ تک تو تم نے اُتار لیا اب معاف کرو۔ جب ان کو دل پسند گوشت مل جاتا تو ہمیشہ فرماتے گوشت نہیں عطر ہے۔ اور یہ درست ہوتا کیونکہ دیگ کے متعلق وہ ماہرِ کامل تھے۔ گھی کے دریاؤں کے شناور، چاولوں کے ریگستان کے سیاح، آنچ کے حافظ۔

اگر کبھی وہ سُن پاتے کہ کسی شخص کے ہاں دعوت میں کھانا اچھا نہیں تیار ہُوا تو گھنٹوں قلق کیا کرتے۔ باورچی کو تلاش کرکے اسے بُرا بھلا کہتے اور سمجھاتے کہ میری غفلت ہے کہ وقت پر پتہ نہ چلا۔ الغرض ان کی زندگی دیگ کے لئے وقف تھی۔ اگر کبھی انہیں خاص الخاص برّے[1] یعنی باڑے[2] کی گھاس سے پلے ہوئے مل جاتے تو دلی عشق سے پلاؤ تیار کراتے وہ پلاؤ جس کی نسبت یقیناً کہا جاسکتا تھا ؎

پلاؤ۔ برّہ چہ بینی شہید کُن خود را
کہ مرگہائے چنیں گاہ گاہ می آید

---

[1] برّہ (چھوٹا دُنبہ) پشاور کا خاص تحفہ ہے۔ اس کا گوشت اس قدر نرم اور لذیذ ہوتا ہے کہ قیمہ کرکے کباب نہیں بنائے جاتے بلکہ چھوٹی چھوٹی بوٹیوں کو سیخ میں پرو کر نرم آنچ پر سوختہ کیا جاتا ہے۔ اہل پشاور کا خیال ہے اور درست خیال ہے کہ ایسے کباب امیرِ کابل کو بھی نصیب نہیں ہوتے۔

[2] باڑہ ایک پہاڑی ندی ہے جو آفریدی قوم کے ملک سے نکلتی ہوئی پشاور کے پاس سے گزرتی ہے۔ اس پانی میں ہلکے رنگ کی گلابی مٹی کی آمیزش ہوتی ہے جس سے یہ پانی زراعت کے لئے اکسیر ہے۔ باڑے کے چاول مشہور ہیں۔ زراعت تو زراعت ہے۔ جو دُنبہ اس پانی سے اُگی ہوئی گھاس کھا کر پلے۔ وہ اپنا جواب نہیں رکھتا عجیب سرسبز و شاداب گھاس ہوتی ہے۔

ان کے حسب منشا، کباب (تکے) تیار ہو جاتے تو اہلِ مجلس میں سے ایک ایک کے پاس خود پلیٹ لے کر حاضر ہوتے۔ اک عجب وجدانی کیفیت سے سبحان اللہ سبحان اللہ کرتے۔ گو انہوں نے کبھی کہا نہیں مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ انہیں القاء ربانی تھا کہ "اے قاضی تو لوگوں پر واضح کر دے کہ بہشت ہونٹوں سے شروع ہوتی ہے اور حلق پر ختم ہو جاتی ہے" اپنے طرزِ عمل سے انہوں نے بار ہا لوگوں کو اس بہشت کی سیر کرائی۔ واے بر آنان کہ نہ شناختند۔

قدر دان لوگ اور قاضی صاحب کے قدر دان بیسیوں تھے اکثر ذکر کرتے کہ جب سے شہر بھر کی ضیافتوں کی آنریری مدار المہامی کا بوجھ قاضی دیگ برنے اپنے سر لیا ہے کھانے کے لطف میں سو فیصدی بیشی ہے اور اس کا اعتراف اس سرزمین کی مسلّمہ فراخ حوصلگی سے کیا جاتا۔ کوئی قاضی صاحب کو قالین دیتا، کوئی رُوسی چار کاسیٹ، کوئی مشہدی لُنگی، مگر قاضی صاحب پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ وہ دینے والے نہ دینے والے کا کام برابر و یکساں شغف سے کرتے۔ مصرع "نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا" پر ان کا سچے دل سے عمل تھا۔

قاضی صاحب کام بہت کرتے تھے اور باتیں بالکل کم۔ ایک خاص چرچے کی تقریر کے جلسے میں وہ دکھائی نہ دیئے تو دوسرے روز میرے استفسار کے جواب میں بولے "صاحب ہیں! کیا آتا جنّ رگوا کی تقریر پر آپ اس قدر مفتون ہیں انہوں نے کل شام کھچڑی کھائی اور آج صبح نان پاؤ، وہ بھی دو نوالے میں ہمیشہ پہلے یہ دیکھتا ہوں کہ یہ سوختگانِ قوم کیا کھاتے ہیں اور کس طرح؟ رات مجھے تو نفرت ہو گئی کہ کہاں بے روغن کی کھچڑی کہاں قومی اصلاح! بکریوں سے ہاتھیوں کے کام ہو چکے بہت ہو گا تو یہی کہ چھری تلے "میں میں" (قاضی صاحب نے بکری کی آواز کی خوب نقل اُتاری)۔ میری رائے اگر سرکار مانے تو تمام اسکول تمام دفاتر تمام کچہریاں بیس سال کے لئے بند کر دے اور پہلے لوگوں کو کھانا پکوانا اور کھانا سکھلائے۔ عام اعلان ہو جائے کہ جو اعلیٰ کھانا نہیں کھائے گا اس کے لئے کوئی قانون

نہیں۔ تمام بُرائیاں بُرے کھانے سے پیدا ہوتی ہیں۔ جو کھا نہیں سکتے وہ سوچ نہیں سکتے۔" اس دن مجھے پہلی دفعہ سُوجھی کہ اوہو یہ قاضی تو دراصل ایک نئے انقلابی مذہب کا بانی ہے۔ جس کی عملی تعلیم صرف اسی قدر ہے کہ "اچھا کھاؤ، خوب کھاؤ اور خوش ہو ہو کے کھاؤ۔"

افسوس کہ وہ بانیٔ مذہب الطعام دنیا سے اُٹھ گیا۔ وہ کباب کے کوہ الپس کا ہینی بال، پلاؤ کی سینی کے برِّ اعظم کا سکندر، بزمِ خوردنی کا ارسطو، رزمِ ضیافت کا ہومر فنا فی الدیگ قاضی دیگ بہ اب خواب و خیال ہو گیا۔ ع

قرنہا باید کہ تا یک مردِ دیگ

ایک شام
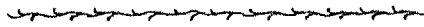
دن تھوڑا ہی باقی تھا کہ ایک زور کا چھینٹا پڑا۔ اور پھر کچھ ہوا چلی، ہوا کیا چلی کہ قدرت کے سٹیج پر سین بدل گیا۔ یا تو شام سے پہلے شام ہو چکی تھی یا سنہری روپہلی دھوپ ہنستی ہوئی تھنتی ہوئی درختوں کو چھوتی ہوئی مسجد کے میناروں سے لپٹتی، گھروں کی چھتوں کو روندتی سب جگہ پھیل گئی۔ دُنیا جگمگا اُٹھی۔ پانچ منٹ برابر یہی عالم رہا۔ سلطنت عجیب چیز ہے۔ سُورج گویا اِترا اِترا کر کہہ رہا تھا "دیکھا!! حکومت اس کا نام ہے کہ ایک نگہ گرم سے سیاہ بادلوں کو کافور کر دیا۔ یہ جو ایک لکۂ ابر قبلہ رُخ رہ گیا ہے اسے ابھی آگ لگا کر تماشا دیکھوں گا۔" یہ تماشا بھی واقعی ہُوا، جو بادل بچ رہا تھا وہ شعلہ بن کر بھڑکا۔ "آتش برستی تھی گلستان پر" کا نقشہ بندھا۔ زرد چہرے بھی تمتما اُٹھے جو پہلے ہی گلرنگ تھے ان کا تو کیا کہنا۔ انار کے پھُول کو شرماتے تھے۔ عجب شام تھی کہ مغرب مشرق دونوں دُولہا دُلہن کے رنگ میں تھے۔ سُورج غروب ہُوا ہی تھا کہ چودھویں کا چاند نکلا۔ درختوں کی چھاؤں اس حملہ کی کیا تاب لاتی۔ ابھی ابھی مشرق کی طرف میلوں پھیل رہی تھی مگر پسپا ہوئی اور بھاگ کر مغرب کی طرف پناہ لینے لگی مگر کب تک؟ چاند ہے کہ بڑھتا چلا آتا ہے گویا کہہ رہا ہے کہ آج نہیں چھوڑوں گا تاریکی کو جہاں پاؤں گا لُوٹوں گا۔ گھروں میں، باغوں میں، دلوں میں جس جگہ اندھیرا ملے گا اسے مٹاؤں گا۔

ہلکی ہلکی ہوا کی مدد سے باغ میں چاندنی نے پتا پتا پلٹ کر دیکھا، بالائے بام سوتے جاگتے سب بچّوں سے کھیلی۔ شرمیلی سے شرمیلی آرزو کو بے نقاب کر کے رہی۔ شوخ چنچل چاندنی ابھی اور کیا کیا کرتی مگر اُف رے غضب! وہ چاند جو ابھی بقعۂ نور بن رہا تھا جس کی بے دھڑک شکاری

کرنیں۔ بلوں میں گھس گھس کر تاریکی کو مجروح کر رہی تھیں خود سائے میں آ گیا۔ درختوں کے نیچے سے کاملانی کا جال مٹ گیا۔ دریا کا دُھلا دُھلایا مُنہ پھر گدلا گیا۔

اے زمین تجھے خدا سمجھے! کم بخت آج ہی تجھے مہ و مہر کے درمیان حائل ہونا تھا۔ او بخیل تجھے یہ بھی خیال نہ آیا کہ اور لوگوں کے تجھ پر قلعے محل، باغ، شکار گاہیں، کسی کی کانیں، کوئلے کی، لوہے کی، سونے کی، ہیروں کی، کسی کے کھیت کسی کے نخلستان، کسی کے کنوئیں کسی کی نہریں، تیرے چپے چپے پر مُہریں میری نہیں اور لوگوں کی۔ تو کیا تجھ سے اتنا بھی میرے لیئے نہ ہو سکا کہ آج شام تو دل کھول کر چاند کو چمک لینے دیتی۔ سُن او بے پروا ظالم سُن! میں اُسے خط لکھنے والا تھا کہ "اے میری مہ پارہ اے مہ جبینوں کی ملکہ . . . . " مگر اب کس مُنہ سے اسے چاند سے تشبیہ دوں۔ تیرا ستیا ناس ہو کہ تو نے میرا مضمون بگاڑ دیا۔

اری او جوتی خوری تجھے جاٹ ہی سیدھا کرتے ہیں کہ اونے پونے داموں بنئے کے پاس گروی رکھتے ہیں۔ میں نے نہ تجھے خریدا نہ تجھے کھودا باوجود اس کے تو نے میرا بنتا ہوا استعارہ تباہ کیا۔ خیر! آنے دے کسی دُمدار ستارے کو۔ بس چلا تو اس میں تجھے جھونکوں گا +

ندائے شباب۔ ہندوستان ترقی کیوں نہیں کرتا؟ کیسے کرے جب کہ وہ گلابی گال جن کے لئے جوانی کھونا ثواب ہو، جن کا تصور عمر بھر کے لئے شغل ہو، جن کے لئے موت کو کھیل سمجھا جائے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قید ہوں۔ قید نہیں زندہ درگور، کفن پردہ میں دفن۔

اُمنگ پیدا ہو تو کس کے لئے؟ کوئی کچھ کرکے دکھائے تو پائے کیا؟ وہ مہ جمال جن کی جنبش مژگاں اقلیم دل کو زیر و زبر کردے جن کا ادنیٰ اشارہ لکھنؤ کو خیبر میں بدل دے، بے خبر ہیں، بے بس ہیں، بے حس ہیں۔

اے ہند! انگورہ کا چاند بادل سے نکل چکا۔ مصر کی زلیخائیں روز روشن میں لب بام جلوہ افگن ہیں مگر تیری پدمنیاں ابھی تک چتوڑ رسوم میں محصور۔ اے ہند! نکال اپنے

دفینے!

پھر دیکھ کہ کیا ہوتا ہے۔

صدائے ہند۔ او بے صبر! سُن، او بے سمجھ! سوچ۔ آ رہا ہے وہ وقت مگر ابھی آیا نہیں حُسن بے نقاب کو میری گلیوں کی ہوا راس نہیں۔ اپنی سیتاؤں کو کیسے نکالوں؟ میرے چپے چپے پر لنکا، قدم قدم پر راون۔ میرے چاند گرہن ہیں اچھے۔ میرے لعل گرد آلود بہتر۔ نہ سہی میرے گھر میں روشنی، میرے دل میں خوشی، میری بزم میں رونق کچھ نہ سہی۔ بلا سے۔ جنہیں تو دفینے کہتا ہے وہ میری جان ہیں۔ مرنے سے نہیں ڈرتا مگر جیتے جی مرا بھی نہیں جاتا۔

خندۂ تقدیر۔ ہا ہا ہا۔ ہا ہا ہا۔ کیا کہنے ان دونوں کے! کوئی سمجھے انہیں کے بس کی تو بات ہے! ہا ہا ہا۔ ہا ہا ہا۔

دِقتیں

نرم دل ہونا بھی کیا مصیبت ہے!

دن کے نو بج جاتے ہیں مگر بستر میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ کبھی کہتا ہے ایک انگڑائی تو اور لے لو! کبھی کہتا ہے "آخر جلدی کیا ہے؛ چاے بھی لیٹے لیٹے ہی نوش کیجیے۔ لیجیے اس ایک تکیہ کو بغل کے نیچے دوہرا کر کے رکھئے اور دوسرے کو زانو کے نیچے دبا لیجئے تا کہ پٹی کی سختی محسوس نہ ہو اور میز کی طرف جھک جایئے۔"

بے وجہ دل دُکھانا میرے مذہب میں کفر ہے۔ چنانچہ بستر کا کہا ماننا ہی پڑتا ہے۔ ایک دن جو چاے پیتے پیتے کچھ نیند سی آگئی تو کس فرطِ محبت سے سفید چادر میرے پاؤں سے لپٹی، جالی کی ایک خوبصورت بیل جو تکیہ کے غلاف پر بنی تھی وہ تو بالکل میرے گلے پر نثار ہو گئی۔ اس صدق نیاز سے مجبور نہ ہو جاؤں تو کیا کروں۔ ایک گھنٹہ روزانہ اُٹھتے اُٹھتے بستر کی نذر ہو ہی جاتا ہے۔ شکر ہے کہ گھر میں مجھ پر کوئی چیخنے والا نہیں۔

بستر سے رہائی ہوتی ہے تو غسلخانے کا سفید براق ٹب اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ایسا مچلتا ہے کہ کوئی بچہ کیا ضد کرے گا۔ دبی زبان سے گنگنائے جائے گا کہ ذرا اور۔ پانی کی حدت تو دیکھو اتنی گرم ہے تو تھوڑا سا ٹھنڈا ملا لو۔ ذرا اور، باہر کیوں نکلتی ہو ربڑ کے جھانویں سے یہیں جھک کر پاؤں اور پاؤں کی اُنگلیاں رگڑ کر صاف کر لو۔ ادراو ہو تمہیں یاد ہی نہیں رہا وہ خوشبو دار عرق تو ملا لو۔ اچھا پہلے پانی بدل لو، کہاں تک انسان انکار کرے۔ آخر ٹب ہی کا کہنا ہوتا ہے۔ اس شریر ٹب نے

بڑی ضد سے دو آئینے ایسی طرح مجھ سے غسلخانے میں لگوائے ہیں کہ نکلتے نکلتے بھی بول اُٹھتا ہے کہ کمر تو دیکھ لو۔ دیکھ تو لیتی ہوں مگر پھر بھاگتی ہوں۔ ٹب کے چونچلوں میں رہوں تو توشہ خانے کا قدِ آدم آئینہ جس کی صبح شام بیس منٹ کی روزانہ نوکری میرے ذمہ ہے وہ رُوٹھ جائے ،

توشہ خانے میں پہلے کنگھی اور برش اپنی مقررہ ورزش میرے بالوں سے کرتے ہیں۔ کنگھی تھکی تو بلدار برش اور وہ ہانپا تو نرم برش۔ بعض دفعہ تو کھڑی کھڑی تھک جاتی ہوں۔ میری نرم مخملیں گدے والی کرسی جھٹ خود بخود کھسک کر مجھے بٹھا لیتی ہے۔ اتنے میں میری گھنٹی کہتی ہے کہ لو اب تو ماما کو بلاؤ۔ اس گھنٹی کو بھی اپنی آواز پر ناز ہے۔ کمبخت نے ماما کو سکھا رکھا ہے کہ جب تک تین چار دفعہ نہ بلاؤں تم نہ آنا۔ مگر یہ بھی قرینِ قیاس نہیں کیونکہ ماما جب آتی ہے دوڑتی ہوئی آتی ہے اور ہمیشہ یہی کہتی ہے" بیوی چاء کے برتن باورچی خانے پہنچانے گئی تھی"۔ بہر حال مجھ سے یہ گھنٹی کئی کئی منٹ ٹائپ رائیٹری کراتی ہے۔ نرم دل ہونے پر یہ بھی ایک ٹیکس ہے۔

آئینہ کی نوکری ختم ہوئی تو ماما کی ملازمت کی گرانباری سر پر سوار ہوتی ہے۔ صبح کے وقت بال تو صرف خوبصورت فیتے میں جکڑے جاتے ہیں مگر جوڑا نکالنے میں غضب کی دیر ہوتی ہے۔ ماما کمبخت آپ تو بنی ٹھنی رہتی ہی ہے مجھے بھی اسی آفت میں ڈالتی ہے۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ جو دوپٹہ ہاتھ میں آئے لے کے چلتی بنوں مگر جنیا کی اماں نے خدا جانے اس کے پیدا ہونے کے دن لسوڑے کھائے تھے کہ چڑیل چمٹی جاتی ہے "قربان جاؤں یہ دوپٹہ نہ لو دوسرا لو۔ اس غرارے کے ساتھ وہی خوب رہے گا۔ لو۔ بُندے تو بیوی آپ بھول ہی گئیں اور انگوٹھیاں صرف دو ہی۔ نوج کوئی کیا کہیگا۔ اچھی قربان جاؤں یہ ہار تو ڈال لو۔ ہاں اور صاحب کے یہ پھول تو اٹکا لو"۔ ایسی ایسی باتیں کر کے مغز چاٹ جاتی ہے۔

کھٹ کھٹ۔ کھٹ کھٹ کیسی پیاری آہٹ ہے۔ جنیا اُن میرے تو اکثر کام بھول جاتی

ہے مگر صاحب نے جو اسے حکم دے رکھا ہے کہ جس وقت بیگم صاحب کپڑا پہن لیں ہمیں خبر دو، یہ حکم اسے نہیں بھولتا۔ چنانچہ ابھی جو وہ باہر نکلی تھی اس نے حسبِ معمول خبر کی ہوگی اور وہ آ رہے ہیں۔ آئی میرے بالوں کی شامت۔ کبھی اپنے گلے میں ڈالیں گے۔ کبھی اُنگلیوں میں لپیٹیں گے اور جو بہت مہربان ہوئے تو دو تین موٹی موٹی لٹوں کا پھندا بنا کر میرے ہاتھ ان میں باندھیں گے۔ یہ میری نرم دلی کی سزا ہے مگر کیا سب نرم دل لڑکیوں کے بال ایسے ہی چمکدار ہوتے ہیں؛ میں محض اُن کے ستانے کے لئے کبھی کبھی اپنے بالوں کے متعلق "کُل طویل احمق" کہہ دیتی ہوں مگر اس کی سزا بہت جابرانہ ہے "میرا تو بھوک کے مارے بُرا حال ہے" یہ سُنتے ہی میں بھاگنے کی کوشش کرتی ہوں کہ جاؤں اور جلدی سے خود ہی نعمت خانے سے ایک آدھ کھانے کی چیز اُٹھا لاؤں مگر میرے گھر کا سب کام مشین کی طرح چلتا ہے۔ صاحب کو کمرے سے نکلتا دیکھ کھانا میز پر آنا شروع ہو جاتا ہے۔ جتنی دیر میں وہ اپنی دسلئے کی رکابی میں دُودھ ڈالیں میں چار بنا کر پیش کرتی ہوں اور وہ کھانا کھاتے جاتے ہیں، اور باتیں بناتے جاتے ہیں۔ اکثر اس قسم کی باتیں ہوتی ہیں:۔

وہ۔ مُبارک ہو کہ آج پھر صرف دس منٹ کی دیر کھانے میں ہوئی ہے۔

میں۔ پندرہ منٹ کہتے شرم آتی ہے۔ تم جو خواہ مخواہ ان دیوانے بالوں سے اُلجھو تو کوئی کیا کرے؟

وہ۔ "خوب گزرے گی جو مِل بیٹھیں گے دیوانے دو" پر ہمارا عمل ہے۔ مگر دیر تو پہلے ہو چکی تھی۔ تم کیوں پونے گیارہ کی بجائے گیارہ بجے تیار ہوئیں؟

اس کا کیا جواب دوں؛ یہ میری نرم دلی کا قصور تھا۔ آئینہ نہ چھوڑے تو میں کیا کروں؟ بات بدلنے کے لئے گلدان میں سے پھول نکال کر

میں۔ یہ پھول تو دیکھو۔ کیسا خوبصورت ہے؟

وہ۔ صبح تو اس میں یہ تمکنت یہ غرور نہ تھا۔ تم پھولوں میں بھی رعنائی پیدا کر دیتی ہو۔ لاؤ اسے

بھی قید کریں۔

چنانچہ پھول (ہمارے کھانے کی میز گول ہے اور میں اُن کے سیدھے ہاتھ ان کے پاس ہی ہوتی ہوں) ان کی دست درازی کا ممنون ہوکر میرے بالوں میں اسیر کیا جاتا ہے۔ یہ تقریباً روزانہ کی رسم ہے۔

وہ۔ کہو آج کا کیا پروگرام ہے؟

میں۔ کچھ بھی نہیں۔ گھر کو دیکھوں گی۔ اس میں تین بج جائیں گے۔ پھر کپڑے بدلوں گی۔ پھر چائے! ذرا سیر کو چلیں گے۔ پھر کھانے کی تیاری ہوگی۔ مگر ہاں آپ چائے پر ذرا اس دقیانوسی سوٹ کو بدل ڈالیے جو ساڑھی مجھے چار پر پہننی ہے اس کے ساتھ وہ تمہارا افاختئی رنگ کا سوٹ ٹھیک رہے گا۔ اسے خدا کے لئے اب شکار کے واسطے رکھو۔ گھر کے لائق یہ نہیں۔

وہ۔ حکم حضور سے اطلاع پائی! کل کی پردہ کلب کا تو ماجرا سناؤ کس کس بیوی میں جھڑپ ہوئی؟

میں۔ سبحان اللہ یہ بھی کیا مردوں کا کلب ہے؟ جناب ایسی تمیز سے بیویاں بیٹھتی ہیں کہ باید و شاید بعض چپ کا روزہ رکھ کر آتی ہیں، چغد کی طرح اِدھر اُدھر دیکھ کر چلی جاتی ہیں مگر اکثر تو ایسی خوش مذاق ہیں کہ کیا کہیئے۔ ایک نے کل مجھ پر پھبتی کہی مگر بندی نے وہ حضور پر ٹال دی۔

وہ۔ کیا کیا؟

میں۔ یونہی چند بیویاں حقوقِ نسواں پر چہ میگوئیاں کر رہی تھیں کہ ایک نے میری طرف اشارہ کیا کہ اس فیشن کی پری سے تو پوچھو! بیشتر اس کے کہ میں کچھ کہوں درمیان ہی سے ایک گل بولیں "ارے یہ کیا حقوقِ نسواں کے لئے کوشش کریگی۔ شوہر کی غلام شوہر پرست دین کی نہ دُنیا کی"۔ اس فقرہ پر خوب ہنسی ہوئی۔ مجھے ابھی موقع نہ ملا تھا کہ کچھ کہوں کہ مس آڈ جیسے اپنی اُردو دانی پر بڑا گھمنڈ ہے پوچھنے لگی "بیگم صاحب! "شوہر پرست" کیا معنے؟" اس پر وہ فرمائشی قہقہہ لگا کہ کمرہ

گونج گیا۔ ابھی ہنسی تھمی نہ تھی کہ میں ہاتھ جوڑ کر دو زانوس کے سامنے ہوئی اور اُس سے کہنے لگی "ماڈ!
میرا میاں تو مجھ سے بوٹ صاف کراتا ہے۔ جھاڑو دلواتا ہے۔ وہ کھانا کھاتا ہے میں رومال
ہلاتی ہوں۔ جو اس سے بچے جب وہ جائے تب میں کھاتی ہوں۔ اس کے سامنے اس طرح ہاتھ
باندھے رہتی ہوں۔ اسے کہتے ہیں شوہر پرست ہونا۔" اس پر کچھ اور ہنسی ہوئی اور ماڈ ایک بڑھیا
میم سے کہنے لگی "اس بیگم کا میاں بہت ظالم آدمی ہے۔" وہ بڑھیا کہنے لگی "ماڈ تجھے یہ اُلّو بنا رہے
ہیں۔" ماڈ کی سمجھ میں جو ساری بات آئی تو سب کے سامنے کہتی ہے "اب ہم سمجھا۔ ہم اپنے دوست
صاحب لوگ سے بولے گا کہ ہم اس سے شادی کرے گا جو ہمارا بوٹ صاف کرے گا۔ ہم بولے گا
کہ پری بیگم کا صاحب بیگم کا بوٹ صاف کرتا ہے۔" کوئی تعجب نہیں جو ماڈ سچ مچ یہ کہہ دے
تمہارے انگریز دوست خوب تمہاری خبر لیں گے۔

وہ۔ "یونائی ڈارلنگ" اچھا اور کچھ بتاؤ۔

میں۔ اور تو کوئی ایسی قابلِ ذکر بات نہیں ہوئی۔ ہاں باہر گھاس پر کھڑے تھے کہ لیڈی ——
میرے پیچھے سے آن کر کہنے لگیں "ارے یہ بادل کا ٹکڑا اسرو قد کیوں کھڑا ہے۔" واقعی اس وقت
میری ساڑھی کا اور بادل کا رنگ ایک تھا اور میں اسی خیال سے اسے پہن کر گئی تھی۔ مڑ کر میں
نے کر جھک کر آداب کیا تو کہنے لگیں "بادل کے لئے جھکنا ہی مناسب ہے۔"

میں۔ اجازت ہو تو آپ کے لئے بھی ایک ایسا ہی بادل کا ٹکڑا ابھی آسمان سے اُتار لاؤں۔

لیڈی۔ ضرور۔

میں۔ آپ وعدہ کیجئے کہ ابھی پہن لیں گی؟

لیڈی۔ وعدہ ہم کبھی نہیں کرتے۔

تم جانتے ہو وہ بڑی بامذاق ہیں مگر ایک اور شامت کی ماری بول اُٹھی "میں وعدہ کرتی

ہوں ۔ تم لاؤ تو۔"

میں ۔ اچھا ابھی حاضر ہے ۔ آپ اپنی یہ سرمئی سی ساڑھی اُتاریئے ۔ جلدی کیجئے ۔

اس پر وہ ہنسی ہوئی کہ میدان گونج گیا ۔ وہ بیچاری بہت کھسیانی ہوئی ۔ لیڈی نے کہا "شریر! تم مجھ پر بھی یہی فقرہ کستیں"۔ میں نے کہا " توبہ توبہ میری مجال ہے "۔ بس اسی قسم کی باتیں ہوا کیں ۔ پھر ہم چلے آئے ۔

وہ ۔ تو تمہارا وقت تو خوب لُطف سے کٹا ۔

میں ۔ جی ہاں مگر بعض لوگوں کے لباس اور گفتگو سے تو ایسا جی کھٹا ہوتا ہے کہ کئی دفعہ دل میں آتا ہے کہ پھر انسان کسی پارٹی میں قدم نہ رکھے ۔ مجھے تو خیر زیادہ آنے جانے کی فرصت ہی نہیں ہوتی مگر اور بیویاں بھی بہت محسُوس کرتی ہیں ۔

وہ ۔ آہستہ آہستہ رنگ بدل جائے گا ۔

حاضری ختم ہونے پر وہ تو چل دیئے اور میں اُسی بات کی سوچ میں لگ گئی جس نے میری طبیعت کو کھٹا کیا تھا ۔ خود میں نے اپنے کانوں سے سُنا کہ میری نسبت ایک ساڑھی پوش ڈھول ایک شلوار پوش گنبد سے یوں ہمکلام تھا " یہ ۔ ارے یہ بڑی خود پرست ہے ۔ انگریزوں کے ہاں تو چلی بھی جائے دیسیوں کے ہاں جانا کسرِ شان سمجھتی ہے "۔ میری نسبت یہ بدگمانی محض میری نرم دلی کی وجہ سے ہے ۔ مجھ سے زندگی کے اولیں فرائض یعنی تاش کھیلنا ۔ تھیئٹر جانا ۔ باجا بجانا ۔ ناچ میں شریک ہونا ۔ ایک کوٹھی سے دوسری کوٹھی تیلیتری کی طرح گھومتے پھرنا واقعی ادا نہیں ہو سکتے مگر اس کی وجہ نہ میری کاہلی ہے نہ خود پرستی ۔ خود پرستی تو میں جانتی ہی نہیں کہ کیا ہے ۔ ایسی تہمت لگانے والوں پر بعض دفعہ ایسا سیدھا سادھا مسلمان غصہ آتا ہے کہ انسان ان کو خلافت فنڈ کی طرح غائب کر دے مگر انہوں نے منع کر رکھا ہے کہ غصہ سرے سے کرنا ہی نہیں چاہئے ۔ اُن کا قول

یہ ہے کہ جس طرح ایک آب دار ہیرے سے روشنی کی شعاعیں سب طرف ضَو فگن ہوتی ہیں اسی طرح انسان کے بشرے اور آنکھوں سے طمانیت اور خوشی کا نُور برسنا چاہیئے اور ان کا قول میرے لئے آیت احدیث بلکہ اس سے بڑھ کر ہے کیونکہ آیت حدیث تو پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آتی اور ان کی بات میرے صفحۂ دل پر نقش ہے۔ اس لئے میں ڈھول اور گنبد دونوں کو معاف کرتی ہوں۔ نہیں ابھی معاف نہیں کیا معاف کیا ہوتا تو ڈھول اور گنبد نہ کہتی۔ وہ میری بہن ہیں۔ میں جو اپنے بوٹ کا دِل بُرا کرنا نہیں چاہتی کس طرح اپنی بہنوں کو بے ادبی سے یاد کروں۔ یا اللہ مجھے معاف کر۔ میرے دل سے غصّہ دُور کر۔ ایسا کبھی نہ ہو کہ میری آنکھیں روہ آنکھیں جن کی بقول اُن کے تہ در تہ سیاہ شفاف گہرائیوں کی حلقہ در حلقہ رُوح افزا چمک سوستاروں کی کرنوں کو ٹھکراتی ہے، کبھی خشمگیں نگاہ سے آلودہ ہوں۔ یا اللہ تو ہی آئینے کے دل میں ڈال دے کہ وہ اِتنی دقّتیں میرے رستہ میں حائل نہ کرے۔ باقی گھر کو میں خود سمجھا لوں گی مگر وہ بھولا بھالا آئینہ میرے کہنے میں نہیں۔ بالکل میری طرح نرم دِل ہے۔ میں مُڑتی ہوں تو حیران سا رہ جاتا ہے۔ اُسے اپنی دِقّتیں ہیں ۔

---

۲۷ - ۲۸ سال کا ذکر ہے لاہور کی جماعتِ طلبہ کے چند افراد حالی مرحوم کے مندرجۂ ذیل شعر کو بہت جھوم جھوم کر پڑھا کرتے تھے

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

دن ہی ایسے تھے۔ پنجاب پر اُردو شعر و سخن کے دوسرے حملے کا زور تھا۔ پہلا حملہ تو مولانا آزاد مرحوم کی سپہ سالاری میں ہوا۔ یہ دوسرا وہ تھا جو مولانا نذیر احمد مرحوم کی سالانہ یورشوں کا نتیجہ تھا۔ انگریزوں نے سکھوں سے سلطنت چھین کر یہاں اپنا تسلّط جمایا تھا۔ دِلّی والوں نے سلطنت گنوا کر پنجاب کے مسلمانوں کی زبان پر اپنا سکّہ چلایا۔ بچارا پنجاب! خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔

وہ چند افراد جن کے نوجوان تخیل کے لئے حالی مرحوم کا شعر ایک اٹل قانونِ قدرت کا مرقع تھا افکارِ معیشت کے تھپیڑوں سے منتشر ہیں۔ زندگی کی طغیانیوں نے ان دو چار کو ایک ناؤ میں ہم سفر نہ ہونے دیا پر نہ ہونے دیا۔ ان میں سے ایک کچھ بڑھ گیا تھا مگر تبرِ حسد کا نشانہ بنا، اب پھر اُبھرنے کو ہے اور شہرت کا نقیب منتظر ہے کہ اس کے حق میں خطبۂ اکابری کا اعلان کرے۔ ایک ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ نیک گمنام ہے، عقلمند وہ نہیں، دولتمند وہ نہیں، ہے تو کیا؛ صرف دردمند، اور آہ کیسا دردمند! اس دولت سے کس قدر مالا مال۔ راقمِ سطور اگر اپنی نسبت "کمتر ز ہیچ کہم" کہے تو وہ بھی تعلّی ہوگی ڈبک ڈبک کر رہا ہے مگر زمانہ ہے کہ حالی کے دریا کی طرح بے پروا ہے۔

آخر یہ سب کیوں رہ گئے؟ جوشِ خدمت کی طغیانیاں ان کے دلوں میں بھی تھیں اب بھی ہیں مگر کبھی تھے، واللہ اعلم معاملہ ہے۔ کیا یہ دو قصور کہ انہوں نے چندہ بڑا کوئی نہیں کیا اور مصنوعی نماز کبھی دراز نہیں کی ان کو صفِ نعلین میں کھڑا کرنے کے لئے کافی نہیں؟ یا ایک اور قصور جو ہمایوں میں خاص طور پر قابلِ تذکرہ ہے ناقابلِ معافی ہے یعنی یہ کہ یہ جسٹس محمد شاہدین مرحوم سے علی قدر مراتب دعوائے نیازمندی رکھتے تھے اور بے ریا خودداری، قدرے سخت گیر خشک زہد، نڈر آزادی کے فیشن (مرحوم کا خاص فیشن) میں کسی حد تک یہ بھی رنگے ہوئے تھے۔ کوئی بھی وجہ ہو جو کچھ ہوا ٹھیک ہوا۔ خدائی طغیانیوں کے آگے ناخدائی ہیچ ہے۔

تدبیر کا انجنیئر لاکھ نہریں بناتا پھرے مگر خدا کے دریاؤں میں خدا کا پانی اپنے رستے چلتا ہے اور چلے گا، کبھی سمٹ کر، کبھی پھیل کر اور کبھی سیلاب قہر بن کر۔ صرف زمین پر بہنے والا پانی نہیں، وہ تو صرف چشمِ ظاہر بیں کے لئے مظفر گڈھ کو پانی پت بناتا ہے، بلکہ وہ بحر الحیات کا پانی جس کے بلبلے شخصی تقدیریں ہیں ۔

———— ✤ ———— ✤ ———— ✤ ————

گنوار کی دُعا

اِس مُلک کے ایک طبقہ میں شرافت وتہذیب کی جلوہ نمائی اس شان سے ہوتی ہے کہ میٹھی نگاہوں میں لپٹے ہوئے پیار کے الفاظ اربابِ نشاط کی خدمت میں اُلٹے سیدھے بازاری فقرے سُننے کے لئے پیش کئے جائیں مگر گھروں میں قہر آلود لفظوں سے بیویوں سے ہمکلامی کی مہم فتح کی جائے۔ چونکہ ماضی پرست نہیں ہوں اِس لئے اِس تہذیب کی گہرائیوں کو بزرگوں کی دُور اندیشی کی طرف منسوب کرنے سے عاجز ہوں۔ چونکہ مولوی نہیں ہوں اس لئے صلواتیں سنانے کے شیوہ کو بھی اپنے سے بالاتر پاتا ہوں۔ چونکہ نیم اَن پڑھ اُجڈ ہوں نہ کبھی "آیئے! آ آ آ . . . . بیٹھیے تو سہی!! کیوں کیسی کہی؟" والی مجلسوں میں شریک ہوا، نہ کبھی گھر سے نکلنے کی جلدی میں اپنی نیک بخت کو زبانی تیر و تفنگ سے مجروح کیا۔ گنوار کی بات اُلٹی۔

چند دن کا ذکر ہے کہ ایک رئیس ابن رئیس کے کمرے میں میرے ایک دوست جنہیں عرصے سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا نظر پڑے۔ ہم دونوں شوق سے ملے اور ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کرنے لگے۔ بچوّں کی بابت پوچھا۔ اُنہوں نے مجھ سے اِن سے مَیں نے۔ پھر بیگم صاحبان کا ذکر آیا۔ پھر چند اور احباب کا اور اتفاق سے پھر بیگم صاحبان کا۔ اس پر وہ رئیس ابن رئیس بہت بھڑکے، ایک ہمنشیں سے فرمانے لگے عجب بیہودہ لوگ ہیں۔ بیویوں کے ذکر کے سوا اور کوئی بات نہیں! اگر کسی بی اچھّن کا ذکر ہوتا تو وہ بھی کس شوق سے شریک ہوتے۔ اپنے عمر بھر کے تجربے سے ہمیں محظوظ کرتے، ایک اچھّن کیا وہ سو کے قصے سُناتے۔ مگر گنواری گفتگو سے ان کے شیشۂ دل

کو جو ٹھیس لگی اس کا اندازہ مشکل ہے۔ اپنی غلطی کو شدت سے محسوس کیا۔ ان لوگوں کے سامنے جو مر جائیں مگر اپنی بیوی کا ذکر نہ کریں یہ کہہ دینا کہ الحمدللہ میری اہلیہ خیریت سے ہیں کس قدر گنوارپن ہے۔

اس معاملہ کے متعلق بیویوں کی رائے کبھی معلوم نہ ہو سکی۔ اگر ان کا یہ خیال ہے کہ شکر ہے کہ طبقۂ اناث میں کم از کم ایک گروہ تو ایسا ہے جو مردوں کو کھلے بندوں نیچا دکھاتا ہے۔ انہی کے روپیہ کی جُوتی سے ان کی کھوپری سہلاتا ہے، ذلیل لفظوں کے دام سے آبرو کو خاک میں ملاتا ہے تو خیر لیکن اگر وہ اپنے آپ کو بے بس سمجھ کر خاموش ہیں تو خدا حافظ۔ اس صُورت میں اگر میں گنوار ہوں تو وہ ڈبل گنوار۔

اے دعا! تو آگ بن کر جا! آسمان پر نہیں بلکہ اسی زمین پر ان گھروں میں جہاں وہ مظلوم مقید ہیں۔ جن کا گھر بند، منہ بند، ذکر بند۔ ان کے دلوں سے آزادی کی خواہش کا شعلہ بن کر لپٹ اور ان کی روحوں میں یہ فقرہ جلا دے "نیکی آزادی کی باندی ہے"

لغات الجاہلین
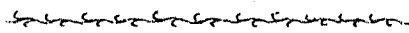
لڑکی ۔ ہندوستانی گھروں کا ایک پالتو جانور جسے پالنے والے عارضی نمود کی خاطر وقتاً فوقتاً ذبح کرتے ہیں ۔ ذبح ہونے پر اس جانور کی نسل بڑھتی ہے ۔

لڑکا ۔ ہندو گھر میں نجات کا تعویذ، مسلمان گھر میں اُدھم کا پٹاخہ، مدرسے کی بنچوں کا گلدکار، سیاسی انجمنوں کا آنے والا خطرہ ۔

اِنسان ۔ کام کاج کی وہ مشین جس کے صاف رہنے اور بے شور چلنے کے لئے خوشی کے نایاب تیل کی اشد ضرورت ہے ۔

زندگی ۔ بیل جس سے تقدیر کا کسان ہل چلواتا ہے، مرنے پیچھے اس بیل کے چمڑے کی بہت مانگ ہوتی ہے ۔ اسے تاریخ کہتے ہیں ۔

آرزو ۔ ایشیا میں ذلّت کا پہلا زینہ، یورپ میں کبھی کلیدِ نجات اور کبھی سفوفِ ہلاکت ۔

کمالِ تہذیب ۔ ہوٹل کا بِل ادا کئے بغیر بلکہ مالکِ ہوٹل سے اس کی حیثیت کے مطابق کچھ قرض لے کر کھُلم کھُلا رخصت ہونا ۔

عقل ۔ اندھی کُتیا جسے ماہر شکاری ہونے کا دعوےٰ ہو ۔

اعتقاد ۔ بہرے کی بے موقع جی ہاں، اور اُس سے زیادہ بے موقع نہیں، ہرگز نہیں ۔

قلم ۔ جھوٹ کی طویل مال گاڑی کا نہ بگڑنے والا طاقتور انجن ۔

"ع جہالت"

اور دیتیں

ماڈ چڑیل نے کچھ ایسے وقت مجھے پری بیگم کہا کہ اب اس نام سے چھٹکارا ہی نہیں ہوتا۔ اگلے دن تو سچ مچ ایک ناواقف بیوی سے اسی لقب سے میرا تعارف کرایا گیا۔ پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہوں وہ فرماتی ہیں کیا پیارا نام ہے مگر ایک لفظ غیر ضروری ہے۔

میں۔ کونسا لفظ؟

ناواقف بیوی۔ یہی لفظ "بیگم" ﷲ تم کہیں پری ہونے سے انکار نہ کرنا۔ میری تو بڑی آرزو آئی ہے۔ پریوں کے قصے سنا کرتے تھے۔ الحمدللہ کہ اپنی آنکھوں سے کم از کم ایک کو تو دیکھ لیا۔

میں۔ بنایئے خوب بنایئے مگر مجھے انکار بھی نہیں۔ کم از کم ایک کے لئے تو میں ضرور پری، حورا بلکہ ان سے بھی بڑھ کر ہوں۔ سو وہ آپ بھی ضرور ہونگی۔ آخری جملہ جو میں نے ذرا شرارت کے لہجے میں کہا تو وہ بیوی کچھ شرمائیں۔ پھر کیا تھا میرے ارد گرد ٹھٹھ تو رہتا ہی ہے لڑکیوں نے لتے لے ڈالے۔

ایک۔ بہن شرمانا تو آج کل کا فیشن نہیں یہ تمہیں وہ کیا کہتے ہیں؟ "آسمان پری، کہ سبز پری"؟

دوسری۔ توبہ توبہ کرو۔ آسمان پری کی ان کے سامنے کیا حقیقت ہے۔

تیسری۔ اجی ان کے میاں بڑے شاعر ہیں۔ وہ تو کہتے ہونگے کہ پریاں تم سے شرماتی ہیں۔

یہ ناواقف بیوی بڑی سمجھدار اور بامذاق ثابت ہوئیں پہلے تو شرماتی تھیں، مگر یہ گرما گرم فقرے سن کر بھولا سا منہ بنا کر مجھ سے کہتی ہیں، اب تو مجھے پورا یقین ہو گیا ہے کہ تم اصلی پری ہو کیونکہ

یہ کھتنیاں تمہارے ساتھ ہیں۔ اس پر ہم سب خوب ہنسے اور اس ایک چٹکلے سے وہ بیوی ہمارے حلقے میں داخل ہو گئیں۔ آئندہ دو تین ہفتوں کے پروگرام میں انہیں شامل کر لیا گیا۔ کیونکہ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ گاتی خوب ہیں۔ میری فرمایش پر بے تکلف کچھ گنگنا بھی دیا۔ سب نے خوب داد دی مگر وہ مجھے مخاطب کر کے کہتی ہیں کہ تمہارے سامنے گانا ناممکن ہے۔

میں۔ کیوں؟ میں کیا صیاد ہوں کہ بلبل سہم جائے؟

وہ۔ نہیں یہ بات نہیں بلکہ یہ بات ہے کہ آنکھ کے مقابل کان کی کچھ حقیقت نہیں۔ تمہارا چلنا پھرنا ہی راگ ہے بلکہ راگ کی جان ہے۔ سورج کے سامنے موم کی بتی کیا جلے گی۔

میں۔ سنو بہن جس مرض میں تم مبتلا ہو۔ وہ ان سب کھتنیوں کو باری باری لاحق ہو چکا ہے۔ دو دو دن یہ سب شروع شروع میں مجھ پر عاشق رہ چکی ہیں۔ سو دو دن کی تمہیں بھی اجازت ہے۔ اس کے بعد تمہیں سہیلی بننا پڑے گا۔ نہیں بنو گی تو زبردستی بنائی جاؤ گی جیسے ناٹک میں زبردستی حکیم بنائے جاتے ہیں۔ اور میری اس صف عشاق پے وفا سے ایک ہی شرط ہوتی ہے اور وہ یہ کہ کبھی بھول کر بھی کوئی میری سہیلی نہ خیال میں نہ قول میں اپنے آپ کو کسی امر میں مجھ سے کم نہ سمجھے۔ میں صنف نازک کی مہاتما ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ مردوں کے مہاتما تو مردوں کو زنانہ کام سکھاتے ہیں، میں چرخہ کاتنے والیوں کو خودداری کے زرہ بکتر سے آراستہ کرنا چاہتی ہوں۔ جسے تم مجھ میں حسن تصوّر کرتی ہو وہ میری نظروں میں محض ایک ذمہ داری ہے۔ سنو تمہاری الفت میں تمہیں سمجھاتی ہوں کہ میرا حسن قطعی طور پر ضائع جائے گا۔ اگر مجھے اپنے مشن میں کامیابی نہ ہوئی۔ میری زندگی کی بھاری دقتوں میں سے ایک یہ ہے۔

ناواقف بیوی۔ (خاص مستانہ ادا سے) بیرحم پری۔ دو دن تو مجھے اپنے نشے کا لطف اُٹھانے دے۔ پہلے دن ہی وعظ کی ترشی!

مَیں۔ متوالی گوئیں کچھ سناؤ۔

وہ۔ ضرور گاؤں گی کیونکہ تمہارے لفظوں نے میرے دل کے کانوں کو اسیر کیا ہے:

حسن دیتا ہے خدا ظالم کو

یہ مصرعہ اس نے اس گداز سے ادا کیا کہ خود کچھ آبدیدہ ہوتی نظر آئی۔ میں نے جلدی سے اُٹھ کر اسے پیار کیا اور جہاں اور بیویاں تھیں وہاں لے گئی۔ شکر ہے کہ وہ ایک آدھ منٹ میں ہی سنبھل گئی ورنہ بڑی مشکل ہوتی۔ پھر بھی جو جہاندیدہ تھیں وہ بھانپ گئیں مگر لیڈی۔۔ کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ اوروں نے تو چپکے سے میرے کان میں کہا "تمہارا تازہ شکار ہے نا؟" مگر لیڈی۔ سب کو چھوڑ کر بڑے لطف سے اس بچاری کے پاس آ بیٹھیں اور اِدھر اُدھر کی باتوں سے اسے ایسا لبھایا کہ وہ ہشاش بشاش سب سے گفتگو میں مشغول ہو گئی۔ لیڈی۔۔۔ کو کہیں جانے کی جلدی تھی مگر چلتے چلتے بھی یہ سرگوشی کر گئیں:۔

"ہم کیا ڈاکٹر ہیں کہ تمہارے زخمیوں کی مرہم پٹی کیا کریں؟"

مَیں۔ آپ کی مہربانی۔

وہ تو چل دیں اور میں یہ سوچنے لگی کہ کیا لمبی گردن اسی لئے ہوتی ہے کہ ایک کے عشق کا بوجھ اُٹھائے۔ تو دوسرے کے احسان کا؟ گھر چل کر اپنے آئینے سے پوچھوں گی:

———•———ﷺ———ﷺ———ﷺ———•———

تسلّیاں
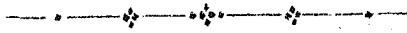
اولادِ آدم میں رسائنس کے مصدقہ شجرۂ نسب کو اگر بالائے طاق ہی رہنے دیا جائے) اپنے آپ کو خود ساختہ دلاسے فی البدیہہ تسلّیاں دینے کی جو جبلّی عادت ہے اس کا میں ہزار جان سے عاشق ہوں۔ مذہبی تعلیم، سیاسی ضرورت، مستقبل کی بہبودی اخوت سکھلانے سے عاجز ہیں مگر یہ اپنے آپ کو خود دانستہ جھانسے دے جانے کی خاندانی ادا بات بات میں ثابت کرتی ہے کہ کالے، گورے، گندمی، زیتونی سب سگے بہن بھائی ہیں۔

وہ خفتہ بخت جسے شکل، عقل، زر، زور کا کچھ بھی حصّہ عطا نہیں ہوا اپنے جیسے دوسروں کو مفصلہ ذیل قسم کا وعظ کر کے اپنی پیٹھ بائیں ہاتھ سے ٹھونکتا ہے۔

بے نصیب کا وعظ

لوگ تم پر ہنستے ہیں کہ تمہاری قطع بھونڈی، تقریر پھسڈی، تمہارا لباس میلا، پیٹ خالی ہے؟ ہنسنے دو!

تم جہاں بیٹھنا چاہتے ہو وہاں جب بیٹھے ہوتے ہیں وہ اُٹھ جاتے ہیں اور آنے والے سو بہانے سے دوسری جگہ کو ترجیح دیتے ہیں؟ کیا ہوا!

تمہارا جائز سوال ہمیشہ رد ہوتا ہے درحالیکہ اوروں کو بن مانگے موتی ملتے ہیں؟ ایسا ہونے دو، دل شکستہ نہ بنو!

تم خدمت کرنا چاہتے ہو مگر تمہاری خدمت قبول نہیں ہوتی؟ انسانی کشش جہت سے یہی

صدا آتی ہے کہ تمہاری ضرورت نہیں؛ تم سے گریز ہے، عار ہے، نفرت ہے؛

سُنو! اُس پہ غلطی کرنے والی ہستی کو جس نے تمہیں پیدا کیا تمہاری ضرورت ہے، تم سے محبت ہے، تمہارے بغیر اُس کی دُنیا ادھوری رہ جاتی! جس نے ریت کا ایک ذرہ بھی فضول نہیں بنایا کیا اُس پر تم یہ تہمت لگانے کی جرأت کرتے ہو کہ اُس نے ایک انسان یونہی غیر ضروری طور پر دُنیا میں پھینک دیا؛ اسے بھولے بھالے! جا! خوب اکڑ کر چل کیونکہ

وہ

تمہیں چاہتا ہے"

فرشِ مخمل کو بے پروائی سے روندنے والے اور روند کر تھک جانے والے زندگی کی کلفتوں سے تنگ آ کر مسندِ زرنگار پر بیٹھے بیٹھے جام بلوریں کی گردش کے دَوران میں اپنے ہم چشموں سے یوں بصد شان مخاطب ہوتے ہیں۔

کامگاروں کی تقریر

"ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ باوجود ہماری ہزار کوششوں کے اس ملک میں تعلیم کی، تجارت کی اصنعت کی مجموعی حالت ایسی نہیں جسے قابلِ فخر قرار دیا جائے۔ عوام النّاس کو ہماری سرتوڑ کوششوں کا ایک گونہ اعتراف ضرور ہے مگر حقیقی اعتراف اس وقت ہوگا جب وہ ہماری کم از کم ایک امر میں پوری تقلید کریں یعنی فرقۂ جہلا میں بھی پیدائش کی باقاعدہ تنظیم ہو۔ اگر وہ لوگ موجودہ روش کے مطابق بیدھڑک سال بہ سال بچے پیدا کرتے جائیں گے تو ممکن نہیں کہ تعلیم اور وسائلِ معاش میں وہ ربط پیدا ہو جس کی ہمیں تمنّا ہے۔ علاوہ ازیں سہل کاری کا مرض جو جماعت کاریگراں میں بڑھتا جارہا ہے۔ قومی بہبودی کے لئے مہلک ہے۔ گذشتہ سال ہمیں صرف پچاس لاکھ پونڈ کا خالص منافع ہؤا حالانکہ اگر سہل کاری نہ ہوتی، تو

یقیناً اس سے دُگنی بچت ہوتی اور ہم ہسپتالوں اور کتب خانوں میں بہت زیادہ امداد کرسکتے ۔ ان پریشانیوں کے باوجود بھی ہم نے پچھلے سال سے بیس ہزار پونڈ رفاہ عام کے کاموں میں زیادہ دیا ہے اس سے ہماری گھڑ دوڑ کی دلچسپیوں میں ضرور کچھ کمی ہوئی مگر خدا کے فضل سے ہمیں توقع ہے کہ ملکی معاملات ضرور رُو بہ اصلاح ہوں گے اور ہم آئندہ سال آمد و خرچ کا جائز تناسب قائم کرسکیں گے محنت و تدبر ہماری جماعت کی میراث ہیں اور ہم پوری تندہی سے لگے ہوئے ہیں۔ خدا اس سے زیادہ توقع نہیں کرسکتا کہ ہر انسان اپنے فرض کو ادا کرے۔"

مسجدوں، مندروں اگرجاؤں کے مکین سر بہ زمین ہمہ تن التجا بن کر یوں مصروف ہیں:۔
"اے ہمت دینے والے ہمیں ہمت دے کہ وہ جو تجھے بُھلا چکے ہیں، ہمارے کہنے سے پھر تیرے حلقہ بگوش ہوں ۔ اے ناتوانوں کو شہ زور کرنے والے ہمیں ندامت کی مصیبت سے بچا ۔ ہم خجل ہیں کہ گو تیری منادی ہمارا فرض ہے مگر یہ فرض ہم سے پورا ادا نہیں ہوتا، ہمیں اُبھار۔ اے دعاؤں کے سُننے والے ہمیں خلوص دے اور اس میں قائم رکھ۔ دُنیا تاریک ہے کہ دل تاریک ہیں ۔ اے دِلوں کے مالک ان میں اُجالا کر دے۔"

اپنے آپ کو دوسروں سے برتر تصور کرکے مطمئن ہو جانے کی عادت کبھی وعظ کا کبھی تقریر کا کبھی دُعا کا برقع پہن کر جلوہ نمائی کرتی ہے مگر ادا شناس کہہ دیتا ہے ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش　　من اندازِ قدت را می شناسم

(ختم شد مگر مکرر یہ کہ اپنے آپ کو ادا شناس تصور کر لینا بھی وہی جبلی حماقت ہے۔)

میاں رحموں

حکماء فرماتے ہیں کہ کسی کا دولتمند ہونا خود اس کے لئے اور نیز قوم کے لئے بڑا بھاری بوجھ ہے بعض تو سرے سے دولت مند خاندان میں پیدا ہونے کے ہی مخالف ہیں اور اسے بدقسمتی خیال کرتے ہیں۔

اطبا کی دُرفشانی یہ ہے کہ بے خوابی، سوہضمی و پھول قسم بیسیوں دیگر جسمانی سمیات کے لئے صرف غربت ہی تریاق ہے۔

صُلحا کی نصائح کا لُبّ لباب بھی یہی ہے کہ جتنی دیر میں اہل دُول اپنی شاندار قبروں کے نیچے سے بمشکل جنبش کر سکیں گے اتنی دیر میں مانگے تانگے کے کفن والے جنّت میں داخل ہو کر حوروں سے پاؤں دبواتے ہوں گے۔

گویا خوش قسمتی، صحت اور اخروی فلاح کا زیادہ تر دارومدار ناداری پر ہے۔ ایک شخص نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اللہ میاں کو غریب مسکین بہت ہی پسند ہوں گے جو اس قدر سال بہ سال ان کو پیدا کرتا رہتا ہے۔

آمنّا وصدّقنا۔ ہر چند شک آرد کافر گردد مگر پھر بھی یہ عقدہ حل نہیں ہوتا کہ اللہ جل شانہٗ کی یہ بے غایت عنایات میاں رحموں بہشتی پر کیوں وفور ہیں؟ کیوں وہ اس قدر خوش قسمت ہیں کہ باپ کے قرضے میں اپنی کمائی، نانی کا گھر، گھر والی کا زیور سب کچھ دے کر بھی مدیون ہیں اور کیوں ان کے لئے صحت کا بہترین استعمال یہی ہو کہ سردی کے موسم میں اذان سے پہلے جو مشک ڈھونی شروع

کریں تو شام کے سات بجے تک کمر نہ کھولیں ؛ اور کیوں ان کا مالی اقتدار اِس زور پہ ہو کہ میونسپل کمیٹی سے تیس دن کے دو وقتہ چھڑکاؤ کے لئے تین روپیہ انہیں گھروں سے پانی کی مجموعی اُجرت بیس روپیہ اور جب قحط نہ ہو تو چند مزید سُوکھی روٹیاں ان کے لئے کافی تصوّر ہوں ؛

حِلم کا ان کے یہ حال ہے کہ کوئی کچھ ہی کہہ لے کیا مجال کہ میاں رحموں ماتھے پہ بل لائیں۔ سُنتے ہیں کہ صرف ایک دفعہ جوانی میں انہیں غصّہ آ گیا تھا۔ محلے میں ایک صاحب نے ناحق ان کے خردسال بچے کے تھپّڑ رسید کیا محض اتفاق سے میاں رحموں اچانک اس جگہ آ نکلے اور گو ان کے کندھے پر بھری مشک تھی انہوں نے مارنے والے کو ایک ہی خالی ہاتھ سے مروڑ کے دھر دیا۔ میاں رحموں کی خوش قسمتی نے اس موقع پر بھی ان سے منہ نہ موڑا۔ پولیس معززین کی پوری محافظ نکلی اور تھانیدار نے شارع عام میں دنگے کا مقدمہ کھڑا کر دکھایا۔ پانچ پولیس، پانچ وکیل، پانچ عدالت کل پندرہ روپلے کے سر آئی۔ وہ سالانہ چھ چھ کر کے (تین اصل تین سود) میاں رحموں نے پانچ سال میں ادا کئے مگر اس دن سے آج تک پھر بچارے نے باوجود صدہا آزمائشوں کے مزاج کو برہم ہونے نہ دیا۔ ان کے محلے میں جو ممبر چونگی ہیں ان کے نوکروں کی دو وقتہ ڈانٹ ڈپٹ حضرت ایوبؑ بھی مشکل سے برداشت کرتے مگر میاں رحموں ہیں کہ جُھکے جاتے ہیں، سرکار سرکار کے سوا بات نہیں کرتے۔ پندرہ دُنے تیس روپیہ کا سبق انہیں ایسا ملا کہ پھر عمر بھر ہر قسم کا ظلم برداشت کیا مگر انتقام یا انصاف کا خیال تک دل میں نہ آنے دیا جسمانی مشقت ہی اتنی سخت تھی کہ بھوک کے سوا کسی اور خیال کا آنا تقریبًا ناممکن تھا۔ جب ان کی بکری ایک بے پروا موٹر کے نیچے دب کر مر گئی تو بچارے پورے چھ ماہ تک روکھی چنے کی روٹی پر کنبہ پالتے رہے۔ غنیمت تھا کہ موٹر والوں نے ہرجانے کا دعوےٰ نہ کیا۔ اور بہت سے واقعات ان کی زندگی کے اس امر کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں کہ حکماء اطباء اور صلحاء کے نقطۂ خیال سے میاں رحموں کی زندگی خوش قسمتی اور اُخروی فلاح

کا بے مثل مجسمہ تھی ؂

میاں رحموں پر ہی کیا موقوف ہے لاکھوں اس قسم کی اور مثالیں ہیں بلکہ اگر مبالغہ نہ سمجھا جائے تو میاں رحموں کا دوسرا نام ہندوستان ہے اور جہاں تک تدبّر کو کام میں لایا جائے کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ کیوں ملکوں میں ہندوستان کو سب سے زیادہ خوش قسمت خیال نہ کیا جائے۔ خدا جانے آج کل کے وطن پرست برادران کی عقل پر کیا پردہ پڑ گیا ہے کہ وہ آئے دن بجائے اس کے کہ شکریہ کے جشن رچائیں خواہ مخواہ کی بدظنی اور بے چینی پھیلانے میں مصروف ہیں۔ ان لوگوں کا کبھی یہ رونا ہے کہ فوج زیادہ ہے اور کبھی یہ دُکھڑا ہے کہ سول میں تنخواہ زیادہ ہے۔ کبھی انہیں یہ بچار ہے کہ بدیسی تجارت کی ڈائن یہاں کی ننھی کھڈیوں کا کلیجہ نکال رہی ہے یہ سب باتیں غلط ہیں۔ شاندار ملک ہے اس لئے فوج زیادہ ہے۔ اور کونسا ملک ہے جہاں ایسے جلیل القدر راجہ نواب ہیں؛ اگر فوج تھوڑی ہو تو ان کی سلامی اور پیشوائی میں فرق آ جائے ؂

اصل بات صرف اتنی ہے کہ قانون دان تقریر باز خیال کر لیتے ہیں کہ ملک میں وہی وہ ہیں حالانکہ ایسے ایسے مہاراجہ بھی ہیں جن کا ہوٹل میں سو کمروں بغیر گزارہ نہیں ہو سکتا ؂

فوج پر اعتراض بالکل لغو ہے۔ باقی رہی سول والوں کی تنخواہ! مگر امیر مزاج ملک ہے اس لئے ملازموں کو منہ مانگی تنخواہ دیتا ہے۔ یک بیک اس قدر سفلہ پن کہاں سے آ جائے کہ انکار کر دے اور پرانے آزمودہ کار خدمتگذاروں سے منہ موڑ لے۔ اب رہی دیسی بدیسی تجارت کی چپقلش۔ بھلا میاں رحموں جیسے آن والے سے یہ کب ممکن ہے کہ جن دکانوں سے پرانی ساکھ ہے وہاں سے سودا نہ لے۔ ارے بھائی جس باوضع نے ہیضے، ملیریا، طاعون کو ناں نہ کہی وہ ململ، لٹھے، نین سکھ کو کیا دھتکار دے ؂

اصل بات یہ ہے کہ سیاسیات کے لٹھ باز خواہ مخواہ میاں رحموں کی تذلیل کے درپے ہیں۔ بیہودہ بیج پکار مچا رکھی ہے کہ غریب ہے مفلس ہے ان پڑھ ہے۔ میاں رحموں کو کیا ضرورت کہ مسٹر متھن بن جائے۔ ان اللہ والوں کو دھن دولت کے جنجال سے کیا نسبت ہو۔ اس لئے اپنی تو یہی صدا ہے "رام بھلی کرے گا"

خُدائی

ایک دھیمی مگر تمام طاقتِ گویائی سلب کر لینے والی آواز نے مجھے یوں مخاطب کیا :-

آواز :- "شریر! تمہاری دریدہ دہنی محض شوخی کی حد سے گزر گئی۔ تم نے ازراہِ تفنّن نہیں بلکہ عین متانت میں یہ فقرہ استعمال کیا" اگر میں خدا ہوتا تو ایسا نہ ہوتا" چلو۔ خدائی کر کے دیکھ لو۔"

اس آواز سے انحراف ناممکن تھا چنانچہ چل پڑا۔ ہوا، شور، روشنی، جسم سب یکے بعد دیگرے پیچھے رہتے گئے۔ صرف وہ چیز جسے "میں" کہہ کر نامزد کیا جاتا ہے آگے بڑھی۔ تنہائی اس "میں" کی سخت دشمن ہے۔ جب "تُو" نہ ہو تو "میں" کی پیش نہیں چلتی۔ جس نقارے کو بجا بجا کر یہ اپنا غلغلہ قائم رکھتی تھی وہ نقارہ غائب تھا۔ پھر بھی یہ بلا کی سخت جان ہے۔ بیرونی احساس کا دروازہ بند ہُوا تو اس چالاک نے یاد کی مشعل جلا کر محشرِ خیال میں دُہل زنی کی۔ آخر سرمد والے" لا اِلٰہ" کے نفی کے ٹیکے سے اس "میں" کی اندرونی خیالی دُنیا کا تدارک کیا گیا۔ کچھ نہ تھا۔ "میں" کی بجائے "ہے" (بمعنی ہستا) رہ گیا۔

خُدائی کی مگر بے لطف۔ ہرن بنا کھیلا کُودا۔ شیر بن کر کچھار میں گونجا۔ شیر نے ہرن کھا لیا۔ نہ شکار کا لُطف نہ خوف کی تکلیف۔ بیکس بیوہ کا جوان بیٹا بن کر مر گیا اور اُس کے آنسو کی صُورت میں چمکا۔ نہ رنج نہ رحم۔

محبت کا ارگن سُنایا۔ بیوفائی کی مُرلی بجائی۔ نہ سُر نہ تان۔

حاکم کے دل میں محکوم کی عزت بن کر بیٹھا۔ محکوم کے دل میں بغاوت کا جوش بن کر چمکا۔ نہ شکر نہ غصہ ۔

ستاروں کی مٹھیاں بھر بھر کر پھینکیں۔ کبھی انہیں پیسا، کبھی جلایا، کبھی آباد کیا کبھی برباد۔ نہ شوق نہ دریغ۔ جہالت جہالت نہ رہی علم علم کے پایہ سے گر گیا۔ خدائی کیا ہے۔ خواری ہے۔

آواز۔ (وہی پہلی آواز مگر انتہائے رحم سے) "کر لی خدائی۔ جاؤ!"

مَیں۔ "غلط کار ندامت شعار انسان ہونا ہی میرے لئے موزوں ہے۔ معافی چاہتا ہوں۔"

آواز۔ "جاؤ۔"

چونک کر اُٹھا۔ صبح ہو چکی تھی۔ استغفار کیا، چار رکعت کی بلا جس طرح سے ہوا سر سے ٹالی اور کاروبار میں لگ گیا۔ جوں جوں دن بڑھتا گیا پھر وہی خیال قائم ہوتا گیا کہ خواب کی باتیں خواب کے ساتھ ہیں لیکن

"اگر میں خدا ہوتا تو ایسا نہ ہوتا"

———— ••• ———— ••❁•• ———— ••• ————

چشمِ بد دُور

فیشن میں رفعت یورپ کی غاصبانِ پرستش سے دس قدم آگے ہی ہے اور اسی لئے اس کے بالوں میں جرمن فلسفے کی پیچیدگیوں کی بجائے موجودہ پیرس کا اختصار ہے۔ طرفہ تر یہ امر ہے کہ گو میری طرح اسے بھی ابھی یورپ کی ہوا نہیں لگی مگر اسے ساڑھی، شلوار اور غرارے سے عار ہے، نظرِ عنایت صرف فراکوں پر ہے اور فراک بھی ایسے جو رعبِ حسن سے سمٹ کر بصد ادب نشاپہ زانو ہوں، آج کل کے رواج کے مطابق جب کہ فیشن مذہب ہے اور مذہب صرف ایک فیشن رفعت گویا مذہبی رنگ کی پوری نمائندہ ہے مگر باوجود اس کی اس قدر ثقاہت کے یہ کہنے کی جرأت کی جاسکتی ہے کہ اگر 'کفر' کے معنی 'انکار' کے ہیں تو رفعت دنیا بھر میں چوٹی کی کافر ہے اور بلا مبالغہ اپنے جیسی کفار ہستیوں میں اس کا مرتبہ وہی ہے جو پہاڑوں میں ہمالہ کا کیونکہ معمولی کافر تو خدا سے یا زر سے منکر ہوتے ہیں مگر یہ شریر علاوہ ان کفروں کے خود اپنے حسن سے بھی منکر ہے۔ اکثر تو دھوکا ہو جاتا ہے کہ اسے پتہ ہی نہیں کہ حسن کس جانور کا نام ہے کیونکہ کئی موقعوں پر حسینوں کی موجودگی میں مجھ جیسی مجسم غلطی سے آلپٹی ہے۔ صرف حسن ہی تک اس کا انکار محدود نہیں بلکہ تہذیب کی کئی اور شاخوں سے بھی قطعی باغی ہے، سواری کا ان کا ڈھنگ دیکھئے۔ عام طور پر سواری کے لئے دُنیا بن ٹھن کر نکلتی ہے مگر رفعت کو جب سواری مدِ نظر ہو تو اہتمام سے عمدہ فراک پھینکا جاتا ہے اور گھوڑا بضد وہاں بھگایا جاتا ہے جہاں کیچڑ یا جھوبل ہو۔ اسی طرح توقع یہ ہوتی ہے کہ کم از کم کھانے کے موقع پر تو رفعت شعارِ مجلس کو نہ روندے گی مگر بارہا یہ ہوتا ہے کہ دیر سے آئیں اور نہایت بے پروائی

سے کھائے پیئے بغیر انگڑائیاں لیتی ہوئی چل دیں، اور نو اور اگلے دن کا قصہ ہے کہ ایک آنریبل کے۔سی۔ایس۔آئی محبت سے رفعت کو مخاطب کرنے لگے مگر وہ کچھ ایسی بے پروائی کے نشہ میں تھی کہ آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔اس کافرِ مطلق کی اور باتیں بھی قابلِ تذکرہ ہیں مگر ان کے بیان کے لئے پھولوں سے زیادہ خوشرنگ الفاظ کی ضرورت ہے کیونکہ رفعت خود ابھی پھول ہے۔

رفعت کی عمر صرف تین سال ہے، وہ دن آئے گا کہ بسم اللہ کو بھی بھلا کہہ کر وہ فطری اور ازلی اسلام سے مُنہ موڑ کر رسمی اسلام کے حلقے میں داخل ہو جائے گی اور پھر وہ دن آئیں گے کہ معلومات کے چمکدار آئینہ میں یہ منعمہ اس پُر از نعمت دنیا کے خوشنما رنگ دیکھے گی اور آئے دن اس کے لئے گلہائے مسرت کھلیں گے۔کوئی بھی تعجب نہیں کہ وہ ایک معجز بیان شاعرہ بن کر ایوانِ شہرت میں صدر نشین بنے مگر کوئی آئندہ نظم اُس کی اُس نظم کی برابری نہ کر سکے گی جو اس کے ہلکے ہلکے پاؤں کے پیارے پیارے بوجھ سے (جب وہ میرے کندھوں پر جمناسٹک کرتی ہے) میرے دل میں تحریر ہوتی ہے۔

چشمِ بد دُور!

دلِ ناداں تجھے ہؤا کیا ہے؟

مرزا غالب کی ایک مشہور غزل کے سوالوں کا حل شاید ناظرین ہمایوں کو اور چند سوالوں کے انکشاف میں مدد دے۔

سوال۔ دلِ ناداں تجھے ہؤا کیا ہے۔ آخر اس درد کی دوا کیا ہے۔

جواب۔ ہؤا ہے خبط اور دوا ہے کام۔

سوال۔ سبزہ وگُل کہاں سے آئے ہیں۔ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے۔

جواب۔ یہیں سے ہیولیٰ، مٹی، کوئلہ اور روشنی چُوس کر سبز رنگ اختیار کرتا ہے اپھول اس کی بے حیائی کا اشتہار ہیں۔ سورج کی گرمی اور سمندر کی خنکی کے دوامی ازدواج کی آوارہ گرد اولاد کا نام ابر ہے اور ہوا چند مفید چند زہریلی گیسوں کا پریشاں سا مجموعہ ہے۔ باوجود ہلکی ہونے کے اپنے بوجھ میں دبی مری جاتی ہے، دراصل نہ کہیں آسکتی ہے نہ جاسکتی ہے یونہی تھر تھر کانپتی ہے۔

سوال۔ یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟

جواب۔ ڈاکٹر کا نشتر صاف بتا دیتا ہے کہ نہیں جیسے ان کے خون کے اجزا ہیں، رگوں میں، ریشوں میں، ہڈیوں کی ساخت اور نشست میں باقی لوگوں سے سرِ مو فرق نہیں اور ہو بھی کس طرح جب سب اولادِ بوزنہ ہیں۔

سوال۔ ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار۔ یا الٰہی یہ ماجرا ہے۔

یہ بہت ٹیڑھا سوال ہے۔ مرزا مرحوم ولی تو ضرور تھے۔ خود کہہ گئے ہیں۔ دیکھیو غالب سے گر الجھا کوئی ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا تو کیا اس پوشیدہ ولی کا اشارہ آج کل کی سیاسی کشمکشوں کی

طرف تھا؛ بالکل ممکن ہے کہ پیر و مرشد نے یہ سوال انگلستان کی طرف سے ہندوستان کو مخاطب کر کے کیا ہو۔ اگر یہ قیاس صحیح ہو تو ممکن ہے کہ درست جواب صرف ایک لفظ ہو یعنی "جیب"۔

صاف ظاہر ہے کہ مرحوم نے زیادہ تر سوال اپنے زمانے کے حسب حال کئے۔ تو کیا آج کل کے شاعروں کا یہ فرض نہیں کہ وہ بھی ترجمانِ حالاتِ حاضرہ ہو کر آنے والی پود کے لئے کچھ سوال چھوڑ جائیں؛ اگلے سوال سب حل ہو چکے کیونکہ دلِ ناداں کا زمانہ گیا۔ اب تو ہر نوجوان مسلمان چاہے وہ خود قطعی مہمل ہو اپنا حق سمجھتا ہے کہ اسے زردار، نازبردار حسین بیوی ملے۔ مگر آخر دلِ نادان کا قائم مقام آج کل کیا ہے؟ نمونے کے طور پر اور فرض پورا کرنے کے لئے غالب والی زمین میں چند سوال عرض ہیں۔ ممکن ہے پچاس سال بعد جواب مل جائیں۔

زرِ مسلم تجھے ہوا کیا ہے؛ گمرہی کی تری ادا کیا ہے؛
گھر سے عازم تھا تو سمرنا کا بمبئی میں یہ گھومنا کیا ہے؛
کھا گئی کب مشین آرے کی مثلِ منصور کٹ گیا کیا ہے؛
کانپور کیا حجاز و کعبہ کیا بھولا سب کا ہی راستہ کیا ہے؛
ہیرے زیور کہاں سے آئے ہیں قوم کیا چیز ہے خدا کیا ہے؛

خادم القوم سے حساب طلب
تو نہیں جانتا وفا کیا ہے؛

معترضہ جملے

۱۵ر جولائی۔

وہ خدائے قدیر جس کے حکم بغیر پتّا نہیں ہلتا مگر بجلی کا پنکھا چلتا ہے (لاحول ولا۔ کیا الحاد کا کلمہ میرے قلم سے نکلا! اصل بات یہ ہے کہ جب ساتھ والی اونچی کوٹھی کی خس کی ٹٹیوں کا، وہاں کی مقطر دو آتشہ میں مُبرف سوڈے کا صبح شام کی چہل پہل اور روزانہ "غالب شاہی" عید کا خیال آتا ہے تو جی جل جاتا ہے اور سوچتا ہوں کہ کیا میرے ہی گھر پر اللہ میاں کا زور چلتا ہے کہ پہروں گزر جائیں اور پتّا نہ ہلے۔ بچے ہیں کہ گرمی دانوں سے بلبلا رہے ہیں، بیوی چولہا پھونکتے پھونکتے ڈارون کی تھیوری کا زندہ ثبوت بن گئی ہے، خود پسینے میں ڈوبا جاتا ہوں مگر اللہ صاحب کی کلکٹری میں غریب کی شنوائی نہیں، خیر، نئے سرے سے مضمون شروع کرتا ہوں)

وہ رزاقِ ازلی جس کے ادنےٰ اشارے سے سمندر کی تہ میں پتھر کے کیڑے کو مقررہ قوت لایموت برابر ملتی ہے اور جس کی مرضی سے چیونٹیاں میری کھانڈ اور چوہے میری روٹی کا سرقہ کرتے ہیں (استغفراللہ پھر وہی بات، ذاتِ باری اور چوروں کی اعانت! اصل بات یہ ہے کہ کل جو اس کوٹھی میں جا نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ چار کی میز سے تین چار قند دار کیک کے ٹکڑے وہاں کے کتوں کی نذر ہوئے اور خانساماں نے مکھن لگے ہوئے ٹوسٹ مہتر کو معمولی دریا دلی سے دے دیئے حیران ہوا کہ اس جگہ چیونٹیوں اور چوہوں کی الٰہی فوج کیوں حملہ آور نہیں ہوتی؟ تھوڑی دیر بعد سمجھ میں آگیا کہ فرش پکے ہیں اللہ صاحب کی سفر مینا پلٹن کی انجنیری ان کے آگے عاجز ہے مگر یہ عقدہ پھر بھی حل نہ ہوا کہ کوٹھی میں تو صرف مہتر کا درجہ کتوں

سے ذرا کم رہا مگر میرے گھر میں چوہے پہلے اور میں پیچھے! خیر اس الجھن سے کیا فائدہ! مضمون پھر شروع کرتا ہوں)

وہ حافظِ حقیقی جس کو آسمانوں کی منور کتاب از بر ہے مگر جسے بلئے کی بہی کے اندھیر کا کچھ پتہ نہیں (معاذاللہ پھر وہی دہریہ پن! اصل بات یہ ہے کہ یہ اونچی کوٹھی ایک مشہور بہی کا ایک ورق ہے کسی زمانے میں ایک نواب صاحب نے پانسو کا رقعہ لکھا تھا وہ کسی وجہ سے پانچ ہزار درج ہوا اور پھر بڑھتے بڑھتے یہ کوٹھی اور ایک گاؤں ہضم کر گیا۔ اللہ صاحب کی بہی میں کچھ اسی قسم کی ڈگریاں ہوتی ہیں مگر مجھے اس سے کیا؟ میں تو ایک چشم پارسا کی فرمائش کی تعمیل میں مضمون لکھنے بیٹھا تھا۔ انہوں نے چلتے چلتے خیال ظاہر کیا تھا کہ مسلمان خواتین کے ایک بہترین نمونہ کا نقشہ باندھا جائے۔ کہاں ایک بہترین مسلم بیوی کا حسنِ کامل کہاں یہ میرا بیساختہ نیم سجّت کفر! پھر شروع کروں)

وہ مسبّب الاسباب جس نے اپنی حکمتِ کاملہ سے مگرمچھوں کی خاطر سمندروں کو بے شمار کمزور و ناتواں مچھلیوں سے بھر دیا ہے جس کے لازوال خزانوں میں سے ہر بلّی کو کبھی نہ کبھی کبوتر اور ہر سانپ کو کہیں نہ کہیں مینڈک میسر ہو جاتا ہے مگر جس کے ہاں میرے لئے صرف مکھیوں اور مچھروں کی پلٹنیں ہیں اور وہ بھی میرے کھانے کے لئے نہیں بلکہ مجھے کھانے کے لئے . . . . . (پھر وہی دریدہ دہنی! اصل بات یہ ہے کہ جب ہر شام کو فرمانبردار ملازم اس اونچی کوٹھی کے وسیع صحن میں شبنمیوں اور مسہریوں کی قطار کھڑی کرتے ہیں اور پائنتی کی طرف بجلی کے پنکھوں کی لین لگاتے ہیں تو میں حسرت سے کہتا ہوں کہ اللہ اللہ وہاں مچھر بھوکے مریں گے مگر میرا خون آ کر چوس لیں گے۔ مگر یہ تو روز ہی ہوتا ہے، مجھے جلدی سے اپنا مضمون شروع کرنا چاہئے)

وہ احکم الحاکمین جس نے صاحبِ ضلع کے اوپر لاٹ اور لاٹ کے اوپر بادشاہ اور بادشاہ کے اوپر اپنے آپ کو اور اپنے اوپر ہمارے پٹواری کو حکمران مقرر کیا ہے (لعنت بر کارِ شیطان! پھر

وہی پیلے تکاپن ! اصل بات یہ ہے کہ اونچی کوٹھی والے مجھ سے ساتھ والی دو گز زمین قیمتہً مانگتے تھے اور قیمت بھی اچھی دیتے تھے مگر میں نے انکار کیا ۔ جب خرید کے متعلق وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے تو انہوں نے پٹواری کے ذریعہ سے حد بندی کرا کے وہ زمین اپنے احاطہ میں مفت شامل کرا لی ۔ فنانشل تک مقدمہ کیا، اجمیر شریف سے خاک لا کر اس زمین پر چھائی، داتا گنج بخش سے پانی لا کر چھڑکا، ختم قرآن اس موقع پر کرایا مگر نہ فنانشل نہ ولی نہ کلام پاک، غرضیکہ کوئی بھی اس پٹواری کے "کن فیکون" کے آگے دم نہ مار سکا۔ مگر یہ سب کچھ تو ہو چکا مجھے مضمون شروع کرنا چاہیئے)

حمیدہ ۔ ابا! آداب، آپ کیا لکھ رہے ہیں؟

میں ۔ کچھ نہیں!

حمیدہ ۔ میں دیکھوں؟

(بغیر میری اجازت کے حمیدہ پڑھنا شروع کر دیتی ہے اور جوں جوں پڑھتی جاتی ہے ناک بھوں چڑھاتی جاتی ہے)

حمیدہ ۔ (ختم کر کے) ابا آپ کا خط روز بروز بدتر ہوتا چلا جا رہا ہے ۔ ہمیں تو اس قدر آپ کہتے ہیں خود کیوں صاف صاف نہیں لکھتے ؛ اور یہ مضمون تو کچھ اچھا نہیں ۔

میں ۔ اچھا کہ بُرا تم اب جاؤ مجھے لکھنے دو ۔

حمیدہ ۔ اچھے ابا! خفا نہ ہوجیئے یہ بتایئے کہ وہ کون بیوی ہیں جنہوں نے بہترین مسلمان خاتون کا تذکرہ آپ سے طلب کیا ؟

میں ۔ حمیدہ وقت ضائع نہ کرو مجھے کام کرنے دو ۔

حمیدہ ۔ (یہ میری وہ ۱۶ سالہ نعمت ہے جس کا عشر عشیر بھی اس اونچی کوٹھی کو میسر نہیں اور جس کے

ہوتے باوجود غربت کے یہ دُنیا میرے لئے ہزاروں جنتوں سے بڑھ کر ہے کیونکہ حمیدہ کی شرارت
کے مقابلے میں جنّت کی ثقاہت لاکھ دفعہ قربان ہے۔ ابّا! بھلا آپ اور مجھ سے غصّہ! بتائیے وہ
بیوی کون ہیں؟

مَیں۔ کیوں پوچھتی ہو؟

حمیدہ۔ ضرور کوئی مولوی بیوی ہوگی کیونکہ آج کل ذرا ان کا زور ہے؟

مَیں۔ یہ تو بڑی بودی دلیل ہے۔ کیا کوئی آزاد منش بیوی یہ خیال نہیں کرسکتی کہ معلوم تو کریں کہ مولویوں
کی نظر میں بہترین مُسلم بیوی کے خیالات کیا ہونے چاہئیں؟

حمیدہ۔ یہ اچھی رہی! خیالات پر کسی کا کیا بس ہے۔ سوال تو عادات کا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ جس بیوی
کو آزادی کی ہوا چھو بھی گئی ہے وہ یقیناً جانتی ہے کہ جو بیوی دل سے مسلم ہو وہی بہترین ہے اس
لئے وہ کبھی ایسا سوال نہ کرے گی۔ وہ خود سوچ لے گی کہ مختلف بہترین ہستیوں میں اتنا فرق ضرور
ہوگا کہ مختلف حالات میں ان کا باطنی حُسن الگ الگ صورتوں میں ظاہر ہوگا۔ اماں ہی بہترین مسلم
بیوی کا اچھا خاصا نمونہ ہیں میں نے کسی پارٹی میں کسی بیوی کے چہرہ پر وہ اطمینان اور مسرت کی
جھلک نہیں دیکھی جو امّاں کے چہرے پر اس وقت ہوتی ہے جب وہ رشیدہ کا مُنہ دھلواتے وقت
خود کلمہ پڑھتی ہیں اور رشیدہ تتلا تتلا کر "محمد رسول اللہ" کہتی ہے۔ اس قدر بشاشت تو کسی انگریز
مس کے چہرے پر بھی دیکھنے میں نہیں آتی۔ تب بھی نہیں دیکھی جب مس بلینک ہارتے ہارتے
ٹینس کا سٹ جیت گئیں۔

مَیں۔ کسی ایک وقت بشاش ہونے سے انسان بہترین انسان تھوڑا ہی بن سکتا ہے۔

حمیدہ۔ ابا آپ تو غضب کرتے ہیں۔ تو کیا انسان محلوں میں رہنے سے بہترین انسان بن جاتا ہے؟
یہ تو دل کی بات ہے۔ میرے خیال میں تو جو شخص، چاہے اس کے حالات کیسے ہی ہوں، اپنی

طرف سے پوری کوشش کرے کہ وہ مفید ثابت ہو (نتیجہ چاہے اس کے موافق ہو کہ مخالف) وہ بہترین انسان ہے۔

میں۔ کہتی تو ٹھیک ہو۔

حمیدہ۔ آپ تو ہمیشہ کہتے ہیں کہ میں بے عقل ہوں۔

میں۔ کب؛ کب؛

حمیدہ۔ نہیں کبھی نہیں۔ یونہی آپ سے اپنی تعریف سننے کو جی چاہتا تھا۔ لیجئے اب جاتی ہوں ننھے کو روٹی کھلا دوں۔

حمیدہ گئی تو میں نے اس کی اور اپنی اوپر والی گفتگو قلمبند کر لی جس قدر غور کرتا ہوں یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ بہترین زندگی کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی کہ مفید ہونے کی پوری کوشش کی جائے۔ مگر مانے گا کون؛ حمیدہ کی فطرتی راستی کی روشنی نے کس آسانی سے اور کس صفائی سے میرے پراگندہ تخیل کی تاریکی کو دُور کیا ہے مگر حیرت بل نے مضمون برباد کر دیا۔ میرے پیش نظر وہ خارجی اسباب تھے جن سے انسان ہم جنسوں کی نگاہوں میں ممتاز نظر آتا ہے۔ اس گڑیا نے ایک ذرا سے جملے سے یعنی یہ کہ دل کی بات ہے، اسے مسئلہ نفسیات کر دیا۔ پھر شروع کرتا ہوں۔

وہ نورانی موتیوں کا ہار جس کا نام زندگی ہے اور جس کے پرکھنے والے جوہری خدا اب ایشیا میں پیدا نہیں کرتا کیونکہ یہاں کے لوگوں کو مرنے اور مرنے کے قصوں سے نہ فرصت ہوگی نہ وہ زندگی کا خیال کریں گے (خدا کو چھوڑ کر اب ایشیا کا پیچھا میں نے کیا! مجھے کچھ ہو تو نہیں گیا؛ اصل بات یہ ہے کہ ایک نامتناہی تواتر سے تنگ آ گیا ہوں۔ یہاں سوائے اس کے اور کچھ کام ہی نہیں کہ فلاں جگہ بچہ

ہؤا عقیقے کی دعوت ہے، دوسری جگہ شادی کے متعلق ولیمہ کی دعوت ہے اور تیسری جگہ مرگ کے متعلق چالیسویں کی دعوت ہے۔ پیدائش، بیاہ، موت، اور ساتھ ساتھ روگ سوگ کچھ ایسا تانتا بندھا ہے کہ کسی کو اور کسی کام کے لئے فرصت ہی نہیں مگر مجھے اِس سے کیا؛ میں تھوڑا ہی اس سفید کالے کمبل کا جلاہا ہوں کہ خواہ مخواہ شرماؤں۔ پھر شروع کرتا ہوں)

وہ خاتم سلیمانی جس کا نام کامیابی ہے اور جو سلطان صلاح الدین کے بعد مُسلمانوں سے گُم ہوئی اور سمندر میں سے یورپین اقوام کے ہاتھ ایسی آئی کہ اب کبھی نہ نکلے گی رہشت۔ یہ میں کیا لکھ گیا؛ میں کہاں کا ولی ہوں کہ پیشین گوئی کروں اور جو مجھے پیشینگوئی ہی کرنی تھی تو اشتہار کے ذریعہ کرتا کہ زید بجر سے پہلے مرے گا یا عمر کے ہاں لڑکا ہوگا یا زلزلہ آئے گا یا طاعون پھیلے گا۔ جب میری کامیابی سے صورت آشنائی تک بھی نہیں تو اس کے متعلق اس قدر وثوق کس قدر لغو ہے؛ اور کیا پتا ہے کہ کامیابی یورپ سے امریکہ ہوتے ہوئے جاپان جا نکلے اور پھر وہاں سے چین کا چکر لگاتی ہوئی واپس لوٹ جائے؛ اصل بات یہ ہے کہ کبھی کبھی تو اخبار میں نہیں پڑھا کہ میرے نام دس لاکھ کی لاٹری نکلی ہے۔ جب دیکھو یہی ہوتا ہے کہ مسٹر ڈیم فول کو دس ہزار پونڈ آنے مس گلاب کے پھول کو بیس ہزار پونڈ دستیاب ہوئے۔ مسٹر گرگ کو اس کے چچا دس لاکھ پونڈ چھوڑ گئے۔ بوڑھیا مس بھیڑا اپنے کُتّے کے لئے ہزار پونڈ چھوڑ گئیں۔ مسٹر نچھر انداز نے دو کروڑ ہسپتال کی نذر کئے۔ کاش میں ہسپتال ہی ہوتا!)

بیگم۔ اوہو! آپ تو مضمون نگاری کی دُھن میں ہیں! دیکھوں کیا لکھا ہے (بغیر اجازت پڑھنا شروع کر دیتی ہیں اور مُسکراتی جاتی ہیں)

مَیں۔ کیوں کیا راستے ہے؛

بیگم۔ یہ تو میں نہیں کہتی کہ محض لفاظی ہے از زندگی کے دو پہلوؤں کی اچھی تصویر ہے مگر حمیدہ والی تعریف جس کے آپ اس قدر مداح معلوم ہوتے ہیں وہ تو غلط ہے۔

مَیں۔ (عالمانہ غرور کے ساتھ) ہرگز نہیں۔ ایسی صحیح تعریف تو کبھی سننے میں نہیں آئی شاید کسی وقت گفتگو میں مَیں نے وہ فقرہ استعمال کیا ہوگا اور حمیدہ کو یاد رہ گیا۔ میری مینا کا حافظہ بہت اچھا ہے۔

بیگم۔ آپ کا فقرہ ہو کہ حمیدہ کا تعریف قطعاً غلط ہے، کم از کم اسلامی نقطہ خیال سے۔

مَیں۔ تو تم ذرا اسلامی تعریف بیان کر دو۔

بیگم۔ صرف ایک جملہ ایزاد کرنے کی ضرورت ہے۔

مَیں۔ وہ کیا؟

بیگم۔ جو شخص چاہے اس کے حالات کیسے ہی ہوں اپنی طرف سے ہر حال میں خالص خدا کی خوشی کے لئے پوری کوشش کرے کہ وہ مفید ثابت ہو اور نتیجہ سے مطلقاً بے نیاز ہو وہ بہترین مسلمان ہے۔

مَیں۔ خدا کی خوشی کا کیا معیار ہے؟

بیگم۔ سبحان اللہ! کیا سوال ہے؟ خدا کی خوشی وہ ہے جس میں مخلوق کی بہتری ہو۔ بیماری نہ ہو مفلسی نہ ہو، خوب عیش و عشرت ہو مگر حتی الوسع سب کے لئے مساوی ہو۔ اور خدا کی خوشی کیا ہے؟

مَیں۔ اور نماز روزہ؟

بیگم۔ مجھ سے جو پوچھتے ہو تمہیں بتاؤ کہ نماز روزہ آخر کیا ہیں؟

مَیں۔ عبادت۔

بیگم۔ اور بچوں کو اچھی طرح پالنا۔ صاف رہنا۔ ان کی، گھر والوں کی، ہمسایوں کی خدمت کر کے خوش رہنا یہ کیا ہیں؟ کیا یہ عبادت نہیں؟

مَیں ۔ عبادت تو ہیں۔

بیگم ۔ پھر کیا ۔ جس کو نماز روزہ میں خوشی ہو وہ کرے جس کو اور کسی قسم کی عبادت میں خوشی ہو وہ وہ کرے ۔ مجبور کرنے کا یا جو ایک خاص قسم کی عبادت نہ کرے اسے مُتہم کرنے کا کسی کو کیا حق ہے ؟ شرط تو صرف یہ ہے کہ نیت یہ ہو کہ مقصود خالص خدا کی خوشی ہے ؛

مَیں ۔ تم تو معتزلہ ہو ۔

بیگم ۔ معتزلہ وُعتزلہ تو میں جانتی نہیں مگر بات ٹھیک کہتی ہوں ۔ اسلام رسوم کا نام تھوڑا ہی ہے صرف ایک قلبی کیفیت ہے ۔ غیر مسلموں کو دُنیا کے دُکھ درد بےچین بناتے ہیں اور ان کے پاس کوئی کلید ایسی نہیں جس سے وہ اس زندان سے نکل سکیں ۔ زندگی ایک تازیانہ ہے جو بار بار انہیں مجروح کرتا ہے ۔ اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ زندگی کو بجائے تازیانہ کے سواری کا گھوڑا سمجھو ۔ خوب اس سے کام لو ۔ اگر اتفاق یہ آپڑا ہے کہ تمہارا گھوڑا گھوڑ دوڑ والا نہیں بلکہ ٹانگے والا ہے تو اس سے ملُول نہ ہو ، جن کے پاس گھوڑ دَوڑ کے اسپ تازی ہیں ان کی طرف بہ نگاہ حسد نہ دیکھو ۔ قلبی کیفیت یہ رکھو کہ ہمارے لئے سوال یہ نہیں کہ ہمیں مجروح یا بد رنگ یا پست قامت گھوڑا کیوں ملا بلکہ سوال صرف یہ ہے کہ کچھ اچھے سے اچھا کام ہم اسی سے لے سکیں وہ پوری کوشش سے لیں ۔ تم مرد تو صرف نام کے مُسلمان ہو ۔ اصل میں زر و جاہ کے حریص ہو تبھی تو یہ ساتھ والی اونچی کوٹھی ہر وقت تمہیں کھٹکتی ہے میں تو روز ان کے لئے بھی دعا کرتی ہوں کہ خدا انہیں بہت دے اور وہ خوش رہیں ۔

میں ۔ تو کیا تم دُعا کی قائل ہو ؟

بیگم ۔ کیا جہالت کا سوال ہے !

میں ۔ کیوں ؛

بیگم ۔ دُعا میں اس لئے تھوڑی مانگتی ہوں کہ اللہ کبھی میرے کہنے سے مجبور ہو جائے گا ۔ صرف اس

لئے مانگتی ہوں کہ مجھے یقین ہے کہ مخلوق کی بہتری اسی میں ہے کہ ہم ایک دوسرے کا بھلا چاہیں اور یہی خدا کی خوشی ہے۔ بلا سے دُعا کا اثر ہو کہ نہ ہو۔ میرا اپنا دل تو زنگ آلود نہیں ہوتا"۔

میں :- "واللہ باللہ اگر کوئی مولوی تمہاری منطق سُن لے تو ابھی ڈبل کُفر کا فتویٰ تم پر عائد ہو جائے"۔

بیگم :- "خیر مگر میں تو ان مولوی صاحب کے لئے بھی دُعا ہی کروں گی مگر ساتھ ہی یہ بھی دُعا کروں گی کہ یا اللہ اب ترکی کی طرح ہندوستان میں بھی کوئی ایسی تدبیر ہو کہ مولویوں کے وعظ اُسی طرح زیرِ لائسنس ہوں جس طرح مسکرات کی فروخت"۔

میں :- "بیچارے مولوی! وہ دیانت داری سے اپنا فرض ادا کرتے ہیں اور قوم ہے کہ صلواتیں سُناتی ہے ذرا اپنے گریبان میں تو مُنہ ڈال کر دیکھو کہ تمہارے قول و فعل میں کس قدر فرق ہے۔ تم بنتی تو پردہ کی مخالف ہو مگر خود کس قدر سخت پردہ کرتی ہو، اسلام کو قلبی کیفیت بتاتی ہو مگر بچوں کو نماز کی تاکید"۔

بیگم :- " اس میں قول و فعل کے فرق کی کیا بات ہے۔ کیا فیشن کے لئے آدمی کچھ نہیں کرتا؟ فی الحال مروّجہ فیشن یہی ہے جو میرا ہے اکم از کم میری جماعت کا۔ مگر پھر تم نے مجھے بحث میں گھسیٹا۔ اسلام میں کم از کم میرے اسلام میں بحث منع ہے کیونکہ بحث ایک لغو فعل ہے اور ہر مومن کو لغو سے پرہیز ہے۔ لو اب کھانے کے لئے آؤ۔ تمہارے لئے بہت اچھی سی کچوریاں تلوں گی"۔

بیگم تو چل دیں مگر میں نے اُن کی گفتگو بھی لکھ لی۔ سوچتا ہوں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ بہت حد تک ان کی منطق بھی درست ہے تو کیا میرے گھر کی صحیح مردم شماری یہ ہے کہ دو بہترین مسلمان خاتونیں اور ایک جہالت کا پُتلا مرد؟

اور کیا اکثر مسلمان گھروں کے اعداد اسی کے لگ بھگ ہیں؛ کوئی تعجب نہیں جو یہ درست نکلے۔

اُردو

مہمان کو، بالخصوص ایسے مہمان کو جسے معلوم ہو کہ میزبان نے اپنا مطلب نکالنے کے لئے مجبور ہو کر اسے مدعو کیا ہے جس کی اجنبیت چھپائے نہ چھپے اور بھلائے نہ بھولے جس کی خو او نشست برخاست میزبان کے گھرانے سے بالکل الگ ہو۔ کس قدر مصیبت کا سامنا ہوتا ہے؛ دل میں سوچتا ہے کہ کہاں آگیا اور کیوں آگیا؛ رہوں کہ جاؤں؛ پرایا گھر قید خانے سے کم نہیں۔ ایک طرف مہمان کا یہ حال ہوتا ہے تو دوسری طرف میزبان کے خویش واقربا فطرتی تقاضے سے مجبور چہ میگوئیوں سے باز نہیں رہ سکتے۔ کوئی "کلٌ طویلٌ" کا فقرہ چست کرتا ہے تو کوئی ان کی آواز سے کانوں میں اُنگلیاں دیتا ہے۔ کوئی دبی زبان سے کوئی علانیہ "جی ہاں ان کا رہنا ہو چکا۔ تم دیکھ لینا جو دو چار دن میں نہ بھاگ نکلیں۔ اونٹ، بھیڑ بکری میں کیا رہے گا؟" یہ سب کچھ کہا جاتا ہے محسوس کیا جاتا ہے مگر ضروریات زندگی وہ بلائے بے درماں ہیں کہ متعدد مثالوں میں یگانگی پیدا کر ہی دیتی ہیں۔

اس پُر لطف دو طرفہ کشمکش کا ڈراما رائج الوقت اُردو میں دلفریب منظر پیش کر رہا ہے۔ مولینا "علےٰ ہٰذا القیاس" تو کسی نہ کسی طرح ہندی الوطن ہو گئے مگر مستمیان "علےٰ رؤس الاشہاد" اور "علی الرغم" ابھی تک یہاں کے گلی کوچوں سے پورے آشنا نہیں ہوئے، اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ لوگ جو "عین" "قاف" کے بھاری ڈول حلق کے گہرے کنویں سے کھینچنے میں مشّاق ہیں یہ کیا ان سے منوں بوجھل جُملے قومی جلسوں میں تڑاق پڑاق بولتے چلے جاتے ہیں اور ان کی تحریروں میں تو "نظریہ" "مطمح نظر" "نصب العین" "فاجعہ" "مدیر" وغیرہ وغیرہ کے وہ جال تنتے ہیں کہ زبان کی بکیس چڑیا پھڑ پھڑاتی رہ جاتی ہے مگر ذکر ان لوگوں کا ہے نہ ان کے ان پڑھ نقالوں کا نہ

صرف عرب یا مصر کے مہمانوں کا۔ انگریزی ہی کو دیکھئے۔ کس قدر عجیب ہے کہ "ڈیل" جیسا موٹا بھینسا تو بن بلائے دنار ناتا ہوا آگھسے مگر مس "تھیوری" جیسی پری کو ادب کے نقیب ہر دفعہ دور باش سنائیں، کارخانوں کے "انجن" اور "انجنیئر" کی تو آؤ بھگت ہو مگر یونیورسٹی سے "آئی ڈیل" اور آئی ڈیلیسٹ کو ہر دفعہ اطلاعی کارڈ بھیجنا پڑے۔ اسی "سٹر" کارڈ" کی ہر دلعزیزی ملاحظہ کیجیئے۔ جو کارڈ نہیں کہہ سکتے وہ "کارڈ" "رڈ" پر زور دے کر کہتے ہیں مگر کہتے ضرور ہیں۔ اس سارے معاملے کی تہ میں جو خفیف سا راز ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ عوام الناس تو صرف پابند سلاست ہیں جس لفظ سے جلدی اور آسانی سے صحیح مفہوم ادا ہو سکے اس کا رواج فی الفور ہو جاتا ہے۔ کرکٹ میں "آؤٹ"، کچہری میں "کیس" "ڈسمس" اور گھروں میں "فری بان" "ڈرنک" وغیرہ اپنے ہندی الاصل مترادفوں سے زیادہ زباں زد ہیں کیونکہ مطلب کا چھکڑا نہ کبھی رکا ہے نہ رکیگا اور جہاں تک بولنے والوں کا تعلق ہے یہ قانون اٹل ہے۔ تحریر میں البتہ نوواردوں کی دیکھ بھال سختی بلکہ تعصب سے کی جاتی ہے اور کچھ عرصہ سے یہ تعصب بجائے ادبی تہذیب کے خلافتی تشدد ہو چلا ہے جو زبان کے لئے سم قاتل ہے۔ اصرار اس بات پر ہے کہ چاہے لکھنے والے کا جی نہ مانے اور چاہے اس کا مطلب فوت ہو جائے مگر انگریزی کا لفظ پاس نہ پھٹکے بلکہ مطالب کی گرفتاری کے لئے قاموس اور صراح کے کھنڈے سے لوہے کو پیٹ پیٹ کر الٹی پلٹی ترکیبوں کی زنجیریں تیار کی جائیں۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ میدان علم میں 'تھیوری' اور 'نظریہ' کی 'آئی ڈیل' اور 'نصب العین' کی تگ و دو ہوتی رہے۔ کیا تعجب ہے کہ الگ الگ رنگ میں دونوں کام دے جائیں، زبان ابھی بنتے بنتے بنے گی اور زبانوں کی عمر کے لحاظ سے اردو ابھی ہے کتنے دن کی؟

اسے آئیں گی شوخیاں آتے آتے

بشرطیکہ اس ہندی نژاد، نام کی ترکن کی لوٹ مار چو طرفہ جاری رہے +

ہوا

ہوا آنکھیں بند کرکے چلتی ہے۔ ریت کے ٹیلے ہوں کہ نشاط باغ کے آبشار، بنئے کا گھر ہو کہ شاہ جہانی موتی مسجد، کوڑا ہو کہ نہر لمودری یہ چڑیل پہنچتی سب جگہ ہے مگر دیکھتی کچھ نہیں۔ چلنے پر آتی ہے تو پتے، ریت، بھوبل، بو، خوشبو، دھواں جو ہاتھ لگے کچھ سمیٹ کچھ بکھیرا اڑی چلی جاتی ہے کبھی کندھوں پر بادل لادے پھرتی ہے کبھی کہر کا برقع پہنتی ہے مگر پہاڑ ہو کہ غار کہ سمندر دیکھتی کچھ نہیں۔ خدا جانے اسے کیا جلدی ہے؛

میں اسے اکثر دیکھتا ہوں۔ پرسوں اس دھوکے میں رہا کہ ہو نہ ہو کم از کم ایک دھانی دوپٹے کے ساتھ اس کی گستاخیاں عمداً ہوتی ہیں اور دستِ نازک کی رشکِ رقص جنبش کے مزے لے کر دل ہی دل میں قہقہے لگاتی ہے کہ جتنا روٹھے گا اسی قدر اسے اور بناؤں گی مگر یہ خیال غلط نکلا۔ چھوٹے دیدوں والی نے کل اُن کی تصویر جو میز پر میری نگاہوں کا کعبہ ہے اُٹھا کر پھینک دی اور چل دی۔ ٹھہرتی تو کچی کو کھا جاتا۔

میں اسے اکثر دیکھتا ہوں۔ باوجود اس کی بدتمیزیوں کے، باوجود اس کی جلدی کے، باوجود اس کی بند آنکھوں کے ہوا میں اِک شان ہے جو میں چاہتا ہوں کہ مجھ میں آجائے۔ کاش میری زندگی ایک میٹھے جھونکے کی طرح ہو۔ آہٹ چاہے کوئی سن پائے مگر کسی پر بوجھ نہ ہو۔ دلوں کے مرغزاروں میں خفیف سا رقص، لطیف سا ترنم، بانکی سی موجِ تبسم پیدا کروں اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چل دوں مجھے بھی جلدی ہے۔

کہیں آسمان کی طرف اکڑ کر چلتی ہیں تو کہیں سخت الثریٰ کو لڑھکتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں، اکثر بل کھاتی ہوئی ایک دوسری سے کتراتی ہوئی یوں نکل جاتی ہیں گویا دیوانی ہیں مگر کس قدر بکارِ خویش ہوشیار کہ جب دیکھو اِدھر اُدھر ظاہر نہیں تو چھپ کر، ان پاؤں کی کفش بوسی میں مشغول ہیں جو بہت عرصہ نہیں گزرا گھروں کی دہلیزوں سے ناآشنا تھے اور جو ڈولیوں سے چادروں کی آڑ میں سنبھل سنبھل کر نکلتے تھے۔

ہندوستان کی قسمت کا مدار ان پاؤں کی سلامت روی پر منحصر ہے۔

ہندوستان کی قسمت! کیا یہ جملہ غلط ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ گو مندروں اور مسجدوں کے مقابلے میں قسمت عاجز ہے مگر شملہ کی سڑکوں پر کیا اذان کیا ناقوس دونوں ساڑھی پوش ہیں اور کسی خوش خرام ساڑھی کے تصور کے ساتھ ہندوستان کی قسمت کے متعلق شک کرنا گناہ بلکہ کفر ہے۔

ہندوستان کی قسمت!! کیا یہ جملہ غلط نہیں؛ قطعی غلط ہے۔ شملے کی سڑکیں لاکھ سر پٹخیں حکومت کی مغرور رکشا کے لئے سو آٹھ نہیں آٹھ کروڑ ننگے پاؤں موجود ہیں۔ سڑک کے اوپر وہ سفید عمارت جس کے سفید صدرِ مجلس کی جگہ اب ایک خودرنگ دھوتی ہے ملک کو سیدھے رستے پر نہ چلا سکے گی۔ سڑک اس عمارت سے فصیح تر ہے۔ کہہ رہی ہے "کیا تمہیں نہیں سوجھتا کہ خالی انتڑیاں جوتیاں تک کھا جاتی ہیں۔ مجھ پر گھوڑے لوہے کی جوتی پہن کر چلتے ہیں مگر بھوکے پیٹ والے آدمی گدھے بیل کی طرح ننگے پاؤں"۔

رفع دفع

(ڈراما)

جائے وقوع ۔ کشمیری دروازہ لاہور کے باہر باغ میں چار دیواری کے اندر ایک تکیہ

وقت ۔ چھ بجے شام ماہِ جون ۱۸۹۵ء

رُلدو ۔ بوٹا اور چند قمار باز جمع ہیں ۔

رُلدو ۔ "کیوں بے ابنِ اَلم غلم ، آج تو کچھ گھبرایا ہوا ہے ؟"

بوٹا ۔ "بیٹے کچھ نہ پوچھ ۔ آج آخر کار ہم نے اپنی قسمت کا مینڈھا کوتوال کی تدبیر کے خچر سے لڑا ہی دیا ہے ۔"

رُلدو ۔ "کیوں نہ ہو ، افلاطون کے خاص الخاص صاحبزادے نہیں تو ہونا ! مگر بتاؤ تو سہی کیا ہوا ؟"

بوٹا ۔ "مجھے یقین تھا کہ کوتوال آج ضرور خود شام کے چھ بجے آئے گا اور بہت سی رقم مانگے گا مقررہ سے ڈبل ۔ کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ پچھلی جمعرات کو ہم نے دو چار موٹی اسامیوں کی دل کھول کے فصد لی ہے ۔ سو میں آج صبح ڈپٹی کمشنر کے گھوڑے کے آگے جا ڈٹا اور اسے سب حال کہہ سنایا اور منوا لیا کہ شام کے چھ بجے یہاں آکر شہر بھر کے سب سے بڑے بدمعاش یعنی کوتوال کو مال سمیت خود گرفتار کر لے ۔ اب دیکھنا تم آنکھ جھپکنے کی دیر میں گُل کھلا چاہتا ہے ۔"

رُلدو ۔ "سچ ہے جی کوتوال ایسا اُلو نہیں کہ تمہارے نرغہ میں پھنس جائے ۔ کیوں شامت آئی ہے ۔"

بوٹا ۔ "اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا ۔ لو وہ کوتوال حرامی تو آ گیا ۔

(کوتوال داخل ہوتا ہے)

کوتوال۔ (اہم۔اہم۔پھر اپنے اردلی سے) بلاؤ گارد کو۔ لگاؤ ان سب پاجیوں کو ہتھکڑی! شہر بھر کو لُوٹ لیا ہے۔

اردلی۔ (دو چار گالیاں دے کر) خبردار جو اپنی جگہ سے کوئی ہلا۔

بوٹا۔ سرکار ہم حضور کے غلام ہیں۔ خفا نہ ہوں۔ ہماری مجال ہے کہ ہلیں۔ اور بھاگ کر جائیں گے کہاں

(اردلی سے) لیجیئے بڑی گرمی ہے۔ سرکار کو پانی وانی پلوائیے۔ برف ہے۔ کھانڈ ہے!

(اردلی برف لیتا ہے اور برف کے بنڈل میں دس روپیہ اپنے

حصّہ کے پاکر کوتوال کی طرف مخاطب ہو کر کہتا ہے)

"عالی جاہ پانی بناؤں یا شربت!"

کوتوال۔ بڑی گرمی ہے تھوڑا سا شربت بنالو۔ (چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے)

(بوٹا کوتوال کے پاؤں دباتا ہے اور چپکے سے نوٹوں کا بنڈل کوتوال کے ہاتھ میں دے دیتا ہے

اور دبی زبان سے کہتا ہے "دو سَو")

کوتوال۔ (دبی زبان سے) نہیں ہرگز نہیں۔ دو سَو اور ورنہ ابھی حوالات۔

بوٹا۔ سرکار رحم!

کوتوال۔ حرامزادہ۔ ہزار میں سے ہمارا حصہ دو سَو۔ شرم نہیں آتی۔

بوٹا۔ سرکار! ہزار کس بھڑوے نے دیکھا ہے۔ یونہی مشہور ہو گیا ہے ورنہ پیر صاحب کی قسم ہمیں چھ سَو سے زیادہ نہیں ملا۔

کوتوال۔ تم پیر صاحب کی قسم جھوٹی نہیں کھایا کرتے۔ اچھا تو ہمارا حصّہ ایک سَو اور ہُوا وہ لاؤ۔

بوٹا۔ حضور پکا وعدہ کرتا ہوں پھر حاضر کر دوں گا۔

کوتوال ۔ نہیں ابھی لاؤ ورنہ چلو۔

(بوٹا سو کے نوٹ گن کر ادا کر دیتا ہے کہ اتنے میں ڈپٹی کمشنر گھوڑے پر سوار ان کے سر پر جا پہنچتا ہے۔ نوٹ ابھی کوتوال کے ہاتھ میں ہیں۔ کوتوال سرو قد کھڑا ہو کر نوٹوں والے ہاتھ ہی سے باقاعدہ فوجی سلام کرتا ہے اور کہتا ہے)

"حضور تلاشی لے رہا ہوں۔ ابھی پہلی تلاشی ختم نہیں ہوئی۔ دیکھیئے اور اس کے پاس کیا نکلتا ہے۔" (بوٹا کو ڈپٹ کر) "نکال باقی بھی"۔

(بوٹا کچھ کہنا چاہتا ہے کہ کوتوال زور سے ایک تھپڑ دیتا ہے۔ بوٹا کانپ جاتا ہے اور چپکے سے تہ بند کی ڈب سے نقد نکالنا شروع کرتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر گھوڑے سے اُترتا ہے۔ ایک سپاہی گھوڑا الگ لے جاتا ہے)

کوتوال ۔ (ڈپٹی کمشنر سے) حضور بڑا بھاری بدمعاش ہے۔ اس نے شہر لوٹ لیا ہے میں چھ مہینے سے اس کی تاک میں تھا۔ کپتان صاحب کو میں نے خبر دی تھی وہ بھی آتے ہوں گے۔ مجھے علم نہیں کہ اُنہوں نے حضور سے ذکر کیا یا نہیں۔

ڈپٹی کمشنر ۔ ول کیا کپتان صاحب آئیں گے؟

کوتوال ۔ ہاں حضور۔ میں تھانہ سے آدمی بھیج کر آیا ہوں۔ گارد ساتھ لایا ہوں۔

(سیٹی بجاتا ہے۔ آٹھ دس سپاہی آجاتے ہیں)

ڈپٹی کمشنر ۔ ہم سے کپتان صاحب نے نہیں بولا۔

(کوتوال تاڑ جاتا ہے)

کوتوال ۔ حضور یہ بوٹا بڑا بدمعاش ہے۔ اس نے سارے شہر میں مشہور کر رکھا ہے کہ ڈپٹی کمشنر کے ملازموں کو حصہ دیتا ہوں مجھے کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔

ڈپٹی کمشنر۔ ڈیم۔ گرفتار کرواں سب بدمعاشوں کو۔

(بوٹا کا رنگ فق ہو جاتا ہے۔ کچھ کہنا چاہتا ہے کہ کپتان پولیس داخل ہوتا ہے)

ڈپٹی کمشنر۔ (انگریزی میں) تمہارا تھانہ دار بہت ہوشیار معلوم ہوتا ہے۔

کپتان پولیس۔ (انگریزی میں) بے شک۔ اس نے مجھے چھ ماہ سے کہہ رکھا تھا کہ موقع پا کر گرفتار کروں گا۔ آج دوپہر اس نے خبر کی کہ موقع ہے۔ مگر آپ کس طرح آ گئے؟

ڈپٹی کمشنر۔ (انگریزی میں) امر واقع یہ ہے کہ بوٹا نے آج میرا گھوڑا روکا اور کہا کہ کوتوال زبردستی ہم سے رشوت لیتا ہے اور چھ بجے آپ اس مقام پر آئیں۔

کپتان پولیس۔ (انگریزی میں) ڈیم سوائین۔ مجھے اس تھانہ دار پر پورا اعتبار ہے۔ بہت کام کا آدمی ہے۔ رشوت لینے والا نہیں۔

ڈپٹی کمشنر۔ میرا آپ سے اتفاق ہے۔ اگر اس نے رشوت لی ہوتی تو مجھے دیکھ کر سخت گھبرا جاتا مگر اس نے فوراً کہہ دیا کہ تلاشی لے رہا ہوں۔ میں نے اس کے چہرے کو بہت غور سے پرکھا بالکل اضطراب نہ تھا۔

کپتان۔ بالکل درست۔ فرسٹ ریٹ افسر ہے (گارد کی طرف متوجہ ہو کر) سب کو ہتھکڑی لگا دو فوراً۔ تلاشی معتبرین کے سامنے کوتوالی میں ہو گی۔

سپاہی۔ بہت بہتر خداوند۔

کوتوال۔ (ڈپٹ کر) بہت جلدی۔

(ایک سپاہی باوجود اس حکم کے قمار بازوں کی طرف نہیں بڑھتا۔ بلکہ ڈپٹی کمشنر کے عین سامنے آ کر خاص بلند آواز سے کہتا ہے "ہزار میں سے ہمارا حصہ دو سو" تھانہ دار اسے دھکا دیتا ہے اور کہتا ہے "ادھر جاؤ" وہ سپاہی تھانہ دار کی کچھ پروا نہیں کرتا اور ڈپٹی کمشنر کے عین سامنے جا

کر پھر کہتا ہے :-)

"ہزار میں سے ہمارا حصّہ دو سَو"

ڈپٹی کمشنر ۔ (خفگی سے) واٹ دی ڈیول . . . . .

کپتان پولیس ۔ (بہت زور سے) اٹینشن !

سپاہی ۔ (انگریزی میں) ٹام بیوقوف مت بنو!

(کپتان کا رنگ فق ہو جاتا ہے ۔ سر! سر! (! !) کا لفظ دو دفعہ کہہ کر اس کی زبان بند ہو جاتی ہے ۔ کوتوال کو تقریباً غش آنے لگتا ہے)

ڈپٹی کمشنر ۔ کیا آپ وار برٹن ہیں ؛

سپاہی ۔ یس (ہاں) ۔

" ہزار میں سے ہمارا حصّہ دو سَو ۔ شرم نہیں آتی " کہہ کر پولیس کے جرنیل وار برٹن نے کوتوال کی جیب میں سے دو سَو کے نوٹوں کا بنڈل نکالا ۔

جرنیل وار برٹن ۔ اس ہوشیار تھانہ دار نے تم سب کو خوب چکمہ دیا ہوتا ۔ اگر میں اتفاق سے رستہ میں کار دمیں نہ مل جاتا ۔ لوگ خیال کرتے ہیں کہ میں بھیس بدلتا ہوں تو پٹھان بنتا ہوں ۔ وہ بھی کبھی کبھی مگر اکثر میں پولیس کا سپاہی ہی بنتا ہوں ۔

اب سب یہاں سے چلو اور اس معاملے کو رفع دفع کرو "۔

—•—❖—❖—❖—•—

سنہ ۵۹۲۶ء
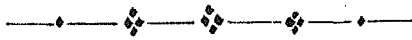
(وقت کی ابتدا نہیں وقت کی انتہا نہیں ۔ موجوداتِ عالم میں بالکل ممکن ہے کہ اس کرۂ زمین جیسا ایک اور کرہ بھی ہو ۔ اور قانونِ ارتقا کے زور سے اس میں بھی زندگی کی نمو بالکل اسی روش پر رہی ہو جیسی کہ اس زمین پر جسے ہم اپنے بھولے پن سے اس قدر یکتا خیال کرتے ہیں ۔ ایک کیا ایسے سینکڑوں ہزاروں کرے ہو سکتے ہیں بلکہ ہو سکنے کے کیا معنی ضرور ہوں گے ۔ کوئی آگے کوئی پیچھے اور ابھی اور ہوں گے ۔ وہ وقت آنے والا ہے کہ سوانح نویسی ایک لایعنی عمل ہو گا ۔ کیونکہ جس کا جی چاہے گا ، وہ گذشتہ زمانے کو اصلی حالت میں ایک اور ایسے کرہ میں جو ہم سے کچھ دن چھوٹا ہے جا کر دیکھ سکے گا ۔ اور اگر کسی کو آنے والے دنوں کا خبط سمایا تو وہ بھی کسی ایسے کرہ میں جا کر اپنی وحشت پوری کر سکے گا جو ہم سے کچھ دن پہلے کا ہے ۔ اگر ایک بیری پر دس بیس بالکل ایک جیسے بیر لگ سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ کروڑ در کروڑ ستاروں والی کائنات میں یہ ہماری دنیا متعدد دفعہ پیدا نہ ہوئی ہو یا ہوتی نہ رہے صرف آنکھوں کی ضرورت ہے ۔)

نوجوان ۔ ڈاکٹر میرا علاج کیجئے ۔

ڈاکٹر ٹرنی ۔ آپ کو کیا تکلیف ہے ؟

نوجوان ۔ میرے پاس کچھ فالتو وقت تھا اور کل میں محض تفننِ طبع کے لئے اس عجائب گھر میں گیا ۔

جس میں پُرانے زمانہ کی بعض بیہودگیوں کا مجموعہ رکھا ہے۔ سب سے پہلے وہ بکس دیکھا جس میں بند ہوکر وہ وحشی سمندر کا سفر کرتے تھے۔ ہنستے ہنستے لوٹ گیا۔ عجب گنوار لوگ تھے۔ گائیڈ بک بولی کہ اُس زمانہ کے وحشی زندگی کا تیسرا حصہ سونے میں صرف کرتے تھے۔ کیونکہ طرح طرح کی بلائیں وہ کھاتے تھے اور اس سے اُن کے خون میں ایک خاص قسم کا زہر پیدا ہوتا تھا جس سے مغلوب ہوکر وہ لیٹ جاتے۔ چنانچہ اسی بکس میں دو سوئے ہوئے وحشیوں کے مجسمے بھی رکھے تھے۔ اور چہروں کو دیکھ کر تو ہنسی آئی تھی مگر اُنہیں سوئے ہوئے دیکھ کر تو بے انتہا نفرت ہوتی تھی۔ یہ دیکھ چکا تو پھر گائیڈ بک بولی کہ ان وحشیوں کا ایک شغل یہ تھا کہ وہ کتابوں کو پڑھا کرتے تھے کیونکہ اس زمانہ میں بولنے والی کتابیں ابھی ایجاد نہ ہوئی تھیں اور یہ پڑھنے کا مرض اس قدر عام تھا کہ ہزارہا ذرا زیادہ ہوشیار وحشی اس سے فائدہ اُٹھاتے اور جھوٹے سچے قصے لکھ کر کتابیں شائع کرتے اور خوب دولت جمع کرتے۔ اس پر میں نے گائیڈ بک سے کہا کہ اُس زمانہ کا کوئی مختصر قصہ جو لوگوں میں مقبول ہؤا ہو مجھے سنا دو تاکہ میں اُن وحشیوں کی قلبی ماہیت کا کچھ اندازہ کرسکوں۔ گائیڈ بک نے مجھے ایک مختصر قصّہ سُنا دیا اور پھر میں واپس چلا آیا۔ پہلے تو وہ قصہ سُن کر اُن لوگوں کی بیہودگی پر میں خوب ہنسا۔ مگر بعد میں میرے دل میں اُن لوگوں سے جن کا وہ قصّہ تھا، کچھ ہمدردی پیدا ہوگئی۔ جوں جوں زیادہ سوچتا ہوں وہ ہمدردی کم نہیں ہوتی۔ اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ضرور میں بیمار ہوں۔ ورنہ ناممکن ہے کہ کسی تندرست آدمی کو اُن وحشیوں سے ہمدردی ہو۔

ڈاکٹرنی۔ پہلے آپ وہ قصہ سنائیں پھر اندازہ کیا جائے گا کہ آپ پر کسی بیماری کا اثر ہے یا نہیں۔

نوجوان۔ قصہ یہ ہے۔ ایک کھانے کی مجلس میں ایک لیڈی اور ایک جنٹلمین پاس پاس بیٹھے تھے، دونوں شادی شدہ تھے، دونوں نیک تھے اور دونوں کی نظروں میں ایک دوسرے کی

بے انتہا عزت تھی۔ وہ اپنی پاکبازی کے زعم میں بے تکلف ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر گفتگو کر رہے تھے اور انہیں خیال بھی نہ تھا کہ کسی اور کو اُن کے حرکات و سکنات میں کسی قسم کی دلچسپی ہوگی۔ اتفاق سے لیڈی کی اُنگلی میں سے ایک ڈھیلی سی انگوٹھی نکل کر میز پر لڑھک گئی۔ وہ اُٹھانے کے لئے آگے جھکی مگر اس جنٹلمین نے جلدی سے ہاتھ آگے بڑھایا اور وہ ہاتھ اُس لیڈی کے کلّے کو چھُو گیا۔ وہ دونوں تو ہنس دیئے مگر ایک زیادہ عمر کی بدصورت عورت بھی اس مجلس میں تھی اور اسے اس لیڈی سے حسد تھا۔ اس نے یہ ماجرا دیکھ لیا۔ اور پیشتر اس کے کہ مجلس ختم ہو اُس نے ایک ایک کر کے سب حاضرین سے یہ قصہ خوب حاشیئے چڑھا چڑھا کر بیان کر دیا۔ سننے والوں نے اوروں سے ذکر کیا اور اس قصّہ کا خوب چرچا ہؤا۔ صرف ان دو کو تو یہ بات بھولی رہی مگر باقی ان کی ساری دُنیا میں دو کیمپ ہو گئے۔ ایک وہ جو اُن کو بے قصور سمجھتے تھے۔ اور دوسرے وہ جو اس بات پر ایمان لے آئے تھے کہ یہ دونوں پورے بدچلن ہیں اور وہ حسد کرنے والی چڑیل اب اس تاک میں تھی کہ کسی نہ کسی طرح اُن کی زندگی برباد ہو اور یہ موقعہ بھی جلد نکل آیا۔ کیونکہ ایک مُنہ پھٹ عورت نے موقعہ پاکر چند اور لوگوں کی موجودگی میں خود اسی کے گھر میں اس لیڈی سے کہا:۔

منہ پھٹ۔ بہن ذرا مجھے اپنی اس ڈھیلی انگوٹھی کا دیدار تو کرا دو۔

لیڈی۔ بہن کونسی ڈھیلی انگوٹھی؟

منہ پھٹ۔ اوہو انجان ہی تو بنی جاتی ہو۔ اجی وہی ڈھیلی انگوٹھی جس نے مسٹر زیڈ کا دل شکنجے میں کر رکھا ہے۔

لیڈی۔ میں نہیں سمجھی۔

منہ پھٹ۔ ہاں بہن تم کیوں سمجھو گی جب روز کا ملنا ہو تو کھانے کی میز کی ذرا سی چھیڑ چھاڑ تمہیں کیا یاد رہے گی۔

لیڈی۔ (جس کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہو گیا تھا) اگر آپ مجھے اپنے جیسا خیال کرتی ہیں تو آپ معذور ہیں۔ مگر میرے گھر سے تشریف لے جایئے۔

منہ پھٹ۔ جی ہاں۔ میں مسٹر زیڈ کے گھر سے جا رہی ہوں۔ آداب۔

وہ تو چلی گئی اور لیڈی رونے لگ گئی۔ جو اور موجود تھیں انہوں نے بہت کچھ سمجھایا اور باتوں باتوں میں سب نے کہہ دیا کہ یہ قصہ تو سب کو معلوم ہے۔ اور تم چونکہ اس کھانے کے بعد بھی اس سے بہت آزادی سے ملتی رہی ہو اس لئے سب کو یقین ہو گیا ہے کہ کھانے کی میز والے معاملہ کی تہ میں اتفاق نہیں بلکہ عشق کی آگ ہے۔ یہ سب تو چلی گئیں مگر یہ لیڈی شام تک روتی رہی۔ اتفاق سے اُسی دن اس کا شوہر چند بن بلائے مہمان لے آیا۔ اُسے یہ توقع تھی کہ بیوی حسب معمول چند سے ماہتاب چند سے آفتاب ہو گی اپنی پسندیدہ گفتگو سے مہمانوں کو یقین دلائیگی کہ اس کا شوہر کس قدر خوش قسمت ہے مگر اُس کی آرزوؤں کا خون ہو گیا۔ مہمان بھی دل میں چہ میگوئیاں کرتے ہوئے رخصت ہوئے۔ جب رات کو سونے کے وقت لیڈی نے تمام واقعہ بلاکم و کاست اپنے شوہر کو سنایا تو اُس کا کچھ ملال تو کم ہوا۔ مگر شوہر کے دل میں رشک کی آگ بھڑک اُٹھی اور اس خفیف سے معاملہ کا نتیجہ آخر کار یہ ہوا کہ تین شگفتہ مزاج ہستیوں یعنی لیڈی، اُس کے شوہر اور اس جنٹلمین نے اس زندگی میں جہنم سے بدتر صعوبتوں کا مزہ چکھا۔ مجھے اُس لیڈی سے ہمدردی بڑھتی جاتی ہے۔ اور یہ ضرور کسی مرض کی علامت ہے۔

ڈاکٹرنی۔ تمہارا کیس تو کچھ بھی خطرناک نہیں مگر میں میڈیکل بورڈ میں اطلاع کروں گی۔ فی الحال تم چند منٹ کے لئے چاند کی سیر کر آؤ۔ ابھی تمہیں واپس بُلا لیا جائے گا۔ یقیناً شام تک تم واقعات کو صحیح روشنی میں دیکھ سکو گے۔

میڈیکل بورڈ کا پریزیڈنٹ۔ ڈاکٹرنی آپ نے بہت اچھا کیا کہ اُس نوجوان کی متحرک تصویر

جبکہ وہ آپ کو قصہ سنا رہا تھا لے لی۔ اس تصویر سے صاف ظاہر ہے کہ اس نوجوان کی جذباتی تعلیم میں کمی رہ گئی ہے۔ اور اس کمی تعلیم کے باعث اس میں یہ نقص پیدا ہو گیا ہے کہ وہ پُرانے زمانے کے وحشیوں کی زندگی کو بحیثیت مجموعی دیکھنے سے قاصر ہے۔ نسخہ یہ ہے کہ اُسے اس زمانہ کی لیڈیوں کا جو سلوک اپنے بچوں اور نوکروں سے تھا اس کی فلم تیار کرا کے فوراً دکھا دو۔ مرض یقیناً رفع ہو جائے گا اور محکمۂ حفظانِ صحت میں اطلاع کر دو کہ اگلے زمانے کے قصے کہانیوں کی کتابوں کے متعلق گائیڈ ٹیک کو از سر نو تیار کیا جائے۔ بنی نوع انسان کے لئے گذشتہ زمانے سے نفرت کے سوا اور کسی قسم کا خیال سمِ قاتل ہے۔

ڈاکٹرنی ۔ شکریہ۔ فلم ابھی تیار ہو جائے گی۔ اور مریض کو میں چاند سے ابھی بلوا لیتی ہوں۔

نوجوان ۔ (فلم دیکھنے کے بعد) ڈاکٹرنی، آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ کیا واقعی وہ وحشی لوگ اپنے بچوں سے بلاوجہ جھوٹ بولتے تھے۔ اور ایک آدمی دوسرے آدمی کو اپنا نوکر خیال کرتا تھا؛ اور کیا سچ مچ ایک آدمی چاندی کے گول گول ٹکڑوں کے لئے دوسرے آدمی کا نوکر بن جاتا تھا ؟

ڈاکٹرنی ۔ یہ بالکل درست ہے۔

نوجوان ۔ ایسے حیوانوں کو انسان خیال کرنا ہی غلطی ہے۔ بھلا وہ وحشی عشق، محبت، عزت کو کیا سمجھتے ہونگے ؟ اگر کبھی وقت ملا تو پھر کبھی آج سے چار ہزار سال پہلے والی بیہودگیوں کے عجائب خانہ میں جاؤں گا۔ عجب زمانہ ہوگا۔ اور طرفہ یہ کہ وہ گانے بیل کے محتاج وحشی اپنے آپ کو مہذب انسان خیال کرتے تھے۔

بمبئی سے وینس

لائڈ ٹرسٹینو کمپنی کا جہاز کراکوویا بمبئی سے یکم جون کو تقریباً ساڑھے دس بجے صبح روانہ ہؤا اور وینس ۱۶ جون کو شام کے ساڑھے پانچ بجے آلگا۔ اگر نہر سویز میں اتفاقیہ طور پر چھ گھنٹے ضائع نہ ہو جاتے تو ۱۶ جون کو صبح ہی وینس آپہنچتا۔ جہاز کی زندگی کسی پہلو سے بھی خاص طور پر قابلِ ذکر نہیں۔ جہاز نہایت آرام دہ تھا اور گو وزن میں صرف آٹھ ہزار ٹن ہے مگر اس کی رفتار میں کچھ بلا کی ثقاہت ہے۔ لغزشِ رندانہ کا تو موقع ہی نہ ملا کیونکہ کسی نازک ادا کے صدقے سمندر کو تیور پر بل لانے کی جرأت نہ ہوئی۔ سب سے بڑی لہر وہی تھی جو خود اسی جہاز کے چلنے سے پیدا ہوتی اور جس کے سفید وپُرپیچ وخم طُرّے پر پانی کے موتیوں میں دھوپ ثانیے ثانیے میں سَو سَو قوسِ قزح پیدا کرتی۔ جہاز سے زورِ سطحِ بحر پر بالکل معمولی سی جُنبش تھی۔ چھوٹی چھوٹی لہریں ننھی ننھی سفید کلغیاں مٹکاتی تھیں گویا کہہ رہی تھیں "آؤ اور کھیلو"۔ ایسے بھولے بھالے سمندر سے گلے ملنے کی اُمنگ جس دِل میں پیدا نہ ہو وہ دل نہیں پتھر ہے، شاید اسی اُمنگ کے پُورا کرنے کے لئے جہاز میں اس کی بساط کے مطابق چھ فٹ گہرا تالاب بھی تھا۔ یورپین اقوام کی ہر چیز کی طرح یہ تالاب بھی تہ ہو سکتا تھا جب چاہو بھر لو جب چاہو خالی کر کے دیواریں اُٹھا کر تہ کر کے رکھ دو۔ پیکنگ کا ہُنر خداداد ہے اور کرسی، میز، آئینہ، پلنگ، تالاب، مذہب کوئی بھی استعمال کی چیز ہو یورپین ایسی نفاست سے اسے تہ کر کے الگ کر دیتا ہے کہ مشرقی حیوان اسے باور نہیں کر سکتا۔ اس تالاب میں یورپین کیا جوان کیا سن رسیدہ اور کیا لیڈیاں ایک دوسرے سے بڑھ کر جستیں لگاتے۔ آٹھ دس ہندوستانی بھی پیراک تھے اور گرمی

کی تلخی سے بچنے کے لئے یہی موقع بے موقع آن کودتے تھے مگر کیا تالاب کیا سبزا اور کیا عرشۂ جہاز کالے اور گورے کے درمیان جو خدائی لکیر ہے وہ نہ مٹی پر نہ مٹی۔ درجۂ اوّل کے ڈیڑھ سو مسافر تھے جن میں سے دا اگر پارسی ہندوستانی ہیں پچاس اہلِ ہند تھے اور ان میں سے صرف ایک مسلمان پارسیوں کے بعد پنجابیوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ دو امرتسر کے تاجر دو لاہور کے۔ ایک جالندھر کا۔ ایک کشمیر کا۔ ایک طالبعلم کل پنجابی آٹھ تھے۔ پانچ پارسی لیڈیوں کے علاوہ دو بمبئی کی ہندو لیڈیاں تھیں ایک مدراس کی اور اور ایک الٰہ آباد کی مجموعی حیثیت سے حسن کا پرچم ہندوستانی کرسیوں پر لہرایا۔ چنانچہ دل مچلتے دیکھے، آنکھیں جھپکتے دیکھیں۔

میں دیکھتا چلا گیا

ہلکا سا گلابی رنگ کا جوا جہاز کی جان ہے۔ اور پہلے تین دن اس بات پر بازی لگتی رہی کہ کون صحیح بوجھتا ہے کہ جہاز نے بارہ بجے سے بارہ بجے تک کتنے میل طے کئے۔ اس کے بعد ایک دن قرعہ اندازی کے طور پر جوا ہوا یعنی ایک تھیلے میں سے جس نمبر کا پرچہ پہلے نکلا اس نمبر کے ٹکٹ والے کو اول درجہ کا انعام ملا۔ چند منٹ جیتنے والے کی خوش قسمتی پر رشک ہوتا تھا۔ جن کا ایک ایک شلنگ جاتا تھا ان کے چہرے کہتے تھے

دل میں آتا ہے کہ وہ شخص ہمیں کیوں نہ ہوئے

سولھویں دن یہ چہل پہل ختم ہوئی اور محصول گھر سے اسباب نکلتے ہی مسافر اس طرح تتر بتر ہو گئے کہ گویا کبھی ملے ہی نہ تھے۔ اٹلی کے مشہور شہروں میں سے وینس ہی وہ شہر ہے جو رومن شہنشاہی کے زوال کے بعد بلکہ اسی زوال کے باعث ظہور میں آیا۔ جب شمالی اطالیہ کو وحشی جرمنوں کی ترکتازیوں نے حد سے زیادہ روندڈالا تو کچھ لوگ بھاگ کر ادریاٹک ساحل کے قریب چھوٹے چھوٹے جزیروں میں پناہ گزیں ہوئے اور ماہی گیری اور کشتی رانی سے بسر اوقات کرنے لگے۔ مثل ہے کہ ہمت کا

حامی خدا ہے"۔ اگر کہیں صادق ہے تو وینس ہیں "

یہ جو فوجوں سے بھاگے تھے خود فوج والے ہوئے۔ اور بحری بیڑے تو وینس میں وہ عظیم الشان تیار ہوئے کہ سولھویں صدی عیسوی میں (جب ترکوں کی سلطنت بحیرۂ روم میں سب سے زیادہ با اقتدار تھی) وینس کے امیر البحر نے ترکوں کے بیڑے کو شکست دے کر ترکوں کا مشہور علم ان سے چھینا اور وہ جھنڈا جس پر لا الٰہ . . . محمد رسول اللہ اب تک صاف پڑھا جاتا ہے اس وقت تک وینس کے سابق حکمرانوں کے محل کی سقف میں فخریہ لٹک رہا ہے۔ پورے گیارہ سو سال وینس خود مختار رہا۔ ڈیوک (DUKE یا DOGE) عمر بھر کے لئے منتخب کر لیا جاتا اور وہ کونسل کے مشورہ سے کام کرتا تھا۔ سب سے بڑی کونسل وہ تھی جس کے رکن تمام وہ امرا تھے جن کی عمر پچیس سال سے متجاوز ہو۔ پھر ایک دس ارکان کی کونسل تھی اور ایک اور بھی خاص الخاص تین ارکان کی کونسل۔ یہ سب ڈیوک کے مشیر ہوتے تھے اور بسا اوقات اصل حکومت انہی دس کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ گیارہ سو سال میں ۱۲۰ ڈیوک ہوئے جن میں سے ۱۱۹ کی تصاویر موجود ہیں اور جس کی نہیں وہ اس لئے کہ وہ اس جرم میں قتل کیا گیا کہ وہ غداری کر کے جمہوری سلطنت کی بجائے شخصی مطلق العنانی چاہتا تھا۔ ایک سو تیس سال ہوئے کہ نپولین اعظم کے ہاتھوں وینس کی آزادی کا خاتمہ ہوا۔ گو اس سے پہلے بھی بسا اوقات یہ آزادی برائے نام ہوتی تھی۔ مگر اس میں کلام نہیں کہ یہ شہر گیارہ سو سال کی خود اپنی حکومت کا نہایت ہی شاندار نمونہ ہے۔

سارے وینس میں ایک بھی موٹر کار یا گاڑی یا چھکڑا نہیں۔ نہریں یہاں گلیاں ہیں اور ایک بڑی نہر یہاں کی ٹھنڈی سڑک بلکہ شہر بھر میں گھوڑے پر بھی کوئی سوار نہیں ہوتا۔ اب بڑی نہر پر موٹر کشتیاں چلتی ہیں۔ شہر میں گاڑی گھوڑا نہ ہونے کے باعث شور بہت ہی کم ہے۔ صرف موٹر کشتیوں سے موٹر بائیسکلوں کی طرح ناگوار سا شور پیدا ہوتا ہے۔ ریل بھی اس شہر میں بہت سا سمندر عبور کر کے

پہنچتی ہے اور سٹیشن پر جانے کے لئے بھی کشتی کی ضرورت ہے۔ خاص شہر ایک بڑے جزیرے پر واقع ہے مگر اِدھر اُدھر کئی چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں جن میں ہسپتال، ہوٹل، کارخانے وغیرہ موجود ہیں۔ وینس کی سب سے بڑی دلفریبی ایک چوک ہے جس میں شام کو باجا ہوتا ہے اور جس کے تین طرف نہایت شاندار دوکانیں ہیں اور ایک طرف گرجا سینٹ مارک جو دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اس چوک میں رات کے نو دس بجے کے درمیان کم از کم پانچ چھ ہزار مرد و عورت نہایت لطف سے سیر کرتے ہیں یا بیٹھ کر آئس کریم کھاتے ہیں۔ دکانیں اس قسم کی ہیں کہ اگر شملہ والی گک اینڈ کیلوی جیسی دو سَو دُکانیں پہلو بہ پہلو لاہور کے منٹگمری ہال سے تین گنا بلند عمارت کی نچلی منزل میں لگا دی جائیں اور شملہ اور لاہور سے دس گنا زیادہ بجلی کی روشنی کا انتظام ہو تو شاید کچھ اندازہ ہو سکے گو عمارت کی خوبصورتی پھر بھی وہ نہ ہوگی جو یہاں ہے۔ اور نہ وہ خوش قطع لباس اور بیفکری کا نقشہ ہوگا جو ایک کامیاب خودمختار ترقی کرنے والی قوم کا خاصہ ہے ٭

گرجا کئی وجوہ سے بے نظیر ہے۔ یہ وینس کی سابق عظمت و دولت کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اور گرجا کیا ہے دُنیا بھر کا تصویر خانہ ہے۔ پہلا حصّہ وہ ہے جس میں ٹوپی اُتارنے کی ضرورت نہیں گو عمارت کے اندر ہے۔ اس میں بائبل کو تصویروں میں پیش کیا گیا ہے یعنی حضرت آدم کی پیدائش سے حضرت مسیح تک۔ حضرت حوّا کا بہشت سے نکلنا۔ ہابیل کا قابیل کو مارنا وغیرہ وغیرہ۔ مگر تصویریں کس چیز کی ہیں؟ سونے کی۔ شیشے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں سونے کے ورق کو خاص کاریگری سے بند کر دیا ہے۔ اور پھر اسی پچّی کاری سے ہزار ہا تصاویر کیا گرجے کے اندر کیا باہر بنائی ہیں۔ عمارت کی شان الگ۔ تصویروں کی شان الگ۔ ساٹھ قسم کے سنگِ مرمر کی دلآویزیاں علیحدہ اور سومناتھ کی طرح بیش بہا جواہرات کا مجموعہ طُرّہ برآں۔ لاہور یا دہلی کی طلائی مسجد یا امرتسر کا طلائی دربار نہیں کہ سونے کے پترے ٹھوپ دیئے۔ سونا ہے مگر "عقل" کے ساتھ۔ اس گرجا کے ساتھ ملنا ہوا

پرانا نوابی محل ہے جس میں بعض لاجواب تصاویر ہیں ۔ یوں تو اس محل کے در و دیوار ہی نگارخانہ ہیں مگر بعض تصویریں وہ ہیں جن پر کتابوں کی الماریاں لکھی جا چکی ہیں ۔ اور ابھی تک دُنیا کی تحسین کا خراج برابر جاری ہے ۔ ایک تصویر میں ایک ستم ظریف نقاش نے اپنی گھروالی کو دو دفعہ دکھایا ہے ۔ بہت بڑی تصویر ہے تقریباً سولہ گز لمبی اور آٹھ گز چوڑی اور نقاش کا منشا بہشت و دوزخ کا نمونہ پیش کرنے کا ہے ۔ چنانچہ اس کی گھروالی ایک طرف تو بہشت میں ہے اور ایک طرف دوزخ میں بیٹھی کلیجہ مسوس رہی ہے ۔ خدا جانے میاں بیوی کے درمیان کیا واردات ہوئی کہ یہاں تک نوبت پہنچی *

آئینہ سازی اور لیس کی تیاری یہاں کی مشہور صنعتیں ہیں ۔ آئینہ سازی کا کارخانہ دیکھ کر عقل دنگ ہوتی ہے ۔ آنکھوں کے سامنے شیشے کے گلاسوں اور قدحوں میں وہ باریک سے باریک لیس تیار کر دیتے ہیں اور وہ رنگ بھر دیتے ہیں کہ طلسم سے کم نہیں ۔ ایک جگہ شیشے کا تاگا تیار ہو رہا تھا نرم سے نرم بالوں سے بھی زیادہ نرم ۔ زیادہ باریک ۔ زیادہ چمک دار ۔ اس سے کپڑے بنتے ہیں *

شاید

تجھے کن لفظوں سے یاد کروں ؛ میری عبارت میں نہ تیرے بالوں کی بغاوت نہ تیری آنکھوں کا جادو نہ تیری آواز کا رس۔ کاش تو اپنے تخیّل سے کام لے اور بن سیرے کہے وہ سب کچھ دیکھ لے سب کچھ سمجھ لے۔ جو میں دکھانے اور سمجھانے سے معذور رہوں۔

میری آرزوئیں، کیونکہ وہ سب تیرے متعلق ہیں، زندۂ جاوید ہیں، آرزو کے مرنے کا امکان تب ہوتا جب اس کے بر آنے کی کوئی صُورت ہو۔ اب تو خیر چھ ہزار میل کا فاصلہ ہے مگر جب یہ دُوری نہ بھی تھی تب بھی نہ میں کچھ کہہ سکا نہ تو کچھ سمجھ سکی۔

تُو نے کبھی خواب دیکھے ہیں ؛ کاش ایک خواب تو دیکھے، ایسا کہ تو لاکھ یاد کرے مگر وہ خواب ہی رہے، اور اس خواب میں وہ دامنِ کوہ، وہ چشمہ، وہ سیر، تیرے دل میں گدگدی کر کے سوتے سوتے تجھے محوِ تبسّم کر دیں۔

اور کاش میں ایک خواب دیکھوں، یہ سودائی سر ہو وہ نازک پاؤں ہوں اور آنسوؤں کی قطار۔ تیرا خواب فضائے عالم میں خوشنما شفق بن کر پھیلے اور میرا خواب ایک سیاہ مست بادل کا ٹکڑا بن کر اُڑے۔ اس دُنیا جہان سے بہت دور جہاں نہ تجھے نہ مجھے نہ کسی اور کو کچھ بھی پتہ چل سکے۔ یہ دونوں خواب شاید ہونٹ سے ہونٹ لگالیں ؛

———•◊•——◊——•◊•———

مویاں نوں نہ مار

مکانوں کے ناموں کا ذکر تھا جیسے محمود منزل، اقبال منزل، شریف منزل! چپکے سے کہتی ہیں "میں تو ان منزلوں سے تھک گئی!"۔ بیسیوں اور ایسے فقروں کی روانی یاد ہے، کچھ ان کی زبانی کچھ اوروں کی، مگر یہ لمبی کہانی ہے۔ جن لب و دہن پہ دِلّی کی زبان کلیوں کی طرح کھلتی ہے پیرس میں ان کی یاد ستم ہے، ہلکی سی گرمی ہو، ہاتھ میں پنکھیا ہو، سفید جھم جھم قمیص، پتلا سا اودا دوپٹہ اور پان کھانے سے ماتھے پر شبنم اور وہ دبی زبان سے کہے "اُف"۔

بات کہاں سے کہاں پہنچی! یہاں برف پڑنے کے برابر ہے، پہلو والی سیمتن گرم کمرے میں اپنے برہنہ بلوریں شانے بار بار ایک فتنہ خیز پوستین سے چھپاتی ہے۔ مطلب نہ گرمی ہے نہ سردی بلکہ وہ خفیف رقص جس کا میں ازل سے دلدادہ ہوں اور اس ظالم کو بغیر مجھ سے ہمکلام ہوئے اس بات کا علم ہے۔ چار زبانوں میں سے کس زبان میں فریاد کروں؟ انگریزی، اُردو، فارسی، پنجابی؛ غریب اُردو فارسی کا کیا ذکر، کروڑپتی انگریزی میں بھی 'مویاں نوں نہ مار' والے پنجابی جملے کے برابر کوئی چیز نہیں۔ یہ فقرہ نہیں مکمل ڈراما ہے۔ دل ہی دل میں اسے دہراتا رہا۔

یہ قصہ ایک ایسے قہوے خانے کا ہے جہاں کالے کا کیا ذکر انگریز بھی کم کم دکھائی دیتے ہیں۔ بیس سے زیادہ کی جگہ ہی نہیں اور جس قدر جگہ تنگ ہے اسی قدر نرخ وسیع۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے خورونوش کا پُرتکلف سامان پیش کیا جاتا ہے مگر کون کھاتا ہے کون پیتا ہے؟ ایک آدھ چیز چکھ لی جاتی ہے کسی گلاس کو کبھی کبھی ہونٹوں سے زندہ کر دیا جاتا ہے اور باقی سب واپس، اس دل لگی

کی قیمت اس سستے زمانے میں فی کس تیس روپیہ ہے۔

لو وہ اُٹھی! روسی راگ اور وہ موجِ دریا کو خجل کرنے والے پاؤں! پیرس تیرا بُرا ہو! جو دل پتھر آیا تھا اور مہینوں پتھر رہا وہ پانی ہے۔ پیرس! پیرس!! پیرس!!!

مویاں نوں نہ مار

پیرس! کاش تجھ میں رات نہ ہو اور اے وائے کاش کہ جو مشرقی یہاں آئے وہ آنکھوں سے اندھا، کانوں سے بہرہ اور دل کا پتھر ہو۔

یہ نہیں ہو سکتا! لے میں نے آنکھیں بند کیں۔ کانوں میں روئی دی اور وہاں پہنچا جہاں جہاں . . . . .

اتنا دُور سفر ایک نیم بسمل کے لئے کس قدر مشکل ہے؛ اور جب وہ نامہرباں ہوگی تو کیا وہاں بھی مجھے یہی کہنا ہوگا؛

— مویاں نوں نہ مار —

پیرس دسمبر ۱۹۲۶ء

بچے کھیل رہے تھے

بچے کھیل رہے تھے، ندی گا رہی تھی، ہوا ناچ رہی تھی۔ پھول اترا اترا کر جھوم رہے تھے، بچے لڑ پڑے مگر ندی کے راگ میں، ہوا کے رقص میں، پھولوں کی مسکراہٹ میں ذرا فرق نہ آیا۔ بچے لڑ لڑا کے ایک بڑے گروہ کی بجائے دو چھوٹی جماعتوں میں منتشر ہوتے نظر آئے۔ جو پٹے تھے وہ روتے کڑھتے الگ ہٹ رہے تھے۔ پیٹنے والے تن تن کر کہہ رہے تھے "کہا نہ ماننے کا مزہ چکھا"! پٹنے والے بڑبڑا رہے تھے "نہیں مانتے۔ سو دفعہ نہیں مانیں گے۔ کیوں مانیں؟ ای ای ای"۔ یہ "ای ای ای" آخری دو چار چپتوں کا رسیدی جواب تھا۔ تھوڑی دیر بعد الگ الگ کھیل شروع ہو گیا۔ بڑے لڑکے دریا کھودنے لگے اور چھوٹے لڑکے قلعہ تعمیر کرنے میں مشغول ہو گئے۔

دریا کھُد کر تیار ہوا تو چھوٹی چھوٹی اوکیں۔ اس میں پانی بہانے کی فکر میں لگیں۔ اوک میں کتنا پانی آتا؟ آخر ایک باتدبیر ہونہار نے ایک چھوٹے لڑکے کی لٹیا کا ڈول بنایا۔ یہ بچارا اپنی مٹی کے قلعہ کی اٹھتی ہوئی بلندی میں اس قدر مصروف تھا کہ یہ تمام ماجرا اسے تب معلوم ہوا جب دریا کی لہروں نے اس کے قلعہ کی دیوار آ گرائی، دریا بھی رک گیا، قلعہ بھی ڈھے گیا اور کھیل بھی بھول گیا پھر وہی ٹکتے۔ وہی لاتیں وہی اوں اوں۔ ابکے بڑے بچوں میں خود تین جماعتیں ہو گئیں۔ کچھ تو اس بااصول کے حمایتی تھے جس نے پکار کر کہا "جس کا مکّا اس کی لٹیا"۔ کچھ چاہتے تھے کہ لٹیا میں پانی اجازت سے بھرنا چاہئے تھا۔ اس جماعت کا اعتراض یہ نہ تھا کہ لٹیا خراب ہوئی یا لٹیا والے کا دل دکھا بلکہ صرف یہ کہ خودداری کا لازمی تقاضا ہے کہ اجازت طلبی کی رسم کو ضرور ادا کیا جائے۔ ان کا

آخری قول فیصل یہ تھا کہ اگر اجازت خوشی سے نہ دی جاتی تو پھر زبردستی ٹوپی چھین لی جاتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ تیسری پارٹی کے احساسات کا اظہار یوں ہُوا کہ اجازت کا سوال قطعاً فروعی ہے، ان کا اصرار اس بات پر تھا کہ دریا بنانے والی جماعت کے کسی ایک ممبر کا باقی ممبروں کو اپنی تجویز سے بے خبر رکھنا غداری ہے اور بے خبر رکھتے ہوئے اس تجویز پر عمل کر دینا غیر آئینی ہے۔ "تم نے تجویز کو باقاعدہ پیش کرکے اسے منظور کیوں نہیں کرایا؟" یہ تھا اس تیسری جماعت کا سوال ؛

گھر واپس جانے کا وقت ابھی نہ آیا تھا۔ شام دور تھی، باغ پُر فضا تھا اور کھیل کے شوق سے بھرے گنہگار تھے۔ چنانچہ اب چار مختلف جگہ کھیل شروع ہُوا۔ ہر جگہ کھیل تھوڑی دیر انہماک سے رہتا اور پھر ضرور کچھ نہ کچھ لڑائی ہو جاتی اور نئی نئی ٹولیاں تیار رہتیں۔ تھے تو بچے مگر ایک لڑائی میں پوری شاعری کر گئے۔ کسی شوخ طباع کو سُوجھی کہ لاؤ اس باغبان کا جو اصل مقصد ہے وہ پورا کر دیں یعنی پھول بن کر مسکرائیں۔ ندی بن کر گائیں اور ہوا کی اٹکھیلیوں کو مات کریں۔ سب نے کوشش کی مگر باغبان کے نام پر جھگڑا ہو گیا۔ پھر وہی تکّے وہی لاتیں وہی اول اول۔ لڑتے لڑتے ایک بولا کہ باغبان کا قصہ چھوڑو وہ تو نہ آئے، نہ بولے، ہوتا تو آتا یا بولتا۔ آؤ اس باغ کو اپنا بنا لیں۔ اپنا بناتے بناتے باغ کی تقسیم پر پھر لڑائی ہو گئی ؛

بچّوں کا وقت کس قدر لمبا ہوتا ہے۔ اور اس کے برعکس فرشتے جن کو اکثر غلط طور پر بچّوں سے تشبیہ دی جاتی ہے کس قدر جلد باز ہوتے ہیں۔ ایک فرشتہ اس امر کے لئے تیار ہو رہا تھا کہ یہ چھوٹی سی فالتو شمع جس کا نام نظامِ شمسی ہے کچھ ٹھیک نہیں جلی اِسے گُل کر دوں ؛

———•———⁂———⁂———⁂———•———
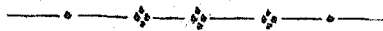
تین خیال

دنیا کا وہ مسافر جسے رستہ نہیں آتا اور جسے کوئی نہیں چاہتا، وہ مجبور نابینا جو آج جاپان میں ہے تو کل امریکا اور پرسوں کلکتے، وہ جو قطب شمالی میں سوتا تو قطب جنوبی میں آنکھ کھولتا ہے شہروں کو ہلا دینے والا۔ آرام گاہوں کو مٹا دینے والا، وہ بے خبر مگر بدنام ا بے سمجھ بدانجام جس سے سمندروں میں آہ و بکا ہے وہ گردش کا مارا غریب اور آوارہ جس کا نام سن کر دلی و لاہور کی بھولی بھالی بچیاں

جل تُو جلال تُو

آئی بلا کو ٹال تُو

کہہ اٹھتی ہیں۔

طوفان

مجھے امریکہ کے رستے میں ملا، جہاز پر کرسیاں اجڑ گئیں، پلنگ آباد ہو گئے، وہ لہریں جن کی انتہائی جرأت یہ تھی کہ چھ منزل نیچے کے روزنوں سے نیچے نیچے چلیں وہ اچھل کر سب سے اونچی منزل میں عرشہ پر یوں خراماں تھیں گویا کہ گھر اُن کا ہے۔

خدا جانے کیوں مگر شاید اس وجہ سے کہ میرا دل اگر بجائے خود طوفان نہیں تو طوفان زدہ تو برسوں کا ہے مجھے کسی قسم کی بے قراری یا تکلیف محسوس نہ ہوئی برآمدے کے شیشوں کی پناہ میں گھنٹوں اس تلاطم کا، جہاز کی مستانہ لغزشوں کا، طوفان کی شہزوریوں کا لطف اٹھایا۔ سفید دنیا میں گندمی رنگ کے

S.S. LEVIATHAN

ایس ایس لوائتھن۔
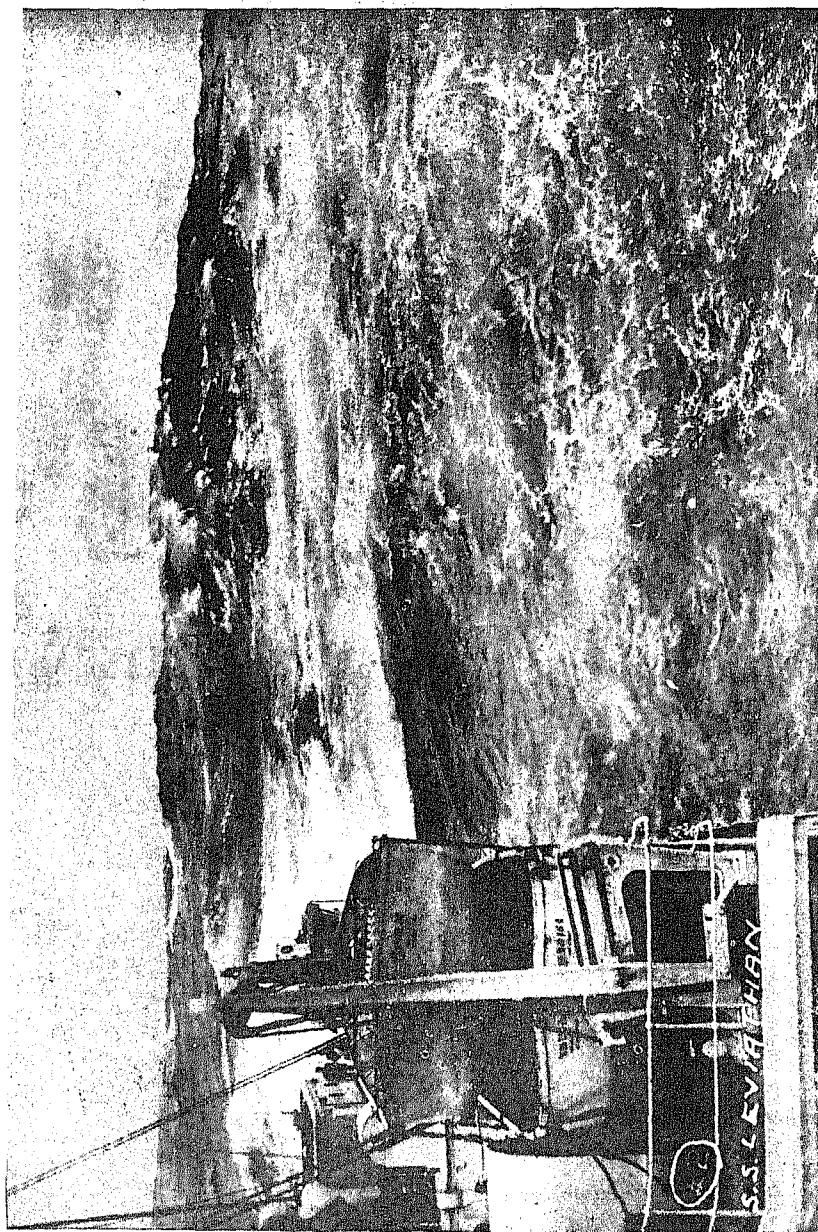
واحد نمائندے کی امتیازی خصوصیتوں میں یہ ایک سرخاب کا پر اور لگا کہ [illegible] اچھا ہے۔
بے پروا آنکھیں، پُرغرور ہونٹ پہ تبسّم پیش آنے لگے مگر کہاں وہ تکلّف کی گرمجوشی کہاں لہروں کی
بے ساختہ شوخیوں کا جادو؛ اس بھولے بھٹکے طوفان کے اضطراب میں اس قدر مشغول تھا کہ جب
پہلو سے آواز آئی کہ

"آپ کو طوفان سے بہت دلبستگی معلوم ہوتی ہے"

تو میں چونک اُٹھا اور ایک ثانیے کے کچھ حصّے کے لئے یہ سوچا کیا کہ ان الفاظ کا مخاطب کوئی اور ہوگا
مگر نہیں۔ یہ بوچھاڑ مجھی پر تھی۔

مَیں۔ جی ہاں! اس لئے کہ مجھے انسانوں سے محبت ہے۔

وہ۔ وہ کیسے؟

مَیں۔ کیا ہر انسان بجائے خود ایک مرکزِ طوفان نہیں؟

وہ۔ میں تو نہیں ہوں۔

مَیں۔ اپنے کسی چاہنے والے سے پوچھئے۔

وہ۔ آپ کو ان کا کیا پتہ؟

میں۔ آپ ہی فرمائیے اس کا کیا جواب دوں؟

اتنے میں کچھ اور لوگ آ شامل ہوئے اور وہ اس قافلہ کے ساتھ سدھاریں۔ میں اور پھر وہی طوفان
کی دیدبازی ایک خیال تو یہ تھا کہ جس قوم کا رزق لہروں پر ہے وہ اگر دنیا پر حکمران نہ ہو تو کیا کرے "آئی
بلا کو ٹال تُو" کی دُعا مانگنے والے بھلا ان کا کیا مقابلہ کریں گے؛ کہاں ایک ذرا سی آندھی کو دیکھ کر کوٹھڑیوں
میں گھُس کر "جل تُو جلال تُو" کہنے والیاں اور کہاں وہ کہ پاؤں فرش پر جمتا نہیں مگر ناچ ہے کہ جاری ہے
دوسرا خیال یہ تھا کہ اگر سچ بولنا نیکی ہے اور جھُوٹی تہمت لگانا گناہ ہے تو دُنیا میں انسان ہونے سے

زیادہ ذلت اور کوئی نہیں ۔جن اشخاص کی دانش مندی پر بھروسا ہو سکتا تھا وہ بھی یہ کہتے سنائی دیئے "کمبخت طوفان!" "وحشی طوفان"! "جہنمی طوفان"!

ایک نے بھی نہ سوچا کہ طوفان بیچارا نہ اپنے بس میں ہے نہ اس کا کوئی فعل بالارادہ ہے وہ کوئی شخص تو ہے نہیں اس ہوا کا جس پر ہماری زندگی کا مدار ہے ایک حصہ سورج کی غیر مساوی طور پر تقسیم شدہ گرمی کا شکار رہے اگر ہوا کے اس حصہ کو جاندار ہی قرار دینا ہے تو اس کے ساتھ ہمدردی چاہیئے نہ کہ شکوہ اور ملامت ۔مگر انسان صدیوں سے قہر اور غضب کے اتہام لگاتا آیا ہے ۔اس دو ٹانگ والے بندر کو اپنا مرنا جینا اس قدر اہم امور نظر آتے ہیں کہ محض اپنی تسلی کے لیئے اس نے جھوٹ کے ہزارہا جال چاروں طرف پھیلا رکھے ہیں اور پھر چاہتا یہ ہے کہ ان جھوٹ کے جالوں میں رستی کے ہُما کو پھنسا لے ۔طوفان قہر ہے اس لئے قربانی کرو ۔بجلی غضب ہے اس لئے بُت توڑ دو زلزلہ قیامت ہے اس لئے ان انسانوں کی جو تم سے اعتقاد میں مختلف ہیں زندہ کھال اُتار دو۔ یہ ہیں ان حضرت کی کارستانیاں ۔دل کے کانوں میں انگلی دیئے سچ تو سنتا نہیں ۔خود ساختہ افترا کے طومار لگائے چلا جاتا ہے واقعی بہت ذلیل ہے ۔کیا کوئی دن آئے گا کہ بنی نوع انسان کی طرف سے طوفانوں سے بصد عجز گذشتہ اتہام کی معافی مانگی جائے گی اور آیندہ کے لیئے اقرار کیا جائے گا کہ طوفان کو آفت یا قہر کی علامت نہ کہا جائے گا؟

تیسرا خیال یہ تھا کہ گو میرا ملک اس قابل نہیں مگر کاش کہ ہندوستان کی گلی گلی میں طوفان کا گذر ہو۔

میں اس خیال میں تھا اور جہاز دو بڑی لہروں کے درمیانی عمیق غار میں سرنگوں جا رہا تھا ۔یکایک سامنے والی لہر نے زور کر کے اس کو اپنے مضبوط کندھوں پر اٹھایا ۔جہاز کا سامنے کا حصہ اُبھرا گویا ایک مہیب مچھلی پانی میں سے اُچکنے لگی ہے ۔اتنے میں لہر نیچے سے کھسک گئی اور

جہاز تقریباً پچاس ساٹھ فٹ یک لخت گر پڑا۔ اس گرنے سے جو جھٹکا جہاز کے شہتیروں، دروازوں اور دیواروں کو لگا اس کی آواز گو پہلے بہت دفعہ سُن چکے تھے مگر اس دفعہ خاص طور پر دہشت خیز تھی۔ خدا جانے اوروں نے کیا سنا مگر مجھے تو صاف صاف سنائی دیا کہ طوفان نے میرے تینوں خیالوں کا جواب ایک لفظ میں دے دیا۔ شہتیروں، دروازوں، دیواروں کی کرٹ کرٹ ...... کرٹ کرٹ سنائی نہ دی بلکہ صاف یہ سُنا:۔

ارے

او

جاہل

لوئھن جہاز کی تصویر عین اس وقت کی ہے جس کا مضمون میں ذکر ہے۔

نئی تاریکی

ایک صاحب کی نسبت جو مغلستان کا روپیہ حال ہی میں یورپ برباد کر کے آئے ہیں سننے میں آیا ہے کہ اب وہ یہاں کی کسی بات کو پسند ہی نہیں کرتے۔ دراصل وہاں اور یہاں میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ یورپ میں جنگِ عظیم ہو کر کچھ تاجدار معزول ہوتے ہیں تو یہاں بھی کبھی کبھار کسی ممتاز راجہ سے استعفا طلب کر لیا جاتا ہے۔ یورپ میں بڑے بڑے سٹرائیک کر کے حقوق کی نگہداشت کی جاتی ہے تو یہاں بھی گاہے ماہے ایک چھوٹا سا سٹرائیک چند غریب کاریگروں کو بے روزگار بنا دیتا ہے۔ یورپ میں پارلیمنٹیں قوانین بناتی ہیں تو یہاں بھی ناپسندیدہ قوانین کے خلاف اسمبلی تجاویز پاس کر دیتی ہے مانا کہ یہاں تعلیم عام نہیں مگر پڑھے ہوئے کو بھلا دینا تو عام ہے۔ دنیا کے چرچوں میں مغلستان کا اتنا حصہ بھی غنیمت ہے جسے اس سے کچھ زیادہ توقع ہو اُسے بزرگوں کا وہ قول یاد کر لینا چاہیے ؏

طمع را سہ حرف است ہر سہ تہی

روحانی ترقی میں بھی گو مغلستان کا نمبر بہت پیچھے نہیں۔ چند دن کی بات ہے کہ ملیریے اور طاعون کا الزام ایک بیکس بڑھیا مسماۃ تقدیر کے سر تھوپا جاتا تھا۔ اب مسلّمہ طور پر مچھر اور چوہوں کے پسّو مجرم گردانے گئے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ گھروں کی اور دائیوں کی صفائی پر اصرار ہے اور دُنیا کی کل چلانے والے کو اس کے اپنے پُرانے کام میں انسانی تدبیر و تائید سے مدد دی جا رہی ہے۔ اس لئے از روئے انصاف یہی خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ حضرت جن کا ابتدا میں ذکر کیا گیا ہے اعتراض کرنے میں حق بجانب نہیں۔ مشکل یہ ہے کہ یہ صاحب بجائے اس کے کہ اپنے خیالات کو حسبِ دستور ایک مطبوعہ

سفرنامے میں پیش کر کے نقادانِ معاشرت کو موقع دیتے کہ وہ حب الوطنی کا ثبوت دیں۔ ایک نئی طرزِ تحریر کے بانی ہونے کے خواہشمند ہیں یعنی اس طرح کہ ان کا ایک قلمی رسالہ جس کا نام نئی تاریکی ہے علم دوست طبقوں میں چکر لگا رہا ہے۔ اس رسالہ میں کسی خاص مبحث پر مدلل تحریر نہیں بلکہ جرمن فلاسفر نٹیشا کی طرز میں مختلف مضامین پر مختصر نوٹ ہیں جن میں سے چند نوٹ ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:۔

"عقاید شماری کا لب لباب یہ ہے کہ جن کے پاس زر نہیں، زور نہیں اُن کے پاس خدا ہے اور جن کے پاس زر زور دونوں ہیں وہ خود خدا ہیں۔ اور سطحی یا حقیقی مساوات سے دونوں فریق اپنی اپنی جگہ خوش ہیں"۔

"مذہبستان میں خوشی حرام ہے"۔

"امرت سری اور کشمیری قالینیں یورپ اور امریکہ میں بہت خریدی جاتی ہیں۔ پاؤں پڑنے میں مفلستان لاثانی ہے"۔

"وہ کارخانہ جس میں امریکا کے ڈالر لوٹنے کے لئے سوامی اور مولوی بنانے کی مشین چل رہی ہے جلدی بند ہو جائے گا۔ سوامی اور مولوی دونوں دروغ بافی میں پورے ماہر ثابت نہیں ہوئے۔

"امریکہ بہت بڑا کارساز ہے۔ ایشیائی شاعر کی پیش گوئی

کارسازِ ما بفکرِ کارِ ماست

اب پوری ہوئی ہے۔ کیا اس شاعر کو موٹر کار کا علم تھا؟"

"جس ملک میں موت کے بعد آرزوئیں پوری ہونے کی آرزو ہو وہاں زندگی موت ہے شانتی کی شراب کا نشہ جدوجہد کی ترشی اتار سکتی ہے مگر وہ غفلت کی بھنگ جو آج کی خوشی کل پر ڈال دے سم قاتل ہے۔"

"دُنیا کے ہر چڑیا گھر میں اجازت ہے کہ تماشائی خوبصورت چڑیا کی تعریف کرے مگر ایک وسیع جانور خانہ ایسا بھی ہے جہاں حسینہ کو اس کا دل خوش کرنے کے لئے حسینہ کہنا، اس کی اداؤں کی اس کے لباس کی داد دینا اور داد دے کر اس کی حوصلہ افزائی کرنا کہ وہ اس منحوس جانورستان کی نحوست کو کچھ کم کرے ممنوع ہے۔ اس وحشستان میں اعترافِ حسن کے متعلق ایک ہی قانون ہے

نہ دیکھو نہ دکھاؤ۔ نہ سنو نہ کہو

زندگی نفی کی چار زنجیروں میں مقید ہے۔"

مزید اقتباسات کی ضرورت نہیں۔ متذکرہ بالا نقل کردہ اقوال میں سے جس قول پر بھی غور کیا جائے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ صاحب تحریر کو ایشیائی طرزِ معاشرت سے عناد ہے۔ مثلاً اس آخری نوٹ پر غور کرنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مصنف کا منشاء یہ ہے کہ اگر موقع ملے تو ہر شخص کو حق حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ نیک نیتی سے اپنی منکوحہ کے علاوہ بھی صنفِ نازک کی بہاءِ حسن کی کھلم کھلا داد دے گویا حسین بننے کی کوشش کو اعمالِ حسنہ میں نمبر اول جگہ دی جائے اور سوسائٹی رفتہ رفتہ یہ رنگ اختیار کرے کہ بیویاں بجائے نیک بننے کی کوشش کرنے کے حسینہ بننے کی کوشش کریں مگر کون نہیں جانتا کہ اس قسم کے انقلابی مسائل ایشیائی تہذیب کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیں گے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ

ایشیائی عقاید خود نمائی کو بدترین عیوب میں شمار کرتے ہیں۔ اسی لحاظ سے ایشیا جتنی بھی کوشش حسن کا قلع قمع کرنے میں کرے وہ کم ہے بلکہ اگر اس مضمون کے بیجد طولانی ہو جانے کا خوف نہ ہوتا تو یہ ثابت کرنا کچھ دشوار نہیں کہ تمام ایشیائی تواریخ کی کلید ایک جملہ میں ہے اور وہ یہ ہے:۔

"حسن کو جہاں دیکھو مٹاؤ"

یہی وجہ ہے کہ اچھے اچھے مندروں میں گوبر کا استعمال کیا جاتا تھا اور اچھی اچھی مسجدوں میں نیلے تہمد برا جتے تھے۔ اس ضرورت نے ایشیائی مجددوں کو مجبور کیا کہ گو دراصل حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن میں کوئی فرق نہیں مگر مصنوعی طور پر اس فرق کو ایسا استوار قائم کر دیا جائے کہ جب تک ایک بھی حقیقی ایشیائی زندہ رہے وہ کبھی حسنِ صورت کو فروغ پانے نہ دے باقی اقوال پر مفصل تبصرہ کی ضرورت نہیں مگر مثال کے طور پر "آج کی خوشی کل پر نہ ڈالو" والے مسئلہ پر اگر غور کیا جائے تو کیا نتیجہ نکلتا ہے؛ یہی کہ روزانہ زندگی کے بجائے خود بھی کچھ معنی ہیں اور یہ ایک آنے والی زندگی کے لئے محض تیاری نہیں ہے۔ اس قسم کے مخربِ اخلاق مجربات پر خامہ فرسائی عبث ہے۔ روز روز خوش رہنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ ماہرانِ روحانیت ایک دفعہ نہیں ہزار دفعہ ثابت کر چکے ہیں کہ گریۂ نیم شبی انسانی زندگی کی معراج ہے اور جسے اس طرف بڑھنا ہو وہ جلے اور جلائے روئے اور رُلائے۔

اصل واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ غلط انگریزی تعلیم کے باعث بعض لوگوں کے دلوں میں یہ بیہودہ خیال جاگزین ہو گیا ہے کہ ہم لوگ در اصل اپنے لئے زندہ ہیں۔ اس نئے الحاد کا حکمی علاج یہی ہے کہ ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا جائے کہ ہرگز ہرگز ہم لوگ اپنے لئے زندہ نہیں بلکہ ہم اپنے بزرگوں کے لئے زندہ ہیں۔ یہ امر بالکل الگ ہے کہ نہ اُن کو ہماری ضرورت ہے اور نہ اُن کو ہمارا پتہ ہے۔ نہ انہیں کچھ ہماری پروا تھی۔

عشق

ہر انسان کا اولین اور اعلیٰ ترین فرض یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو چاہے وہ کچھ بھی نہ ہو یا اس سے بھی کم ہو، ایک کامل خدا رسیدہ ظاہر کرے۔ یہ جھوٹ بعض دفعہ سچ ہو جایا کرتا ہے۔ خود میرے دیکھتے دیکھتے کئی وہ جو محض زبان کے صوفی تھے آخر کار کسی حد تک نگاہ کے اور کسی بے معلوم حد تک دل کے صوفی بن گئے۔ جو لوگ عبادت کو اچھا خیال کرتے ہیں اُن سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ بسا اوقات محض دکھلاوے کی عبادت آخر کار حضورِ قلب والی عبادت کے درجے کو پہنچ گئی۔ علاوہ ازیں بغاوت کے زندگی کی بنیاد زیادہ تر دھوکے پر ہے اور جو شخص اپنے آپ کو نیک ہونے کا دھوکا نہیں دیتا وہ بڑے اور مہلک دھوکے میں گرفتار رہے۔ اس فرض کی ادائیگی میں راقم سطور بھی عرصہ سے مبتلا ہے نیز بانی زبانی مدت ہوئی کہ اچھے اور بُرے کی سرحد سے گزر چکا بلکہ اب تو وہ بچپن کا جغرافیہ جس میں نیک و بد کے بر اعظم تھے بالکل محو ہو چکا ہے۔ وہ کاسۂ گدائی بھی جس کا نام صوفیا نے تسلیم رکھا ہے عرصہ سے ٹوٹ چکا۔ اپنے آپ کو ایک، کے ساتھ ایک ہو کر اتنی دفعہ محویت کا عالم طاری دیکھا ہے کہ وہ پھٹی پرانی گدڑی جس کا نام عرفان ہے اب میرے کسی کام کی نہیں کیونکہ دنیا اور دنیا کے ساتھ عاقبت سدھار چکیں مگر

اس کے بال، اس کی آنکھیں!!

ہر انسان کا کم ۔۔۔ کم حق یہ ہے کہ ایک پوری مکمل کائنات ازل سے ابد تک محض اس کی مرضی کے تابع ہو۔ بدترین کفر یہ ہے کہ انسان کو انسان ہی رہنا ہے خدا نہیں بننا۔ کیونکہ اس اعتقاد میں دوئی کی جھلک ہے۔ وہ سچا حقیقی خدا جو بشر کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ کیا وہ اتنا عاجز ہے یا کمزور ہے کہ باوجود

کوشش کیے لگاتار کوشش کے ہم سے ملنے میں کامیاب نہیں ہو گا؛ ہرگز نہیں۔ وہ ضرور ملے گا مگر ملے گا تو کس سے؛ انسان سے؛ ہرگز نہیں۔ خدا خدا سے ہی ملتا ہے۔ اور اس لئے ہر انسان کا یہ حق ضرور پورا ہو گا۔ وہ فرض، یہ حق مگر ہائے

اس کی آنکھیں اس کے بال!!

پیاری کیا تجھے یاد ہے کہ ایک شام ایک آنکھوں والی نے تیری آنکھوں کی تعریف کی تھی۔ وہ سچ جو خدا کے لئے میں ہرگز بولنے کے لئے تیار نہیں ہوں تیری آنکھوں کے تصدق ضرور میرے قلم سے نکلے گا۔ تو نے مجھے دیکھا ہے میں نے خدا کو نہیں دیکھا۔ سچ تیرے لئے ہے جھوٹ جس قدر بول سکوں گا خدا کے لئے ان خیالوں میں تھا کہ وہ احسان کی پری، نیند، جو مجھے بہت کم ممنون کرتی ہے۔ آئی، چھائی۔ میں سو گیا۔ خواب میں میرا حق مجھے ملا یعنی ازل سے ابد تک مکمل کائنات میری مرضی کے تابع ہو گئی کس قدر جلدی اس کائنات کو تیرے لئے میں نے آراستہ کیا۔ سوائے تیرے ماں باپ کے اور ہر ایک چیز کو شروع سے اس طرح بدل ڈالا کہ چمن کا پتہ پتہ تیرے آنے کی خوشخبری دینے کو اپنا نصب العین سمجھے ستارے تیرے لئے چمکے، بادل تیرے لئے برسے، ہوائیں تیرے لئے چلیں، وہ تمام کام جو ایک بے پروا خدا سے پورے نہ ہوتے تھے وہ ایک ایک کر کے تکمیل کو پہنچائے تاکہ دُنیا تیرے لائق بنے۔ اس کائنات سے جس کا کہ میں خالق تھا مجھے سوائے ایک چیز کے اور کچھ درکار نہ تھا۔ وہ چیز کیا تھی؛ صرف یاد۔ تیری شرمگین آنکھوں کی محجوب محبوب نگاہوں کی یاد۔ اسی یاد کو میں نے کس قدر پیار سے دل میں سجایا تجھے کیا پتہ؛ صرف اتنا سُن لے او خدا ساز آنکھوں والی تیرا بھلا ہو۔ یہ یاد کی دولت اپنے لئے وقف کر کے اس کائنات کو پھر نہیں دیکھا۔ سب کچھ تیرے لائق بن چکا تھا مگر ایک نقص باقی تھا۔ وہ میں تھا۔ خدا ہو کر بھی ان آنکھوں کے قابل نہ بنا مگر دیکھ عشق کا کرشمہ۔ چونکہ میرے ہونے سے کائنات تیرے قابل نہ تھی آنکھ نہ کھلی اور میں مر گیا۔

اب تو خیر محض ایک قصّۂ باطل ہُوں۔ مگر وہ دِن بھی تھے جب کہ میں خود اپنے لئے ایک کافی دلچسپ فسانہ تھا۔ اچھے دِلوں میں میری محبّت تھی۔ خط آتے تھے جواب نہ جاتے تھے۔ دل یہ کہتا رہا کہ عارضی بیتاب محبت کے خراج سے آرزوؤں کو مالا مال کرلو۔ مگر عقل کمبخت ہمیشہ دھوکا دیا کی اور آخر اِس دشمن جاں نے کہیں کا نہ رکھا۔ غالب مرحوم کی طرح ناکردہ گناہوں کی حسرتوں کا دفتر داورِ محشر کے سامنے کھولونگا اگر اس نے انصاف کیا تو میرے لئے ایک نئی دُنیا بنا دے گا۔ اور اگر یہ توقع بھی اُٹھ گئی۔ تو پھر

کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

گلہ! گلہ!! گلہ!!! بہت لوگوں کا خیال ہے کہ گِلہ شخصی ہوتا ہے یعنی زید کو کچھ کرنا چاہئے تھا اور اس نے نہیں کیا درحالیکہ عمرو کو بجا توقع تھی کہ زید ضرور ایسا کرے گا اور ایسی صُورت میں عمرو زید کا گِلہ کرنے میں راستی پر ہوتا ہے حضرت اقبال کی نظم شکوہ بھی "مسلم" کی جانب سے خدا پر ایک ذاتی گلہ ہے۔ غالب مرحوم کے مفصلہ ذیل شعر کی تفسیر ہے۔

آج کیوں اپنے اسیروں کی نہیں پروا تجھے
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

مگر میرا گِلہ ذاتی یا شخصی گِلہ نہیں اور اس کی مختصر سوانح عمری یہ ہے :-

میز پر کھانا کھانے والے ہم تین تھے میں جس کی زبان بند تھی، وہ جس کے بال کھلے تھے اور تیسرا وہ شخص جس کو اس گِلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ بال بار بار گُل رخسار کی طرف جھکتے تھے اور نازک

گوری انگلیاں انہیں ہٹاتی تھیں۔ میری کیا مجال تھی کہ رموزِ مملکت میں دخل دیتا، گو کالا ہونے کی حیثیت سے میری ہمدردی بالوں کے ساتھ تھی اور جی چاہتا تھا کہ یہ ایشیائی بلا روک ٹوک یورپ پر پھیلیں مگر میری کامیاب بزدلی ان انگلیوں کی دست درازی پر خاموش رہی۔ یعنی میری لامذہبی کی انتہا ہوگئی کیونکہ میرا دلی عقیدہ یہ ہے کہ خدا سب گناہ بخش دے گا مگر اس خاموش زبان کو ضرور فی النار کرے گا جو حسن کے دربار میں مدح سرائی نہ کرے۔ اور اس لئے میرا گلہ یہ ہے کہ کیوں اخلاقاً اس ملک میں حسن پرستی کا اظہار ممنوع ہے۔ ہزاروں عبادت کے موقعے ملے، یعنی یہ کہ کسی کی آنکھ کی، کسی کی ادا کی، کسی کی چال کی رو در رو داد دی جاتی، مگر ہمیشہ اس ملک کی اُلٹی تہذیب اور اپنی اندھی عقل مانع رہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں پیدا ہونا موت ہے۔ پیدا ہو کر زندہ رہنا عذاب بعد مرگ ہے۔ زندہ رہ کر اپنی مجبوریوں معذوریوں کو سمجھنا اور بے بسی سے کچھ نہ کر سکنا ہے۔ زندہ رہ کر اپنی مجبوریوں معذوریوں کو سمجھنا اور بے بسی سے کچھ نہ کر سکنا جہنم ہے۔ خدا کرے یہاں کوئی بچہ پیدا نہ ہو اور اگر پیدا ہو تو زندہ نہ رہے۔ اور اگر اس بدبخت کو زندہ بھی رہنا ہو تو خدا اسے ذکی الحس ہونے کے جہنم سے بچائے۔ یہ ملک بیجا ۔۔۔ خود گذار ہے مگر کس کا؟ اور کس پر؟

ناہید

پیارے دوست! کیوں مجھ ناتوان پر تقاضوں کے تیر برساتے ہو؟ مجھے اپنی لاغر زندگی میں صرف چند حسرتیں جمع کرنے کا موقع ملا ہے۔ اور گو مجھ نادار کی کٹیا میں بیر بہوٹیاں بھی پریاں ہیں۔ مگر دنیا انہیں دیکھے گی تو جو وہ ہیں وہی کہے گی۔ تقاضا کرو اُن فربہ معتبر شخصیتوں سے جن کے چرچے ہیں، جن کے محلوں کی ہوا شبانہ رقص سے پامال ہے جن کی جیبوں سے زندگی چھن چھن کرتی ہوئی اُچھلتی ہے۔ نہ مجھ سے جس کی زندگی محض زندگی کی آرزو ہو۔ میرے شعلے صرف میرے اپنے لئے ہیں، دنیا کے لئے

شرارم سنگ شد از کلفتِ صبر آزمائیہا

مجھ پر رحم نہیں کرتے تو اپنے رسالے کے پڑھنے والوں کی ادبی توقعات کا احترام تو کرو۔

تمہارا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دوست! تم یہ اپنا بوسیدہ فلسفہ رہنے دو۔ ظالم! تمہیں پتہ تو ہے کہ میری ردّی کی ٹوکری آباد ہے۔ اور انتخاب کا بکس خالی۔ اس پر تمہاری طرف سے یہ لیت و لعل! اور کچھ نہیں تو علّو والے ماجرے کو نام بدل کر لکھ ڈالو، اتنا بہت دلچسپ تو نہیں مگر چونکہ امر واقع ہے۔ کئی اخبار زدہ شوق سے پڑھ لیں گے۔ [illegible] عبارت میں خود درست کر لوں گا۔

تمہارا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پیارے دوست! سبحان اللہ کیا فرمائش کی ہے؛ تمہارے عامیانہ مذاق کی کوئی حد بھی ہے؛ اور کیا میں ایسا غدّار ہوں کہ اپنے عزیز ترین دوست علّو اور اس کی بیوی ناہید کا حال شائع کردوں اور اس میں بات کیا ہے؛

ہزار آرزوؤں سے شادی ہوئی، دو ایک سال ایک دوسرے کے پروانہ وار عاشق رہے مگر ناہید کی کافی سے زیادہ جائداد جب علّو صاحب کی ناتجربہ کاری پر نثار ہو چکی تو رخنہ اندازوں نے چپکے ہی چپکے لگانے بجھانے سے اُدھر علّو کو ادھر ناہید کے بھائی کو ایک دوسرے سے وہ برگشتہ کیا کہ ناہید کے لئے زندگی جہنّم ہوگئی۔ وہ تو اس پر بھی نہ بدلی۔ ریشم سے ململ پر اور سونے سے کانچ پر آ اُتری۔ مگر واہ ری ناہید کیا مجال کہ علّو کو کبھی کنایتاً بھی جتلایا ہو کہ بُرا ہوا۔ دنیا مگر کب چھوڑتی ہے۔ بہن، بھائی کو لڑوا دیا۔ بھائی کو سکھلایا گیا کہ ناہید کو مجبور کرے کہ وہ علّو کے کان کھینچے۔ ناہید کو جایداد کی تباہی کا قلق کچھ بھی نہ تھا مگر سگے ماں جائے کو کہنا کہ مجھے تباہ ہونے دو تم دخل مت دو، زہر کھانے کے برابر تھا۔ وہ اس پر بھی تیار ہوگئی۔ جب علّو کو اُس باوفا کے اِس فیصلے کا علم ہوا تو آپ کی آنکھیں کھلیں مگر کیا خاک کھلیں۔ آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ خود بدولت ناہید جیسی فرشتہ خصلت کے شوہر ہونے کے قابل نہیں اور جدید فلسفۂ زندگی کی تعمیل میں آپ نے خودکشی کرنے کا مصمّم ارادہ کر لیا۔ ڈوب کر مر جانے سے انہیں نفرت تھی، اور پستول آپ کے پاس تھا نہیں۔ روشنیِ طبع یوں چمکی کہ پستول چرایا جائے۔ اور یہ خیال اس قدر مُستحکم ہوا کہ کئی سَو تدبیروں کے رد کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ سب سے آسان طریقہ پستول چُرانے کا یہ ہے کہ کسی فوجی افسر کے بہرے بن جائیں اور موقع ملے تو پستول اُڑا لیں۔ اس عزم سے آپ پشاور جا نکلے اور سچ مچ ایک کرنیل کے خدمت گار بن گئے چند ہی دن میں وہ اعتبار جمایا کہ کرنیل کو کسی طرح کا شبہ نہ رہا۔ اور کرنیل صاحب مع خدمت گار شکار کو نکلے۔ علّو کرنیل صاحب کے خیمے کو پوری طرح بند کرنے کے بہانے سے عین اس وقت خیمہ سے

نکلا جب اس نے دیکھ لیا کہ کرنیل نے پستول بھر کر بستر کے نیچے رکھ لیا ہے۔ علّو نے دو ایک گھنٹے تو انتظار کیا اور پھر دبے پاؤں اپنی چھولداری سے نکل کر چپکے سے خیمہ کا پردہ کھول کر اندر گھسا۔ کیا دیکھتا ہے کہ دو غیر علاقہ کے پٹھان کرنیل کی رائفل کا بکس سنبھالے پہلو والی قنات کے نیچے سے نکلنے کو تیار ہیں۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جست کر کے ان دونوں کے اوپر گرا۔ بکس تو ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا مگر وہ کھسک گئے۔ ابھی علّو اُٹھا بھی نہ تھا کہ کرنیل نے خیمہ سے نکل کر دو فیر کئے مگر اندھیرے کے باعث وہ پٹھان صاف بچ گئے۔ اس کے بعد کرنیل خیمہ میں داخل ہُوا اور بجلی کی دستی مشعل کی شعاع علّو پر ڈال کر اور پستول اس کی طرف سیدھا کر کے ذرا درشتی کے لہجے میں کہنے لگا:-

کرنیل۔ سچ سچ بولو۔ مگر پہلے یہ سمجھ لو کہ ہم فوجی کبھی بے خبر نہیں ہوتے۔ مجھے چوروں کے آنے کی بھی خبر ہے تمہارے آنے کی بھی خبر ہے۔ میں اس تاک میں تھا کہ چور نکلنے والے ہوں تو فیر کروں۔ بولو تم کیسے خیمے میں آئے؟

علّو۔ (ایک آدھ منٹ سوچنے کے بعد) میں آپ کا پستول چرانے آیا تھا کیونکہ میں خودکشی کرنا چاہتا تھا۔

کرنیل۔ (خودکشی کیوں کرنا چاہتے تھے؟

علّو۔ آپ کو اس سوال کے پوچھنے کا کوئی حق نہیں۔

کرنیل۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ واقعی مجھے کوئی حق نہیں۔ مگر تم مجھے اجازت دو کہ میں تم سے یہ سوال پوچھوں (پستول کو جھٹکا کر اور خالی کرتے ہوئے) یہ سوال ایک شریف آدمی دوسرے شریف آدمی سے پوچھنا چاہتا ہے۔

علّو نے جب کچھ جواب نہ دیا تو کرنیل نے پستول خالی کر کے رکھ دیا۔ اور پھر پلنگ پر اطمینان سے بیٹھ کر کہا۔

کرنیل۔ کیا مسٹر علاؤ الدین کرسی پر بیٹھ کر مجھ سے بات کرنا پسند کریں گے؟

علّو۔ (گھبرا کر بیٹھ کر) آپ کو میرے نام کا پتہ کیونکر ہے؟

کرنیل۔ جب آپ نے میرے پاس نوکری کی التجا کی اور یہ کہا کہ چٹھی کوئی نہیں تو میں اُسی وقت سمجھ گیا تھا کہ اس قطع وضع کے آدمی کے لئے نوکری کی تلاش کسی مصیبت کے باعث سے ہے۔ چنانچہ آپ سے میں نے والد کا نام دریافت کیا اور شہر۔ مجھے یقین تھا کہ والد کا نام آپ غلط نہیں بتائیں گے اتفاق سے شہر بھی آپ نے صحیح بتا دیا۔ وہاں کے ڈپٹی کمشنر سے گو وہ میرا ذاتی واقف نہ تھا آپ کے والد کا نام لکھ کر حالات دریافت کئے معلوم ہوا کہ آپ نجیب خاندان سے ہیں۔ مگر کسی خانگی کشمکش اور مالی نقصان کے باعث کچھ عرصے سے شہر سے غائب ہیں۔ یہ اطلاع مجھے کل ملی۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا مجھے ضلع کے افسر کو اطلاع دینی چاہئے؛ غالباً میرا فیصلہ یہی ہوتا کہ اطلاع نہیں دینی چاہئے۔ مگر اب یہ واقعہ پیش آگیا۔

علّو۔ آپ کو صحیح خبر ملی۔

کرنیل۔ شاید آپ کو علم ہو کہ آپ کے والد اور میرے چچا کے کچھ تعلقات تھے۔

علّو۔ میرے والد کے دوست کا نام تو کرنیل ہوورڈ تھا اور آپ کا نام ہوورڈ مرے ہے۔

کرنیل۔ مجھے اپنے نانا کا نام اختیار کرنا پڑا۔ ورنہ کرنیل ہوورڈ میرے والد کے بھائی تھے۔

قصّہ مختصر یہ کہ کرنیل ہوورڈ مرے نے علّو صاحب کو کمسریٹ کے ایسے نفع والے ٹھیکے دیئے کہ علّو اب لاکھوں کے پھیر میں ہیں۔ مگر جب یہ ٹھیکہ دار صاحب دو سال کے بعد پہلی دفعہ گھر وارد ہوئے تو باوجود اس کے کہ انہوں نے ناہید کے پاؤں پر سر رکھا۔ ناہید اُن سے بگڑی رہی۔ علّو کے لئے وہ چند دن قیامت کی گھڑیاں تھیں۔ مگر ناہید آخر میری تدبیر سے رام ہوئی۔ اُسے غصّہ یہ تھا کہ اگر علّو کو خودکشی کرنی ہی تھی تو پہلے مجھے مارتا۔ اُس کے غم میں گھُل گھُل کر مرنے سے اُس کے ہاتھ سے مرنا بہتر ہوتا۔ وہ یہ بھی کہتی تھی کہ جس شخص کے لئے سگے بھائی سے بگاڑی اُس شخص پر کیا اتنا حق بھی مجھے نہ تھا کہ وہ مجھے اپنے دل

کا راز بتاتا ؛ اُس کا غصہ حق بجانب تھا۔ مگر ادھر علو کا یہ حال تھا کہ ناہید کی ناراضگی میں وہ منٹ منٹ میں سو سو دفعہ مرتا۔ ان دونوں عاشق معشوق کو بن موت مرتے ہوئے مجھ سے دیکھا نہ جاتا تھا اور مجھے ایک تجویز سُوجھ گئی۔ ایک شام بصد منت ناہید کو کھانے پر بلوایا۔ اور اپنی بیوی کے روبرو حالانکہ وہ علو کی رشتہ میں بہن تھی اور اس معاملہ میں علو کی طرفدار تھی۔ بندے نے علو کی وہ بد تعریفی شروع کی کہ ناہید کا ایک رنگ آئے ایک جائے۔ آخر اُس نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور جھنجھلا کر مجھے مخاطب کر کے کہنے لگی۔

ناہید۔ میں سمجھتی تھی کہ علو ہی خود پسند ہے مگر وہ اتنا کمینہ نہیں جتنے کہ تم ہو۔ اُس نے کبھی بھی کسی دوست کو بُرے لفظوں سے یاد نہیں کیا۔ یہاں تک کہ میرے بھائی سے بگاڑ رہا مگر بُرا لفظ اُس نے کبھی کوئی استعمال نہ کیا۔ اگر علو نے دل دکھایا ہے تو میرا دکھایا ہے۔ تم اُسے بُرا کہنے والے کون ؛ مجھے تمہارے گھر سے کھانا کھانا زہر ہے۔

یہ کہہ کر وہ غصہ میں بھری اُٹھی اور زار زار رونے لگی۔ اُدھر پردے کے پیچھے سے علو جن کو پہلے ہی وہاں چھپا دیا گیا تھا نمودار ہوا اور آتے ہی اُس نے ناہید کو اُٹھا لیا۔ عشق وہ بلائے بد ہے کہ ان بے حیاؤں کو ہمارے سامنے پیار کرتے شرم نہ آئی۔ اور میرا شکریہ ادا کئے بغیر علو صاحب ناہید کو گود میں اُٹھائے چل دیئے۔

بھلے آدمی سوچو تو سہی یہ واقعہ ہی کیا ہے کہ اسے کوئی اہل قلم کسی مقبول رسالے کے لئے سجا کر پیش کرے۔ محض چند غلطیاں، چند غلط فہمیاں اور تھوڑی سی میری نفسیات سے واقفیت پر مبنی چالبازی۔ میں جانتا تھا کہ اگر کوئی علو کا دوست ناہید کے سامنے علو کو صلواتیں سنائے گا تو ناہید کی دبی ہوئی عشق کی آگ از سر نو بھڑک اُٹھے گی۔ اس معاملے میں سب سے بہتر میرا acting تھا۔ ناہید بھولی بھالی کو یقین ہو گیا کہ میں سچے دل سے علو کو حقارت آمیز لفظوں سے یاد کر رہا تھا مگر اچھی کہانی انگریزی Plot

کی طرح کاریگری کی محتاج ہے یعنی اس طرح کہ درمیان میں تو وہی ایک بھُنی بوٹی ہو مگر ادھر اُدھر ساگ کی سبزی، چقندر کی سُرخی اور انڈے کی سلیقہ سے کٹی ہوئی سفیدی زردی اس بھنی بوٹی کو نگاہ کے لئے اور نگاہ کے ذریعہ اشتہا کے لئے اِس قدر دلفریب بنادے کہ وہ بوٹی صرف غذا نہ رہے بلکہ بجائے خود صنعت کا نمونہ بن جائے۔ اس واقعے میں آندھی کیسے چلاؤں، بجلی کیونکر گرجے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مکالمے میں حاضر جوابی کے جو کرشمے ہوتے ہیں وہ اس میں کیسے کھپ سکیں۔ مگر تم اِن باتوں کو کیا جانو اور کیا سمجھو!

تمہارا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دوست! تم اپنی اُمید سے بڑھ کر اس واقعے کا خون کرنے میں کامیاب ہوئے ہو۔ مجھے اب پتہ چلا کہ تمہیں وہ چند اُلٹی سیدھی ترکیبیں جو آج کل کے بعض رسائل کو مقبول بنا رہی ہیں ضرور از بر ہیں۔ مگر واقعات کا شاعرانہ موازنہ کرنے سے تم اپنی طبعی نثریت سے مجبور ہو۔ اس کا تم اللہ میاں سے وقتِ فرصت گلہ کر لینا۔ مجھے فی الحال وہ واقعہ لکھ بھیجو۔ جو دوسرے دن تمہارے اور ناہید کے درمیان علو کے روبرو ہوا۔ کوئی کہتا تھا کہ ناہید نے تم سے معافی مانگی اور تمہیں گلے لگا کر پیار کیا۔ کیا بات تھی؟ اگر کوئی صاحبِ تخیئل اہلِ قلم مل گیا تو اُس سے استدعا کروں گا کہ جن واقعات کو تم نے اس بے دردی سے چکنا چور کیا ہے اُن میں وہ ادبی شان پیدا کردے۔

دوست۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر ہمارے ملک میں کوئی ادبی کورٹ مارشل ہوتا۔ تمہارا نام تو شاید کسی طرح علمی دُنیا میں نہ آتا مگر کورٹ مارشل کے تذکرے پر تنقید نویس کس لطف سے اس شہادت کا ذکر کرتے جو تمہارے برخلاف گزرتی۔

میں ہوں ایک گھامڑ کا دوست

پیارے دوست! تم کچھ ہی بکا کرو مگر میری طرف سے ہرگز تمہیں اجازت نہیں کہ علاؤالدین والے واقعات کا تم کوئی استعمال بھی کرو جس قسم کے مبتدی تمہارے زیرِ اثر ہیں اُن کے قلمی داؤ پیچ سے میں خوب واقف ہوں۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ جب سے تم سے خط دکتابت کا سلسلہ شروع ہوا ہے میں خود محسوس کرتا ہوں کہ میرا کورٹ مارشل ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ تمہارا رسالہ اور تمہارے خط بن پڑھے جلا دینے کے پڑھتا بھی ہوں اور پھاڑتا بھی نہیں۔

تمہارا۔ ۔ ۔ ۔

دوست! تمہاری اور تمہاری ممانعت دونوں کی ایسی تیسی۔ تمہارا اپنا قول ہے کہ ایڈیٹر ہونا اور ایماندار ہونا دو متضاد باتیں ہیں۔ اگر تم نے مجھے وہ ناہید کے پیار والا واقعہ بلا کم وکاست بالکل راست راست نہ لکھا تو میں اپنے رسالے میں مفصلہ ذیل نوٹ شائع کردوں گا۔

نئی تہذیب اور ایک مشہور گھرانہ

جن نئی اخلاقی آندھیوں نے آج کل مغربی ممالک میں سوشل تعلقات کے مطلع کو غبار آلود کر رکھا ہے وہ اس پُرانے شہر میں بھی زور شور سے چلنے لگی ہیں۔ یورپ میں تو صرف عین نکاح کے بعد دولہا کے عزیزترین دوست کو حق ہوتا ہے کہ وہ نئی دلہن کے ہونٹوں سے ہونٹ رگڑ کر سرخروئی حاصل کرے مگر ہمارے شہر کے آزیبل فیشنیبلوں نے اس میں اتنی ترمیم اور کرلی ہے کہ جہاں کہیں میاں بیوی میں بگاڑ ہوا فوراً کسی دوست نے بیچ بچاؤ کرکے نئے سرے سے شادی رچادی اور اس حق الخدمت میں اس نئی پرانی دُلہن کو خوب دل کھول کر اُس نئے پُرانے میاں کے سامنے پیار کرلیا۔ ہمیں معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ اس تازہ بتازہ نو بنو کے موجد ہمارے شہر کے ایک بزعم خود مشہور اہلِ قلم مسٹر ڈیش ہیں اور اُن کے معاون مسٹر Aleh ہیں جن کا ہندوستانی نام ہم معلوم نہیں کرسکے گو مسٹر Aleh یورپین صحبت سے فیض یاب ضرور ہوئے

ہیں مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اُن کی بیگم صاحبہ نے کس طرح ایشیائی تہذیب سے عدم تعاون کی روش اختیار کر لی۔ دُنیا منتظر رہے گی کہ مسٹر بزعم خود مشہور کے ہاں کس دن چپقلش ہوتی ہے اور کیا اُس دن باہمی مصالحت کے لئے مسٹر گاندھی کی خدمات طلب کی جائیں گی۔ یا اس تازہ بتازہ نو بنو کے حلقۂ تقدیس میں اور لوگوں کو شامل ہونے کا موقع دیا جائے گا۔ کیوں دوست۔ کیا تم اس تحریر کا شائع ہونا پسند کرو گے؟ واللہ باللہ میں ضرور شائع کر دوں گا۔

تمہارا . . . . .

پیارے دیوانے! اگر یہ تحریر تم شائع کرو گے تو اس کا جواب علّو کے بوٹ تمہاری کھوپری پر تصنیف کریں گے۔ میں اس تمام خط و کتابت کی نقل علّو کو روانہ کر رہا ہوں۔

تمہارا . . . . .

ڈیر علّو۔ ملفوفہ نقولہائے خطوط کو وقتِ فرصت دیکھ لینا۔ مجھے یقین ہے کہ میرا ایڈیٹر دوست محض مذاق کے مرض میں مبتلا ہے۔ ورنہ کجا وہ کجا دل آزاری۔ بہرحال تمہیں بے خبر رکھنا مناسب نہیں۔

تمہارا . . . .

علّو کی طرف سے جواب

ڈیر ڈیش۔ ناہید تمہارے اور تمہارے ایڈیٹر دوست کے خطوط کی نقول پڑھ کر ہنستے ہنستے لوٹ گئی۔ وہ اصرار کرتی ہے کہ یہ خط اور جو حاشیہ اُس نے چڑھایا ہے وہ سب ضرور شائع ہوں اور فوراً شائع ہوں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک دفعہ تم نے ناہید کے سامنے یہ دعویٰ کیا تھا کہ غازی کمال پاشا جہاں تک آزاد خیالی کا تعلق ہے تمہارے سامنے طفلِ مکتب ہے۔ ناہید کہتی ہے کہ اگر آزاد خیال مرد ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے

کہ تم ہو تو تمہارا فطرتی حق ہے کہ تم اپنے لئے چوڑیاں بنواؤ اور برقع پہنو۔ مردِ خدا تم صرف اس بات سے ڈر گئے کہ ناہید جیسی باوفا پر تہمت تراشی گئی یا تہمت تراشنے کی دھمکی دی گئی۔ کیا تمہیں اتنا بھی پتہ نہیں کہ زمانے کے تغیر سے ناہید کیا ایسی سینکڑوں پر تہمتیں عائد ہونگی۔ میاں آنکھیں کھولو۔ انگورہ لنڈن، اور کابل انگورہ بن رہا ہے مگر تم انہیں دِلّی کی گلیوں میں گرفتار ہو۔ خدا کے لئے اپنی حالت کو بدلو۔ ناہید کی تحریر حسب ذیل ہے مگر یہ خط تمہیں تب ملے گا جب یہ سب کچھ شائع ہو جائے گا۔

"علّو نے ابھی مجھے بزعم خود مشہور کے اور اُن کے ایڈیٹر دوست کے خط دکھائے ہیں۔ مجھے خیال تھا کہ علّو کے دقیانوسی دوست بزدل عورتوں سے بھی بدتر ہیں۔ مگر آج یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا۔ ایڈیٹر صاحب تو محض شوخیِ تحریر کی خاطر جھوٹ بولنے پر آمادہ ہیں مگر مسٹر ڈلیش میں اتنی بھی ہمت نہیں۔ انہیں یہ بھی ناگوار گزرا کہ کیوں ہم نے ان کے سامنے ایک دوسرے کو پیار کیا۔ لاحول ولاقوۃ اِلا باللہ۔ مزید لطف یہ کہ ان کوڑمغز دلی کی ڈرپوک طبیعتیں تہمت لگانے پر بھی آئیں تو بس اسی قدر کہ ناہید نے علّو کی موجودگی میں مسٹر ڈلیش کو پیار کر لیا۔ کیا اُن کی نگاہوں میں یہ جرم ہے؟ لاحول ولاقوۃ۔ مگر جی چاہتا ہے کہ کاش اُن کا جھوٹ کبھی تو سچ ہو جائے یعنی ہر ہندوستانی خاتون کا یہ حوصلہ ہو کہ عصمت کی غلامی میں زندگی کی جائز خوشیوں کو خواہ مخواہ اپنے پر حرام نہ کرلے مگر اس مشکل مسئلے پر آرزوؤں کا اظہار فی الحال فضول ہے مگر مجھے موجودہ تاریکی کے زمانہ میں بھی یہ کہنے کی جرأت ہے کہ کسی اور مرد کو پیار کرنا جرم ہو یا نہ ہو مگر ہزارہا مثالیں اس وقت ایسی موجود ہیں جن کی نسبت وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ شوہر کو پیار کرنا ضرور جرم ہے گناہ ہے، کفر ہے کیونکہ صنفِ نازک کو مذہب یا رسم کے بہانے سے بند کرنے والے مرد اس قابل نہیں چونکہ میں نہ کسی کے جھوٹ سے ڈرتی ہوں نہ مجھے کسی کے سچ کی پروا ہے۔ اس لئے جو اصل واقعات ہیں ان کو مختصراً لکھ دیتی ہوں۔ علّو سے میرا بگاڑ اس لئے نہ تھا کہ اس نے خودکشی کا ارادہ کیا اور مجھے خبر نہ کی۔ یہ تو میری محض کہنے کی باتیں تھیں۔ اصل بات تو یہ تھی کہ جب دو سال بعد علّو واپس آیا تو اُس نے

مجھ سے بے تکلف گفتگو کی اور مجھ سے معافی مانگی۔ اس بات سے میں جل گئی۔ اُسے چاہئے تو یہ تھا کہ اس طرح ملتا گویا کہ صرف دو منٹ جُدا ہوئے گزرے ہیں۔ اور اُسے یقین ہوتا کہ علّو چاہے دنیا بھر کا نالائق ہو مگر اُسے ناہید سے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ ہر حال میں ناہید کا ہیرو ہے۔ اُس نے جو معافی مانگنے کی حرکت کی تو میں بھی اُس سے اس طرح پیش آئی جس طرح ہندوستانی روٹھ جانے والی خاتونوں کا قاعدہ ہے۔ رُوٹھنا میرے لئے واقعی کسرِ شان تھا مگر کیا کرتی جب خود اپنے ہی مرد کی عقل پر پردہ پڑ جائے اور میں بالارادہ اس وقت تک رُوٹھی رہی جب تک کہ اس نے بلا تکلف مجھے مسٹر ڈلیش کے گھر میں گود میں نہ اُٹھایا مجھے اُسے سبق سکھانا تھا کہ عشق میں تکلّف کفر ہے۔ باقی رہا مسٹر ڈلیش سے پیار کرنے کا قصّہ سو اس میں صرف اسی قدر سچ ہے کہ جب مسٹر ڈلیش سے خلاف عادت زبان درازی کر کے اُن کے گھر سے بلا اجازت رخصت ہوئی تو بعد میں مجھے خیال آیا کہ مجھے تو میرا علّو مل ہی چکا ہے لاؤ مسٹر ڈلیش کے آنسو تو پونچھ دوں۔ دوسرے دن اُن کو بلوایا تو وہ حضرت بھی معافی مانگتے ہوئے وارد ہوئے۔ اس پر مجھے ان کو بنانے کا خوب موقع ملا اور ہماری گفتگو حسب ذیل ہوئی:-

ناہید۔ آپ نے جو کچھ کیا اس نیّت سے کیا کہ علّو کی اور میری صلح صفائی ہو جائے۔ میری یہ غلطی تھی کہ آپ سے ناحق زبان درازی کی۔

مسٹر ڈلیش۔ معافی مانگنے کا حق میرا ہے کہ آپ مہمان تھیں اور مجھ سے آپ کی دل آزاری ہوئی۔

ناہید۔ آپ بڑے ہیں میں چھوٹی ہوں۔ معافی مانگنے کا حق میرا ہے۔

مسٹر ڈلیش۔ اِس میں بڑے اور چھوٹے کا سوال نہیں۔ غلطی کی ابتدا مجھ سے ہوئی۔

جب یہ گفتگو ہو رہی تھی تو ہم دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل سر جھکائے کھڑے تھے۔ علّو کی طبیعت ہمیشہ سے چلبلی ہے اور اُس نے چپکے سے پہلو میں آ کر گردنوں میں ہاتھ دے کر ہم دونوں کے

سر کھجلا دیئے۔ اور اس پر ہم تینوں بے ساختہ ہنس پڑے۔ اور معافی کا ذکر اس قہقہے میں بہ گیا۔ یہ ہے اُس تمام پیار کا قصہ۔ اس کی نسبت جتنا کسی کا جی چاہے جھوٹ جوڑ لے۔ بقلم خود نا امید۔

تمہارا دوست ملّو

مجھے کچھ کہنا ہے مگر جو کچھ کہنا ہے اُسے اگر بالکل کھلے کھلے لفظوں میں کہہ دوں تو لوگ اسے اس قدر گول مول تصور کریں گے کہ میرا مطلب فوت ہو جائے گا۔ لوگ لائق ہیں اور اپنی ذہانت سے معمولی سے معمولی بات کو بھی عقدِ ثریا سے ورے نہیں چھوڑتے مگر مجھے آسمان کے تارے نہیں توڑنے۔ مجھے تو سیدھی سی بات کہنی ہے وہ بھی اپنی ٹوٹی پھوٹی اُردو میں اور اُردو سمجھنے والوں سے لیکن اسی لئے اس بات کو سات دیباچوں کے بعد پردے ہی پردے میں کہوں گا۔

(۲)

جسم :۔ روح! تو جا رہی ہے؛ سچ مچ؛ اچھا سدھارو۔ رستہ سُنا ہے ایسا ویسا ہی ہے، دیکھ کر چلنا۔ جو بات بیت گئی اس کا ذکر فضول ہے مگر تو نے مجھے بہت دُکھ دیئے اور اس پر بھی ہمیشہ تجھے معاف کیا گیا۔ اب بھی معاف کرتا ہوں۔ میں تو آرام کرتا ہوں اور یہ جو تُو نے آوارہ گردی کی ٹھانی ہے سو تیری مرضی! کیوں میری طرح آرام نہیں کرتی؛ کہاں ماری ماری پھرے گی؛ کیا کہا کہ سفر لازمی ہے! اچھا ۔ ۔ ۔ ۔ ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم تو تھک چکے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا ایک آخری بات سُن لے۔ امتحان میں پڑتی ہے غلطی کرتی ہے۔ میرے ہی امتحان میں تو فیل ہو چکی تو اور کسی کے امتحان کا تجھے کیا یارا ہے!۔ کم بخت سو سو دفعہ تجھے رعایتی نمبر ملے کہ تو فیل نہ ہو۔ کئی دفعہ محض سفارش سے تو اوپر والی جماعت میں بھی چڑھائی گئی مگر جس طرح امیر زادوں کی معمولی تعلیمی ترقی یہی ہوتی ہے کہ پرائمری فیل، مڈل فیل، انٹرنس فیل، نالائقی پاس اسی طرح تو بھی مذہب فیل، معاشرت فیل سمجھ

نیل اور دُکھ پاس رہی۔ اُف تُو نے مجھے کیا کیا نہیں ستایا! جا اب دُور ہو۔ جہاں کی تو لعنت ہے وہیں جا۔ میں اب چین سے پاؤں پھیلا کر سوؤں گا۔

روح۔ کیا تم سب کچھ کہہ چکے؟

جسم۔ سب کچھ۔

روح۔ آج تک کیوں نہ کہا؟ کیا مجھ پر رحم کیا؟

جسم۔ او بے وقوف! رحم نہ کرتا تو کیا کرتا؟ کیا کہتا؟ مجھ پر تو صرف معصروں کا اور تیرا ظلم تھا مگر تجھ پر مُردے بھی سوار تھے۔

سقراط نے یہ کہا، ارسطو نے یہ بکا، ڈارون کی لن ترانیاں یوں تھیں۔ یہ تھا تیرا شغل۔ جسے اس جنجال میں مبتلا دیکھتا اُس پر رحم نہ کرتا تو کیا کرتا؟

روح۔ للہ مجھے معاف کرو۔ کاش کہ میں رہ سکتی! اگر کچھ اور رہنا ہوتا تو ضرور تلافی کی کوشش کرتی مگر مجھے ان مُردوں نے کہیں کا نہ رکھا۔ مُردوں کے فریب میں آکر زندوں کو ستاتی رہی۔ افسوس!

(۳)

زندگی کا مٹنا یہ ہے کہ اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے ضروری ایثار کی طاقت نہ رہے۔ شباب کا مٹنا یہ ہے کہ گناہ کی اُمنگ باقی نہ رہے۔ نیکی اُس شکست کا نام ہے جو ماحول کے پے در پے حملوں سے فطرتی انسانی جذبات کو روزانہ نصیب ہوتی ہے۔ وہ جوانا مرگ جذبات جنہیں اس شکست کا اوائل عمر ہی میں مزا چکھنا پڑے اندر ہی اندر سانپ کی طرح بس گھولتے رہتے ہیں۔

(۴)

اس دنیا میں پھول اور پھل ایک ہی وقت ایک ہی درخت میں صرف کہیں کہیں ساتھ ساتھ ہوتے ہیں، ورنہ عام طور پر پھول محض آنے والے پھل کی آرزو کا ایک شگفتہ سا اظہار ہیں۔ اسی طرح بچپن

ایک شغل بیکاری ہے۔ شباب کے کھیل کا ایک بھڑکیلا مگر پھٹ جانے والا اشتہار ہے۔

(۵)

پہلے موت، پھر شباب، پھر بچپن! یہ کیا الٹ پھیر ہے؟ کوئی الٹ پھیر نہیں۔ ایک مردِ خدا کو القا ہوا کہ انسان نہیں مرتا۔ صرف وقت مر جاتا ہے۔ اس عارف نے اپنی ریاضت کے زور سے وقت کو از سرِ نو زندہ کیا مگر شومیٔ قسمت سے وقت کی گھڑی میں الٹی طرف چابی لگ گئی یعنی بجائے آگے بڑھنے کے وقت پیچھے ہٹنے لگا۔ جس مرید کو اس حال سے آگاہی ہوئی اس کا ایک ہی نعرہ ہے:-

"میں خدا کی طرف الٹے پاؤں جا رہا ہوں!!!"

(۶)

میرا مولوی بھی یہی کہتا ہے کہ تیرہ سو سال پیچھے ہٹ جاؤ۔ موجودہ صدی فضول ہے۔ اس سے پہلی لایعنی تھی۔ اُس سے پہلی کا خیال نہ کرو۔ جو اُس سے پہلی ہیں اُن کو بھی بھلا دو اور پورے تیرہ سو سال اُگل دو۔ آمنا و صدقنا۔ مگر خدا کی جانب سامنے طرف کا راستہ کیا بند ہے؟۔

(۷)

ایک عیش نصیب حضرت کو یہ رنج ہے کہ اُن کا دوست غمگین ہے اور اظہارِ ہمدردی کو دلی تڑپ انسانی فرض سمجھ کر یہ حضرت بھی عیش کی حکمرانی چھوڑ چھاڑ آہ و بکا میں مصروف ہیں۔ یعنی اِن کا آئینِ وفا یہ ہے کہ دوست خوش نہیں تو ہم بھی خوشی کو لات ماریں گے۔ دراصل سارے کا سارا ایشیا ہی اسی نہج پر ہے۔ نمازی کو جب تک دُنیا میں ایک بھی بے نماز نظر آتا ہے چین نہیں آسکتا اور لطف یہ ہے کہ جتنی نمازیں لمبی ہوتی ہیں جوں جوں نمازی زیادہ ہوتے ہیں، اُسی قدر یہ بے چینی بڑھتی ہے۔ یعنی ایشیا میں ایک غم یا ایک گناہ بہت سی خوشی بہت سی عبادت کو لے مرتا ہے۔ یہ کیوں نہیں ہوتا کہ تھوڑی سی عبادت بہت سے گناہوں کو لے مرے یعنی اس طرح کہ جس قوم میں ہزاروں سے ایک نمازی ہو

وہ قوم اپنے تمام افراد کو ہی نمازی سمجھ لے؛ گناہ کا وار نیکی پر اس قدر کاری کیوں ہے اور نیکی کا جادو بدی پر کیوں نہیں چلتا؛ کیوں کوئی غمگین کسی عیش نصیب دوست کا خیال کر کے اپنے آپ سے یوں مخاطب نہیں ہوتا؛ "میرا دوست خوش ہے گویا میں ہی خوش ہوں۔ میرا اولیں فرض یہ ہے کہ اپنا غم چھپا کر اُس کی خوشی بڑھاؤں" اور کیوں خوشی کا شہسوار یوں نہیں کہتا "چونکہ میرا دوست غمزدہ ہے۔ اس لئے مجھے اور بھی زیادہ خوشی کا اظہار کرنا چاہئے تاکہ دوست کا غم زیادہ نہ ہو" مگر یہ کبھی نہیں ہوگا۔ صدیوں سے "مل کے کریں آہ و زاریاں" والی بلائے بد ایسی بُری طرح اس رسم زدہ برّاعظم کے گلے پڑی ہے کہ اب چھٹکارا مشکل ہے۔ خود زبان چیخ رہی ہے کہ جن لوگوں میں "ہمدردی" کا لفظ ہے مگر "ہم مسرتی" کسی نے آج تک نہیں بولا اُن میں درد عام ہوگا مسرّت کا نام نہ ہوگا۔ کیا اس سے صاف ظاہر نہیں کہ ایشیا کی دُنیا کو جسمانی خوشی کے رسول کی ضرورت ہے اور اشد ضرورت ہے؛ کیا یہ واقعہ نہیں کہ ایشیا میں روحیں دُھلتی دُھلتی اس قدر پتلی پڑ گئی ہیں کہ اب تقریباً ناکارہ ہیں۔ بالخصوص اس خیال سے کہ ایشیا کے روحانی دھوبی ابھی تک پُرانے طریقے سے روحوں کو عذاب کے پتھر خوف کے تختے پر زور زور سے پٹختے ہیں۔ دھوبی کا کیا جاتا ہے مگر روحیں ہیں کہ چمک اور استری تو کجا چر چر نے پھٹنے سے بچے اسے گئے جباسئے جاتی ہے۔ کاش کہ مسلمان اس رسوم کی گائے کو قربان کر دیں مگر آمدیم بر سر مطلب۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایشیا میں ایسا ہادی پیدا ہو جائے جو پیرس کے باکمالوں کی طرح . . . . [یا دش بخیر پہلے پیرس کو آنکھیں بند کر کے دیکھ لوں۔ ایشیا میں خوشی حرام ہے، وہاں غم حرام ہے۔ یہاں کسی آنے والی دُنیا کی خوشی کا تقاضا ہے کہ گریۂ نیم شبی پر زور ہو مگر پیرس کے شبستانوں میں اس جانے والی دُنیا کی داد میں رقص و سرود و خندۂ فراواں کی دلفریبی ہے۔ ہم اس دُنیا کو لات مارتے ہیں وہ اسے گلے لگا کر پیار کرتے ہیں (دُنیا سب جگہ عورت ہے صرف سلوک کا فرق ہے) مگر پیرس کو اس طرح کیوں یاد کیا جائے پرانی سے پرانی روحانی قمیص کو ہر ہفتے چمکا دے مگر مشکل یہ آن پڑی ہے کہ یاران وطن شُدھی کی دُھن

بیں ہیں۔ افغانی شلوار تو خدا خدا کر کے پتلون بن چلی ہے مگر ہندوستانی تہمد کی خیر نہیں۔ آج دھوتی کل لنگوٹی [سنتا ہوں کہ مدراس میں کوئی مولانا کسی پنڈت جی کے پاؤں پڑے۔ اس ہم سرّتی کے سوانگ سے بھی خدا بچائے]

مجھے کچھ کہنا تھا مگر نہ کہہ سکا۔ وہ مائیں پیدا نہیں ہوئیں جن کے بچے اسے سُن سکیں۔ دُنیا سے میں ناراض نہیں۔ جیسی بھی ہے اچھی ہے اور بچاری بہتر ہونے کی کوشش میں سرگرداں ہے۔ دُنیا والوں سے میں ناراض نہیں۔ جہاں بھی ہیں جھوٹے ہیں اور جو جھُوٹا ہے سو اچھا ہے۔ مگر جب ایشیائی میلا کُچیلا جھوٹ یورپ کے زرق برق دروغ میں تبدیل ہوجائے گا تو پھر دُنیا میں آہ وزاری کی آواز کہاں سے آئے گی ؟۔ آنسوؤں کے شیدائی پھر کہاں تنیس مارخانی کریں گے ؟ اس دنیا کی قسمت میں اگر ایک ابدی تبسّم بننا لکھا ہے۔ تو کیا رونے والوں نے یونہی اپنی عمریں کھوئیں ؟

کیا ؟ کیا ؟؟ کیا ؟؟؟

عدالتیں

پنجاب میں چار قسم کی عدالتیں ہیں:۔

اوّل دیوانی عدالتیں۔ ان کے دروازوں پر دس بجے سے چار بجے تک متواتر تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد مفصلہ ذیل قسم کی آوازیں دی جاتی ہیں

چلو	پکوڑی چند اور قربن محمد
چلو	کوڑی مل اور فاقے خاں
چلو	لالہ گروی مل اور میاں مرہون الٰہی

یہ چل چلاؤ غدر کے بعد سے شروع ہوا ہے اور شاید قیامت تک رہے، اِن عدالتوں کے ہر فیصلہ کا دارومدار ثبوت پر ہے۔ عجب دیوانے لوگ ہیں کہ خواہ مخواہ بوجھ تلے دبتے ہیں۔ مگر یہ ثبوت کا بوجھ بعض دفعہ ججوں کی توجہ سے آنًا فانًا ادھر کا اُدھر جا پڑتا ہے اِن دیوانی عدالتوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ گاؤں میں رسم ورواج چاہے کچھ بھی ہو۔ عدالت میں بعض دفعہ وہ مسل میں ایسا بدلتا ہے کہ خود وہ لوگ حیران رہ جاتے ہیں یہاں تک کہ بعض دفعہ سیدوں میں بیٹیاں لاوارث اور برہمنوں میں نواسیاں جائز قرار دی جاتی ہیں مگر سب سے طرفہ داستان ان دیوانی عدالتوں کی یہ ہے کہ ان میں سچ یا سچ نما جھوٹ کے لئے بھی میعاد مقرر ہے بارہ سال کے بعد سچ چاہے وہ کتنا ہی صادق کیوں نہ ہو جھوٹ ہو جاتا ہے۔ اور بعض سچ تو بہت ہی جوانا مرگ ہوتے ہیں، تین سال سے زیادہ زندہ ہی نہیں رہ سکتے۔

دوم فوجداری عدالتیں۔ انہیں دیوانی عدالتوں پر یہ فوقیت ہے کہ ان کے بعض شائقین

آواز کے محتاج نہیں۔ اپنے ساتھ لوہے کی زنجیر کے سرے پر ایک پولیس کا سپاہی اٹکا لیتے ہیں اور خود بخود داخل ہو جاتے ہیں۔ ان شائقین کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ ان پر بڑے سے بڑا بیرسٹر بھی چاہے وہ لارڈ ریڈنگ ہی کیوں نہ ہو جرح کا سوال نہیں کر سکتا اور ان کو جھوٹ بولنے کا قانونی حق حاصل ہے بعض دفعہ تو بڑے بڑے گھمنڈ سنگھ اور طرے باز خاں اس قانونی حق کا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ مگر عام طور پر یہ حق نتھو خیرے۔ روپے اور بندے کے لئے مخصوص ہے۔

سوم مال کی عدالتیں۔ ان کا مرتبہ اوّل الذکر ہر دو سے بالاتر ہے کیونکہ ان میں اکثر گاؤں کے گاؤں کو طلب کر لیا جاتا ہے دیگر عدالتوں میں تو انسانوں کی قسمت کا اُلٹ پھیر ہوتا ہے یہاں زمین کی تقدیر گردش میں رہتی ہے، یہ عدالتیں اکثر خود بھی چکر میں رہتی ہیں۔ بدھو پور کا مقدمہ منگل پور، منگل پور کی جمعبندی سنسان پور، سنسان پور کی فرزندی پور۔ دریاؤں کی بُرد برآمد کی طرح پنجاب کے دریا سمجھدار ہیں جسے فائدہ پہنچانا ہو اُس کی زمین پہلے بُرد کر دیتے ہیں، ان عدالتوں میں جو ایک دفعہ بہ نکلے پھر وہ نکلتا ضرور ہے مگر عرصہ کے بعد۔

چہارم۔ اندھیری مجسٹریٹوں کی عدالتیں۔ یہ سب سے انوکھی ہیں۔ کیونکہ ان میں صلح صفائی کے بانخوا واعظ جلیس ہوتے ہیں۔ مار پیٹ کا مقدمہ ہو کہ نقص امن کا اندیشہ ہو کہ اغوا کی واردات ہو سب کے لئے ایک ہی مجرب تلقین ہے یعنی راضی نامہ۔ ان سب عدالتوں کا جو گرانقدر مجموعی احسان اہل پنجاب پر ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ پنجاب کی عدالتیں پہلا سبق یہ سکھاتی ہیں کہ انسان اس دُنیا میں صرف اپنے لئے زندہ نہیں۔ چنانچہ ان کے فیضان سے گاؤں والی کی کمائی سے عرضی نویس، وکیل، وکیلوں کے منشی، عدالتوں کے اردلی، اہلمد، ناظر، پولیس کے سپاہی، دیوانی کے پیادے، قیدخانے کے برقنداز علی قدر مراتب اپنا اپنا حصہ وصول کرتے ہیں۔ ان کے برعکس انگلستان کے خود پرست لوگ اس رواداری کے قریب نہیں پھٹکتے۔ گواہ وہاں ایسی موٹی عقل کے ہیں کہ رشتہ داری، قرابت، دوستی، دشمنی انہیں کسی کا کچھ پاس

نہیں۔ بلکہ ایسی عقل کی مار ہے کہ اکثر ملزم خود اقبالی ہو جاتے ہیں۔ دوسرا سبق روحانی ہے۔ ہر مذہب کی روحانی تعلیم کا نصب العین ایک ہی ہے یعنی فنا فی اللہ ہو جانا، پنجاب کی تمام عدالتوں کی تقدیس اِس ایک بات ہی سے ثابت ہے کہ اُنہوں نے اس عظیم الشان نصب العین کی پوری تکمیل اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ یعنی اِس طرح سے کہ پہلے اہلِ مقدمہ پوری طرح فنا ہوتے ہیں۔ اور پھر یہ کہہ کر صبر کر لیتے ہیں کہ خدا کی مرضی، گویا فنا فی اللہ ہو گئے۔ صاف ظاہر ہے کہ جتنی عدالتیں زیادہ ہوں گی اسی قدر روحانی ترقی کی رفتار تیز ہوتی جائے گی۔ اس لئے ملک کے رہنماؤں کا اصلی فرض یہ ہے کہ اور کاموں کو چھوڑ کر تمام کوششیں اس مرکزی اصُول پر جمع کی جائیں کہ ہندوستان کی روحانیت کا تقاضا ہے کہ ہر گاؤں میں ہر قسم کی عدالت قائم ہو اور ہر عدالت کے حکم کی اپیل در اپیل ہو سکے۔ اس اصلاح میں ہر قسم کی اصلاح آ جائے گی۔ اور تمام انٹرنس فیل یا مڈل فیل بزرگ بلا دقت ملک کی خدمت میں لگ جائیں گے۔

تیسرا سبق اقتصادی ہے بشرطیکہ کوئی غور کرے مثلاً کہاں دریائے سندھ کے پاس چھچھ کا علاقہ کہاں لاہور کا مشہور بیرسٹر سر ولیم رٹگین مگر چونکہ ذاتِ باری کو منظور نہ تھا کہ چھاچھی لوگ پکے مکانوں میں آسودہ ہو کر رہیں۔ اس لئے اللہ تعالےٰ نے لاہور میں چیف کورٹ قائم کرا دیا چنانچہ چھاچھی جو پہلے قتل کے بدلے صرف قتل کرتے تھے۔ چیف کورٹ قائم ہونے پر قتل کے ساتھ قتل کے علاوہ اپیل کے ساتھ وکیل کرنے لگے سا اور سابق مسٹر رٹگین کے گھر چاندی کی نہر بہ نکلی۔ صرف مسٹر رٹگین ہی نہیں بلکہ بابو پرتول چندر چیٹرجی (بعد میں سر پرتول چندر) بھی اسی زمرہ میں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ عدالتیں تو اللہ جل شانہٗ کے فضل سے الف لیلہٰ والے الہ دین کا عجیب و غریب چراغ ہیں۔ جس وکیل، بیرسٹر نے اس چراغ کو درست طریقے سے مل لیا اس کے محل تیار ہو گئے۔ اس زندہ اور جاری معجزے کو دیکھ کر جو شخص ذاتِ حق پر یا کم از کم برٹش گورنمنٹ پر ایمان نہ لائے اِس کا اقتصادی مذہب باطل ہے علیہ التول میں دہقانوں کے روپیہ کے لئے وہ مقناطیسی کشش قائم ہو گئی ہے کہ ان کے ہوتے کوئی گاؤں کا

رہنے والا اپنے آرام و آسائش میں مستغرق ہو ہی نہیں سکتا۔ صاف مشیت معلوم ہوتی ہے کہ پہلے ہر قسم کی نعمتیں شہریوں کو عطا ہوں گی۔ اور اس کے بعد مناسب موقع پر گاؤں والوں کو عقل دی جائے گی کہ وہ فارغ ہو کر افسوس کریں۔

اب یہ مضمون ختم ہوتا ہے مگر پڑھنے والوں سے اس امر کی داد کی توقع ہے کہ عدالتوں کے ذکر میں انصاف کا لفظ بھول کر بھی استعمال نہیں کیا گیا۔ مرزا غالب مرحوم کے شعر ؎

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

میں "تیرا" خداوند تعالےٰ کی طرف راجع ہے چونکہ حق تعالےٰ انصافِ مطلق ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ انصاف کو مخاطب کر کے یوں یہ شعر نہ پڑھا جائے ؎

لٹ لٹ کے ہر کچہری میں دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

یا روحانیت کا یوں اظہار نہ کیا جائے ؎

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں میں جج کو

بعض کوتاہ اندیش لوگ اکثر واویلا کرتے ہیں کہ مسجدیں غیر آباد ہیں اور مندر سنسان۔ کیا انہیں اتنا بھی پتہ نہیں کہ پنجاب میں نئے عبادت خانے جہاں لوگ شوق سے چڑھاوے لے کر جائیں بھرپور آباد ہیں یعنی عدالتیں۔

مرزا ننّو

مرزا ننّو (ماں باپ نے تو نواب علی نام رکھا تھا مگر شہر بھر کی بے تکلفی ماں، باپ کے تکلف کو آسانی سے برطرف کر دیتی ہے) تباہی کی کشادہ شاہراہ پر اچھی خاصی مسافت طے کر چکے ہیں۔ ڈگریاں، قرقیاں، نیلامیاں گرفتاریاں یکے بعد دیگرے اُن کے ساتھ اپنے اپنے تپاک کے اظہار سے محظوظ ہو چکی ہیں اور وہ بلائے بدجو دنیا کے سو کام میں حارج ہوتی ہے اور جس کا نام عزت ہے مدّتوں پہلے مرزا ننّو کے برہنہ پاؤں سے ٹھکرائی جا چکی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مرزا ننّو نواب بھی اپنے آپ کو ہمیشہ "عزت دار آدمی" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ مگر دُنیا کو اُن سے چنداں اتفاق نہیں اور بعض مجسٹریٹوں کی ہٹ دھرمی سے مرزا کا آخری معزز کمائی کا ذریعہ (ایک روپیہ فی گواہی) بھی اب مخدوش حالت میں ہے اور مرزا اس فکر میں ہیں کہ ہو تو کسی چلتے پُرزے تھانیدار کی جلیبیں بھرنے کی رضاکاری اختیار کریں۔ سوجھتی انہیں خوب ہے اور اس میں شک نہیں کہ کسی کپتان پسند تھانے دار کی بلا تنخواہ نوکری میں علی بابا والے غار کے راز نہاں ہو سکتے ہیں مگر پیشتر اس کے کہ مرزا کچہری کی دُنیا سے رحلت کریں اُن کے چند کارناموں کا ذکر ضروری ہے۔

ایک دن مرزا ننّو کسی مقدمے میں شہادت کے لئے عدالت میں پیش ہوئے تو وکیلِ فریقِ ثانی نے اُن کی صورت دیکھتے ہی افسر جلیسی کی خدمت میں عرض کیا کہ مرزا کا کوئی پیشہ نہیں یونہی موقع بے موقع کرایہ پر گواہی دیتے پھرتے ہیں۔ مرزا کا یہ وصف ہمیشہ سے رہا ہے کہ کوئی بات کرتا ہو تو درمیان میں نہیں بولتے۔ جب وکیل صاحب مرزا کے خلاف اپنی فصاحت کا دریا بہا چکے تو مرزا عدالت سے ملتجی ہوئے کہ مجھے بھی کچھ کہنے کی اجازت دی جائے۔

عدالت۔ کہو۔

نبّو۔ حضور اس عدالت کی تو شان ہی الگ ہے اور میری کیا مجال کہ وکیل صاحب کی طرح کوئی ناشائستہ بات کہوں مگر یہ بالکل غلط ہے کہ میرا کوئی پیشہ نہیں۔

عدالت۔ ول تمہارا کیا پیشہ ہے؟

نبّو۔ حضور خفا نہ ہوں تو بالکل سچ بتا دوں۔

عدالت۔ ول جلدی بولو۔

نبّو۔ غریب پرور جس طرح بعض عدالتیں وکیل پرور ہیں اسی طرح میں بھی وکیل پرور ہوں۔ دو ہزار سے زیادہ روپیہ وکلا کو فیسوں کا دے چکا ہوں۔ کیا وکیل پرور ہونا کوئی بُری بات ہے آخر وکیلوں کے ماں باپ بھی تو اُن کو پالتے ہیں اور حضور سب کے ماں باپ ہیں۔

عدالت۔ تم گستاخ آدمی شریر ہے۔

نبّو۔ (وکیل کو مخاطب کر کے دبی زبان سے) اب جواب دیجیئے نا اِس بات کا۔

اِس پر جو فرمائشی قہقہہ عدالت میں بلند ہوا اُس کا برسوں ذکر رہے گا۔ اُس روز دُور دُور سے لوگ مرزا کو دیکھنے آئے۔ وہ وکیل صاحب سارا دن مُنہ چھپاتے پھرے۔ ایک اور موقع پر ایک پٹواری زادہ وکیل مرزا نبّو سے تن تن کر اُلٹے سیدھے سوال کر رہا تھا۔ خرانٹ مرزا تاک میں تھا کہ موقع ملے تو بدلہ لوں۔ آخر وکیل صاحب گرج کر بولے۔

وکیل۔ کتنا فاصلہ تھا؟

نبّو۔ تخمیناً پچاس گز

وکیل۔ ٹھیک یاد ہے کہ تخمیناً ساٹھ گز نہیں تھا۔

نبّو۔ آپ کا اختیار ہے پچاس کو ساٹھ کہئے مگر میں تو پٹواری سے پُوچھ کر آیا ہوں، اس نے پچاس گز

بتایا تھا۔

وکیل ۔ پٹواری تمہارا دوست ہے ؟

نبّو ۔ حضور پٹواری کا کام ایسا ہے کہ بیٹے کو اپنا نہیں بناتا، مجھے کیا دوست بنائے گا ؟

وکیل صاحب عدالت میں تو بات ٹال گئے مگر وکیلوں کے کمرے میں دوستوں نے اُن کے خوب لتے لئے۔

ایک اور موقع پر مرزا کی گواہی کے دوران میں اُن سے سوال کیا گیا کہ کیا ملزم کی مقتول سے دشمنی تھی ؟

نبّو ۔ تھی۔

عدالت ۔ کیوں ؟

نبّو ۔ عورت کے سبب سے۔

عدالت ۔ کون عورت ؟

نبّو ۔ مسماۃ طوائف ۔

عدالت ۔ کیا دونوں کی دوستی تھی ؟

نبّو ۔ حضور دوستی کے سبب سے دشمنی نہ تھی وہ تو دونوں کو جوتے لگاتی تھی۔

عدالت ۔ پھر کیا دشمنی تھی ؟

نبّو ۔ حضور وکیل صاحب کو مسماۃ طوائف کے گھر کے سب حال کا پورا علم ہے۔ ان سے دریافت کرلیں۔

عدالت ۔ (جھڑک کر) تم سیدھا جواب دو جو تم کو علم ہے۔

نبّو ۔ حضور دونوں نے مسماۃ طوائف کے حق میں جھوٹی شہادت دی مگر مسماۃ طوائف مقدمہ ہار گئی۔ان

دونوں کی آپس میں تکرار ہوگئی وہ کہتا تھا کہ تیری شہادت نے مقدمہ خراب کیا وہ کہتا تھا کہ تیری شہادت نے کام بگاڑا۔

عدالت۔ ان لوگوں نے جھوٹی شہادت کیوں دی؟

نبّو۔ کسی وکیل کے کہنے پر۔

بات بالکل سچ تھی اور مرزا کے مُنہ سے بے تکلف نکلی اور مرزا اپنی لیاقت سے "کسی" کا لفظ ایسی موزوں طرح چپاں کر گیا کہ عدالت اس کے سر نہ ہوسکی اور ملزم کا وکیل گویا کٹ کر مر گیا۔ عدالتوں میں بہت دن "کسی وکیل" کے معنی ایک خاص وکیل رہے۔

وکلا کے ساتھ تو مرزا کے یہی تین مشہور معرکے ہیں مگر چھوٹے اہلکاروں پر تو مرزا کے سترہ حملے زبان زد ہیں۔ صرف ایک کا ذکر کافی ہے۔

ایک جبار کرنیل ڈپٹی کمشنر جس کو رعایا "موتیوں والا" کے لقب سے اب تک یاد کرتی ہے کچہری سے اُٹھنے کو تھا کہ اردلی نے حسبِ معمول آواز دی "چلو عرضی سوال والا" مرزا نبّو یہ سُن کر آگے بڑھے۔

کرنیل صاحب۔ وَل کیا ہے؟

نبّو۔ حضور کیا آپ کے سامنے کسی اہلکار کی جھوٹی شکایت کرنے سے مجھے قید کی سزا ہوسکتی ہے۔

کرنیل۔ ضرور ہوگی، اگر شکایت جھوٹی ہوگی۔

نبّو۔ اور اگر جھوٹی نہ ہوئی تو کیا اہلکار کو سزا ہوگی؟

کرنیل۔ تم بکو۔ جلدی بکو۔ تمہارا کیا مطلب ہے؟

نبّو۔ حضور میں شکایت کرتا ہوں۔ آپ چل کر دیکھ لیجئے۔

کرنیل۔ کدھر؟

نبّو۔ صرف پچاس گز۔

خدا جانے نبّو اور کرنیل کے درمیان کوئی سمجھوتا تھا یا کیا بات تھی مگر کرنیل صاحب نبّو سے کہنے لگے کہ "اچھا تم آگے آگے چلو۔" نبّو کرنیل کو سیدھا خزانچی کے کمرے کی طرف لے گیا اور کمرے کے عین باہر جا کر کہنے لگا کہ حضور اس کی گدی کے نیچے جھوٹے سکّے درجنوں رکھے ہیں۔ جو رشوت نہ دے چالاکی سے اُن کے روپے بدل دیتا ہے اور پھر روپے کٹوا دیتا ہے۔

کرنیل صاحب نے فوراً بلا تامّل گدی کو اُلٹ دیا۔ نیچے سے بیس روپے سے زائد جھوٹے روپے نکلے۔ خزانچی کا وہ گماشتہ تو موقوف ہوا اور مرزا کو کرنیل صاحب نے خوشنودیٔ مزاج کا پروانہ دیا۔ مگر آج کل کے ڈپٹی کمشنر مرزا کی نظروں میں کم جچتے ہیں۔ ہمیشہ کہا کرتے ہیں "اگلے حاکم بڑے رحم تھے۔"

فلسفہ

میرے دوست کی فرمائش ہے کہ دو تین صفحوں میں دُنیا جہان کا فلسفہ بھر دوں حضرت ایک عالی شان قصر کی تعمیر میں منہمک ہیں اور چونکہ اس میں ایک مختصر سا کتب خانہ بھی جاگزین ہوگا اس لئے شاید فلسفہ بمقدارِ کمرہ یا فلسفہ بقدرِ جثہ کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ یہ وہ بھول گئے کہ جس سرِ فلک قصر کے چمکیلے پہلو اُن فرشِ رفعت کے اُچھلتے ہوئے پاؤں کو چومیں گے اُس میں فلسفے کا کیا کام! بہر حال تعمیلِ ارشاد میں فلسفے کا خون کرنے میں ذرا بھی دریغ نہیں۔

کیا نیا کیا پرانا کیا مادی کیا ذہنی سب فلسفے اس اصُول پر متفق ہیں کہ جو بات قطعی پایہ ثبوت کو پہنچ جائے اُسے یقیناً غلط جانو۔ مثلاً ایک زمانے میں بعض لوگوں میں بہ تحقیقی طور پر ثابت شدہ تھا کہ خدا نے انسان کو بنایا ہے۔ تھوڑی دیر بعد یہ ثابت ہوگیا کہ انسان نے خدا کو بنایا ہے اور یہاں تک کہا گیا کہ ایک دیانتدار خدا بنانا انسان کا بہترین کام ہے مگر جب لوگ اس حد تک پہنچ گئے تو پھر شُبہ ہوگیا کہ ایسا خدا کس کام کا جو اپنی مرضی سے اپنے بنائے ہوئے قانون توڑ پھوڑ کر کچھ کا کچھ نہ کر دے۔ چنانچہ جب سے یہ نئے شکوک پیدا ہوئے ہیں تب سے پھر یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ خدا ہے یا کم از کم اگر خدا نہیں تو کچھ نہ کچھ ہے اور ضرور ہے۔ یہاں تک تو راستہ بالکل صاف ہے یعنی یہ کہ اگر شک ہے تو خدا ہے اور اگر خدا ہے تو شک ہے یا یوں کہیئے کہ خدا اور شک لازم ملزوم ہیں۔ یہ وہ ہے، وہ یہ ہے، مگر اُلجھن اس "کیا؟" کے سوال سے پیدا نہیں ہوتی یعنی اس سے، "کہ کیا ہے؟" کیونکہ جس معقول انسان کو ایک سوال کے دو جواب مِل جائیں وہ کبھی ناراض نہیں ہوتا۔ اُلجھن پیدا ہوتی ہے "کیوں؟" کے سوال سے۔ بلندی پوچھنا

ہے کہ خدا یا شک یا دونوں الگ الگ یا ان دونوں کی معجون مرکب کیوں ہے؛ اس کیوں کی دیوار کے ساتھ فلسفے کو سر پھوڑتے صدیاں گزر گئیں مگر ہنوز روز اول۔

کیوں کا سوال حل کرنے کے لئے خود فلسفے کی ماہیت پر چند فقرے تمہیداً لازمی ہیں جس طرح باغوں میں خود رَو بھنگ ہوتی ہے اسی طرح دماغوں میں فلسفہ اُگتا ہے اور جس طرح بعض باغوں کی بھنگ تیز ہوتی ہے اور بعض کی ذرا دھیمی اسی طرح بعض دماغوں کا فلسفہ گرم ہوتا ہے اور بعض کا سرد۔ اگر بھنگ بیچاری سے پوچھا جائے کہ تم کیوں تیز ہو تو وہ کیا بتائے گی، کچھ نہیں، یہ تو سوال کرنے والے کا فرض ہے کہ بھنگ والی زمین کے مزاج کا سائنٹیفک مطالعہ کرے اور اسی مطالعہ سے جو کچھ وہ اخذ کر سکے اُسے بیان کر دے۔ اسی طرح فلسفہ سے یہ پوچھنا کہ تم کیوں گرم ہو لاحاصل ہے۔ جن دماغوں میں اُس کی نشو و نما ہے اُن کا مطالعہ لازمی ہے۔ اس میں دقت یہ آپڑتی ہے کہ دماغوں کے مطالعہ کے لئے جن جماعتوں کے وہ دماغ ہیں اُن جماعتوں کا مطالعہ کیا جائے اور جماعتوں کے سمجھنے کے لئے دیگر ملحقہ جماعتوں کے تاثرات کا اندازہ لگایا جائے اور صرف اسی پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ حالات متقدم کی بھی اسی طرح چھان بین کی جائے۔ غرض یہ ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فلسفہ جب خود اپنی نسبت یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ کیوں کسی شوخ چشم کی نگاہ کی طرح بے باک ہے تو وہ تمام کائناتِ عالم کی 'کیوں' کو کیسے حل کریگا؟

چنانچہ اب رجحان یہ ہے کہ کیوں کے سوال کا جواب نہ دیا جائے بلکہ یہ کہا جائے کہ سرے سے سوال ہی غلط ہے۔ ہزارہا کتابوں کی لاکھوں دلیلوں میں سے صرف ایک دلیل کی طرف اشارہ کافی ہے۔ کسی چیز کی کیوں تب بتائی جا سکتی ہے جب وہ ختم ہو۔ چونکہ نظامِ عالم ابھی ختم نہیں ہوا اس لئے اس کی کیوں کا سوال قبل از وقت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب نظامِ عالم ختم ہوگا تو پھر نہ کیوں ہوگی نہ کیوں والے ہوں گے۔ 'کیا' اور 'کیوں' کے علاوہ فلسفے میں صرف تین سوال اور ہیں۔ سب سے پہلے کس طرح کو لیا جاتا ہے۔ سائنس نے جب پیٹ میں سے پاؤں نکالے تو بابا آدم بیچارے رخصت

ہوئے اور ایک نامعلوم مگر حقیقی چچا بوزنہ سرکار کہلانے لگے۔ مگر سائنس کمبخت نے اس پر بس نہ کیا بھاگتی گئی اور فلسفہ ہانپتا ہوا لڑکھڑاتا ہوا پیچھے پیچھے چلا گیا۔ آخر نتیجہ یہ نکلا کہ کل جانداروں کا موجد اعلیٰ کوئی قسمت کا مارا (PROTOPLASM) تھا اور کل جاندار اور بے جانوں کا نکڑ دادا میاں (Atom) خلف (Electron) ولد نامعلوم ہے۔ یہ (Electron) صاحب بڑے مداری ہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ جا نکلتے ہیں مگر درمیانی رستہ طے نہیں کرتے اور جب ان کی باضابطہ جامہ تلاشی لی جائے تو محض قلاش یعنی نہ کپڑا نہ لتا نہ جسم بلکہ صرف کشش کا گورکھ دھندا۔

"کیا" "کیوں" "کس طرح" کے سوالوں کے بعد "کب سے؟" کا سوال پیدا ہوتا ہے اور موجودہ فلسفے کی رو سے یہ پانچویں سوال "کس جگہ سے" سے وابستہ ہے۔ حکیم آئن سٹائن کا خدا بھلا کرے اُس نے "کب سے؟" کو "کس جگہ سے؟" سے یوں ٹکرایا ہے کہ اب نہ وقت کا پتہ چلے نہ بُعد کا۔ بس فلسفہ ختم۔ جن لوگوں کو فلسفے کا امتحان دینا ہو اُن کی سہولت کے لئے سوال وجواب کی صورت میں تمام تحقیقات کا لب لباب درج کر دیا جاتا ہے:۔

سوال۔ کیا ہے؟

جواب۔ اندھے ہو، بہرے ہو، سوجھتا نہیں۔ دیکھ لو، سُن لو، چھُو لو، چکھ لو اور جو پھر بھی پتہ نہ لگے تو مرجاؤ اور جو پھر بھی پتہ نہ لگے تو جہنم کو جاؤ۔

سوال۔ اگر کچھ ہے تو وہ کیوں ہے؟

جواب۔ بے ہودہ احمق نامعقول۔ اگر تمہیں معلوم نہیں تو کیوں پوچھتے ہو اور اگر ہمیں معلوم ہے تو کیوں بتائیں۔ ع

چڑھی ہے یہ آندھی اُتر جائے گی

جب تھم تھما جائے تو پھر یہ سوال کرنا۔

سوال ۔ اگر کچھ ہے تو کس طرح سے ہے ؛

جواب ۔ کسی قسم کی نامعلوم کشش کو ہذیان ہے ۔

سوال ۔ یہ ہذیان کب سے ہے اور کس جگہ سے ہے ؛

جواب ۔ تمہارے لئے جب سے تم ہو اگر تم ہو اور میرے لئے جب سے میں ہوں اگر میں ہوں اور اس تمام کیا ؛ کے لئے جب سے یہ کیا ؛ ہوا اور جہاں کہیں ہوا ۔ جاہل آدمی ابھی چند دن ہی تو گزرے کہ وقت کا مسافت سے نکاح ہوا اتنی جلدی یہ جوڑا کس طرح کوئی بچہ پیدا کر دے ۔ جاؤ ہمیں سوچنے دو کہ اُلو پہلے تھا یا اُلو کا انڈا ۔

تنہائی

پیاری۔

مختصر سی مجلس میں تم نے مجھ سے بیسیوں سوال کر ڈالے۔ اُن میں سے ایک سوال پر مجھے اب تک ہنسی آ رہی ہے۔ میری متضاد طبیعت کی کسی بے سر پیر بات سے متاثر ہو کر تم نے محض بھولے پن سے مجھ سے یہ پوچھا۔

کیا تم خود اپنے آپ کو سمجھتے ہو؟

پیاری۔ ہندوستان کے شعر زدہ نوجوانوں کا ایک فیشن ہو گیا ہے کہ وہ اپنے انچ بھر گہرے تالاب میں سمندروں کو غوطے دیتے رہتے ہیں۔ میں بھی اسی فیشن میں مبتلا ہوں اور بُری طرح مبتلا ہوں۔ جب موقع ملتا ہے اس تاک میں رہتا ہوں کہ جو کچھ ہوں اس سے دس ہزار گنا زیادہ ظاہر ہوں۔ اور چونکہ پڑھا لکھا ہوں اس لئے یہ بھی اپنے آپ کو دھوکا دے لیتا ہوں کہ یوُں بہانہ کرنے سے کبھی نہ کبھی کچھ نہ کچھ بن جاؤں گا ورنہ من آنم کہ من دانم۔ چونکہ تم سے خواہ مخواہ سچ بولنے کو جی چاہتا ہے اس لئے تمہیں بتا دیتا ہوں کہ مجھ میں اور مجھ سے اور سینکڑوں تضیع اوقات کرنے والوں میں صرف ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنے آپ کو کبھی خط نہیں لکھتے اور میں لکھتا ہوں۔ واقعی اپنے آپ کو خط لکھ کر ڈال دیتا ہوں اور جب ڈاک آتی ہے تو بہت شوق سے اس خط کو پڑھتا ہوں۔ یہ خط میری طرف ہوتے ہیں مگر میری طرف سے نہیں ہوتے۔ ان کے لکھنے والے کی ہستی خود میرے لئے معمّا ہے مثلاً آخری خط جو مجھے ڈاک میں ملا ہے وہ یہ ہے:۔

خط

"چین کی، مصر کی، فرنگستان کی، ہندوستان کی پوری پچاس صدیوں کا میں وارث ہوں مگر باوجود اس کے زندگی مجھ سے چاہتی ہے تو یہی کہ وہی پرانا کھیل کھیلوں یعنی کسی حسینہ کے دل میں اپنی محبت پیدا کر لوں، کسی نااہل سے اپنی تعریف کرا لوں اور کسی چالاک لکھ پتی سے مال دولت گھسیٹ لوں۔ زندگی کی عقل پر بھی لعنت ہے۔ کیا میں انہی کاموں کے لئے رہ گیا ہوں یا ان سے بھی بدتر ان مشاغل کے لئے کہ دلفریب فقرے ترتیب کر کے کسی کو بہلا دوں کسی کو پھسلا لوں اور یوں وقت کا خون کرتے ہوئے اس دنیا سے چل بسوں۔ مگر میرا اس میں کیا قصور ہے؛ خدا کو بھی تو جو مجھ سے بہت پرانا ہے آیا تو یہی آیا کہ کہیں کہیں کوئی صورت بنا دی! کیسی؟

ہونٹ جن پر تبسم قربان ہو، بال جن سے دم گھٹنے لگے، آنکھیں جن میں شریر ستارے شوخیاں کریں اور لمبی گردن کے خم کی وہ شاہکاری کہ تقدیر چکر کھاتی پھرے۔

اس کے سوا تو خدا کی اور کوئی کاریگری دیکھی نہیں اور اسے جب اس قدر عمر میں یہی آیا تو میرا کیا قصور ہے؛ اگر وہ کسی طرح وقت کو چلنے سے روک لیتا اور چمکتے ہوئے پیارے رخساروں کو جھرّیوں سے بچا لیتا تو میں بھی عمریں یوں نہ کھوتا۔ پرستش کرتے ہوئے چلا جاتا۔ کس کی؛ خدا کی نہیں، بلکہ اُس جانِ حسن جہانِ حسن کی جو تصور ہے، راگ ہے، شعر ہے مگر اب کیا کروں۔ حسن، شہرت، دولت میرے کسی کام نہیں۔ اُف اس دُنیا میں مَیں کس قدر تنہا ہوں۔ ہزاروں لاکھوں دُنیائیں اپنے لئے بنا بنا کر بگاڑ دیں اور یہ تنہائی نہ گئی۔ ہاں خوب یاد آیا۔ ایک مَیں تنہا ہوں اور ایک وہ تنہا

ہے۔ وہی بھولی بے رحم جس نے اپنے آپ کو فریب دینے کے پرانے ایمان کو نئی شان سے قائم کیا ہے۔ آئے دن اپنے پیارے پیارے خوابوں کو یہ کہہ کر قتل کرتی رہتی ہے کہ میرا فرض ہے کہ میں اپنے لئے نہ جیوں۔ یہ کمبخت لفظ ' فرض ' اس کے تخیل کی گردن پر ایسا سوار ہوا ہے کہ تعجب نہیں کہ چند سالوں تک وہ شاید اپنے خوابوں کو بالکل ہی عاق کر دے۔ پھر وہ کس قدر غریب رہ جائے گی"۔

پیاری۔ بس یہ خط تھا جو مجھے آخری ڈاک میں آیا۔ خود حیران ہوتا ہوں کہ کیوں لکھا ؟ مگر مجھے یہ اپنا کھیل پسند ہے۔ اپنے آپ سے اجنبی بنے رہنا اور اس اجنبیت کو سمجھنے کی کوشش نہ کرنا میرا فلسفۂ زندگی ہے۔ پرانا فلسفہ یہ تھا کہ جس نے پہچانا اپنے آپ کو اس نے پہچانا اپنے رب کو۔ آج کل کے علم النفسیات والے بھی Know Thyself کے مضمون پر بہت زور دیتے ہیں مگر میری تمام کوششوں کا مرکز یہ ہے کہ اپنے آپ کو نہ جانو۔ اس لئے تمہارے سوال پر دل ہی دل میں بہت ہنسی آئی۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے لئے ایک نہ یاد آنے والا خواب بنا رہوں۔

کچھ جھوٹ کچھ سچ

پہلا پردہ

(صریر کا دفتر کا کمرہ وقت گیارہ بجے قبل دوپہر)

صریر۔ تم خوب آنکلے لیکن اگر آج تم نہ آتے تو مجھے جسے کسی بات پر کبھی بھی تعجب نہیں ہوا تقدیر کی شکست پر ہنسی ضرور آتی۔

بدیعی۔ کیا معنی؟

صریر۔ تمہاری قسمت تم سے پہلے یہاں موجود ہے۔

بدیعی۔ آخر کون ہیں وہ مس قسمت؟

صریر۔ (آہ بھر کر) زندگی! زندگی!! تو بڑی مکارہ ہے اشکار کے دل میں پھندے کا شوق ڈالنا تیرا ہی کام ہے۔

بدیعی۔ آخر کچھ بکو گے بھی یا یونہی ایشیائی شاعری چھانٹو گے؟

صریر۔ خوب جانتے ہو کہ صریر انسانی حماقتوں کا دلدادہ ہے۔ اگر یہ حماقتیں نہ ہوتیں تو زندگی کس قدر فضول ہوتی؛ ان حماقتوں میں سے ایک پھلنے پھولنے والی حماقت کا سامان یہاں موجود تھا اور میری نگاہیں افق کو چھانے ڈالتی تھیں کہ اس سامان کا استعمال کیسے ہوگا مگر خدا مسبب الاسباب ہے۔ تمہارے آنے کا وہم گمان بھی نہ تھا مگر تم آنکلے۔ اس سامان کا نام مس ایمائی ہے۔ اسے محبت سے عشق سے، ہر قسم کی گرمجوشی سے بے انتہا اور دلی نفرت ہے۔

بدلیعی ۔ سبحان اللہ تو کیا اس چوبِ خشک میں مجھ سے آگ لگوائی جائے گی ؛

صریر ۔ ایک دن وہ حسبِ معمول مجھ سے اپنا فلسفہ بیان کر رہی تھیں کہ میرے مُنہ سے نکل گیا" افسوس بدلیعی گدھا یہاں نہیں ورنہ یہ سب تمہاری بہکی بہکی باتیں دھری کی دھری رہ جاتیں"۔ بولیں" کیا بدلیعی صاحب اس قدر حسین ہیں ؛" جواب میں بے ساختہ میرے مُنہ سے نکلا" نہ حسین ہے نہ عقلمند ہے مگر بالطبع مزاج شناس ہے اور آدمی تو کیا پتھر کو اپنی طرف مائل کر لیتا ہے" یہ کہہ کر تمہارا فوٹو انہیں دکھایا۔ فرمانے لگیں" شکل تو واجبی ہی سی ہے مگر خوش قسمت یہ شخص ضرور ہے کہ آپ اس کی تعریف فرماتے ہیں" یہ کہہ کر اُس نے بات پلٹ دی ۔ میں تمہارا فوٹو وہیں رکھ کر ایک منٹ کے لئے پہلو کے کمرے میں گیا۔ دل میں یہ تھا کہ کیا دوبارہ وہ تمہارا فوٹو دیکھیگی مگر مس ایمائی کچھ ایسی مستقیم الطبع واقع ہوئی ہے کہ اُس نے فوٹو کی طرف آنکھ تک نہ اُٹھائی ۔

بدلیعی ۔ تو کیا یہ ردی شدہ خاکسار اب اپنے آپ کو کسی ہینڈل تانبے کے پوڈر سے ذرا چمکا لے ؛

صریر ۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے اس چھ سال میں جہالت میں کس قدر ترقی کی ہے ۔

بدلیعی ۔ بات یہ ہے کہ جہالت کا میدان وسیع ہے اور انسانی کوشش محدود ۔ وہیں ہوں جہاں تھا ۔

صریر ۔ اسی لئے پوچھا تھا کہ آج چاء کے بعد یہاں مناظرہ ہے ۔ ایمائی ، بندہ ، مسز شان ہسٹر عقیدت تو بذاتِ خود موجود ہوں گے اور چھ کرسیوں پر چھ نمائندہ تکیے ہوں گے ۔ ایک شیخ صاحب ، ایک نواب صاحب ، ایک مولانا صاحب ، ایک لالہ جی ، ایک پنڈت جی اور ایک مہاتما ۔ یہ چھ کے چھ حضرات ہیں تو اہل الرائے مگر چونکہ وہ لیڈر ہیں انہیں چند منٹ سے زیادہ سچ بولنا یا سچ سُننا ناگوار گذرتا ہے اس لئے اُن کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے انہیں مدعو نہیں کیا جاتا اور اُن کی کرسی پر اُن کے نام سے تکیہ رکھ دیا جاتا ہے اور موقع مناسب پر اسی تکیے کی طرف سے نہایت دیانتداری سے تقریر کر دی جاتی ہے ، چونکہ ہم میں سے ہر ایک کو معلوم

ہے کہ یہ بزرگ کسی خاص مصلحت کو مدِ نظر رکھیں گے اس لئے اُن کی جانب سے اظہارِ رائے
میں غلطی کم ہوتی ہے اور ہمارا مناظرہ یک طرفہ نہیں رہتا۔ ہمارا مطلب بھی حل ہو جاتا ہے
اور اُن لوگوں کے اقتدار میں بھی فرق نہیں آتا اور عریانیِ حق کے شعلہائے سوزاں سے بھی
وہ لوگ بچے رہتے ہیں۔

بدلیعی۔ ایمانئی نے اپنا گڑیا کھیلنے کا شوق تم میں بھی ڈال دیا۔ خوب! تم اس سے شادی کیوں
نہیں کر لیتے؛

صریر۔ بجائے اس کے کہ تم مجھے شادی پر کوئی تحفہ دو میں تمہاری شادی پر تحفہ دینے کو ترجیح
دیتا ہوں۔

بدلیعی۔ بڑے زیاں کار ہو مگر ان مس ایمائی کا کچھ حلیہ تو بیان کرو۔ کیا اُن کا فوٹو یہاں ہے؛

صریر۔ فضول باتوں سے مجھے نفرت ہے۔ اب تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ مس ایمائی مقررہ وقت
سے صرف ایک منٹ پہلے آیا کرتی ہیں ڈیڑھ منٹ پہلے نہیں۔ چار بجے کا بلاوا ہے اور گول
کمرے میں چاء کے بعد بحث ہے۔

بدلیعی۔ مضمون کیا ہے؛

صریر۔ محبت (مسٹر بدلیعی ناک بھوں چڑھا کر اُٹھنے کو ہیں کہ صریر اُن کی طرف متوجہ ہو کر سوال کرتا
ہے) تم سے خدائی خوار سے یہ پوچھنا تو فضول ہے کہ کتنے دن یہاں ہو مگر چھ سال کی جُدائی
کی تلافی چھ ہفتوں سے کم میں کیا ہوگی۔ **بدلیعی**۔ دیکھا جائے گا۔

دوسرا پردہ

(صریر کا گول کمرہ۔ وقت بعد دوپہر)

مس ایمائی ٹھیک چار بج کر ایک منٹ بعد گول کمرے کے دروازے میں قدم رکھنے کو ہیں۔ ملازم دروازے کو کھول رہا ہے۔ اندر سے صریر استقبال کے لئے نکلنے کو ہے)

صریر۔ لیٹ، لیٹ، پورے دو منٹ۔ آج ہی تو حضور کا امتحان تھا اور آج ہی فیل۔

مس ایمائی۔ (مسکراتے ہوئے ہاتھ ملا کر) خدا جانے کیوں مگر دل نے یہی کہا کہ آج محض تفریح کے لئے عادت بدل دو مگر کیسا امتحان؟ (کمرے کے اندر داخل ہوتی ہیں)

صریر۔ لیجئے۔ مسٹر بدیعی سے ملئے۔ آج صبح بلا اطلاع وارد ہوئے۔ امتحان یہ کہ آپ کا اِن سے غائبانہ تعارف کراتے ہوئے یہ کہہ دیا تھا کہ آپ حسبِ عادت وقتِ مقررہ سے ایک منٹ پہلے تشریف لائیں گی۔

مس ایمائی۔ (بدیعی سے ہاتھ ملاتے ہوئے) آپ کا فوٹو گرافر قطعی نااہل ہے۔ ہے نا صریر؟ کیا یہی وہ آپ کے مسٹر مقناطیسی ہیں؟

صریر۔ جی ہاں۔

بدیعی۔ مس ایمائی آپ صریر کی بکواس پر نہ جائیے۔ خود ستائی کا یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ انسان اپنے دوستوں کو بہت بڑھیا ظاہر کرے اور اس میں صریر صاحب کو کمال حاصل ہے۔ (صریر دروازے کی طرف مسز شان کے استقبال کے لئے بڑھتا ہے)

ایمائی۔ (ہنس کر) تو کیا جو کچھ آپ سے صریر نے میرے متعلق تعریفی الفاظ استعمال کئے ہوں گے اُن کو بھی آپ جھوٹ تصوّر کرتے ہیں؟

بدیعی۔ قطعی۔ آپ تو انسان ہیں یعنی اس معنی ہیں کہ

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اور صریر نے لفظوں میں تو نہیں مگر لفظوں کے درمیانی سکوت میں آپ کو دیویوں کی دیوی ظاہر

کیا تھا۔

مس ایمائی۔ (نہایت تمکنت سے) سمجھی۔

بدیعی۔ کیا؟

ایمائی۔ یہ کہ آپ شاعر ہیں (یہ کہہ کر مس ایمائی مسز شان کی طرف بصد اخلاق جھکتی ہیں)

مس ایمائی۔ (مسز شان سے ہاتھ ملاتے ہوئے) مجھے اپنی رائے غلط ماننی پڑے گی۔

مسز شان۔ کیا رائے؟

مس ایمائی۔ یہ کہ آپ کو زعفرانی ساڑھی زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اب جو اس گلابی کو دیکھتی ہوں تو کہنا پڑتا ہے کہ جو رنگ آپ کے قریب ہو جائے وہی معزز ہے۔

مسز شان۔ (نہایت خلوص اور بھولے پن سے) ایمائی تمہاری خوشی کے لئے اگلی دفعہ ضرور زعفرانی ہی پہنوں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہاری کوئی بھی رائے غلط ہو سکے۔

(مسٹر عقیدت آتے ہیں۔ اُن سے بدیعی کا تعارف ہوتا ہے۔ چار پرچہ میگوئیاں ہوتی رہتی ہیں اور آخر کار ملازم چار کا سامان لے جاتے ہیں اور نشستوں کو ٹھیک کر کے کمرہ سے نکل جاتے ہیں۔ صریرچہ تکیے لا کر چھ کرسیوں پر رکھ دیتے ہیں۔ تکیہ پر پن سے نام کے پرچے لگے ہوئے ہیں۔ اتفاقِ رائے سے مسٹر بدیعی کو صدرِ جلسہ منتخب کیا جاتا ہے۔ اور کارروائی شروع ہوتی ہے)

بدیعی۔ شرفِ صدارت جو مجھے بخشا گیا ہے اُس کے لئے شکریہ ادا کرتا ہوں اور مس ایمائی سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اظہارِ خیالات سے ہماری خود تعلیمی کی کوششوں میں امداد کریں۔

مس ایمائی:۔

اس سے پہلے جلسہ میں میری تقریر عبادت کے مضمون پر تھی اور سامعین کو یاد ہوگا کہ میری تقریر

کا لب لباب یہ تھا کہ انسانوں کو فرداً فرداً بھی اور مجموعی طور پر بھی عبادت کی عادت سے زیادہ ذلیل کرنے والی اور ذلیل رکھنے والی اور عادات کم ہونگی مگر محبت کے مضمون پر غور کرتے ہوئے مجھے یہ معلوم ہوتا ہو کہ محبت کی عادت عبادت کی عادت سے بھی کہیں زیادہ مضر ہے۔ یہ لازمی ہے کہ جو وجوہات میں اپنے اس نتیجہ کے ثبوت میں پیش کروں گی ان کو پرکھنے کے لئے آپ محبت کے جو معنی میرے مدنظر ہیں اُن کو غور سے سمجھ لیں۔ محبت سے میرا مطلب اس جذبہ سے ہے جو مرد اور عورت کے درمیان انگریزی لفظ love سے بیان کیا جاتا ہے۔ وہ محبت میرے مدنظر نہیں جو بھائی کو بہن سے یا سہیلی کو سہیلی سے یا ماں کو بچے سے یا باہم مِل کر کام کرنے والوں کو ایک دوسرے سے ہوتی ہے محبت یا love کا کوئی ادنیٰ پہلو بھی میرے مدّ نظر نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ عورت اور مرد کے باہمی عشق کی اعلےٰ ترین صورت بھی ایسی ہی قابلِ نفرت ہے جیسی کہ اُس کی ادنیٰ ترین صورت چونکہ مجھے ایک ایسے فطرتی انسانی جذبہ پر بحث کرنی ہے جسے بعض شاعروں اور صوفیوں نے تمام روحانی ترقی کا مرکز قرار دے رکھا ہے اس لئے میرا فرض ہے کہ اپنے روکھے پھیکے الفاظ کو نہایت احتیاط سے استعمال کروں اور اب میں آپ سے ملتجی ہوں کہ جو وجوہات میں پیش کروں اُن کی آپ غور سے جانچ پڑتال فرمائیں۔

یہ امر بدیہی ہے کہ آغازِ شباب میں اور اس کے بعد کیا مرد کیا عورت بقائے نسل کی جبلّی خواہش میں مبتلا ہو کر ایک دوسرے کی طرف ایک زبردست کشش میں گرفتار ہو جاتے ہیں مگر بجائے فریب خوردہ تصوّر یہ کرتے ہیں کہ زندگی کی شان اسی میں ہے کہ یہ گرفتاری جاری رہے اور تازہ ہوتی رہے گو یا عقل یا شعور کو اس سے کچھ تعلق نہیں یہی وہ ارادت ہے جس کو فارسی شاعر نے یوں ادا کیا ہے

ناصح مرا گذار کہ دیوانۂ بتاں

با صد ہزار مردمِ عاقل برابر است

یعنی صرف یہی نہیں ہوتا کہ گرفتارِ فطرت ذلیل ہو بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس ذلت کو اعلیٰ ترین دانشمندی بیان کرے مگر مجھے ابھی یہ ثابت کرنا ہے کہ Love واقعی ذلت ہے۔ اگر اپنے آپ سے جھوٹ بولنا اور دانستہ اس جھوٹ پر جمے رہنا اور فریب سے اس جھوٹ کو معراجِ زندگی ظاہر کرنا موجبِ ذلت ہے تو یہ امر آسانی سے سمجھ میں آ جائے گا کہ بچہ پیدا کرنے کی خواہش پر جو کتوں، چوہوں، چھپکلی اور مکڑی میں بھی اسی شدت سے ہے جس سے انسانوں میں ہے۔ ناز کرنا اور ناز کر کے اُسے مجموعۂ محاسن بیان کرنا ضرور ایک ذلیل حرکت ہے۔ یہ تو Love کی اصلیت ہے۔ کون نہیں جانتا کہ تاریخی نور جہانوں اور دیول دیویوں کے حاصل کرنے کے ذرائع کیا ہیں یا اگر پسِ پردہ زندگی کو دیکھا جائے تو کس سے یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ بچے پیدا ہوتے رہتے ہیں اور وہ جذبہ جسے محبت کہا جاتا ہے مرتا رہتا ہے مگر میں ان پامال شدہ دقیانوسی وجوہات کو پیش کرتے ہوئے ہچکچاتی ہوں میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مردوں کا ظلم عورتوں پر ہے یا عورتوں کی جہالت سے مرد پامال ہیں اس مضمون کے لئے مرد اور عورت کو ایک دوسرے سے جُدا خیال کرنا ہی غلطی ہے۔ دونوں جیسے کہ ہیں اسی کشش میں گرفتاری کے باعث لیچر اور پوچ ہیں اور تاوقتیکہ Love کی جہنمی ماہیت کو ہر فردِ بشر پوری طرح ذہن نشین نہ کرے وہ انسان کہلانے کا مستحق نہیں۔ اب مختصراً میں وہ وجہ پیش کرتی ہوں جس پر میری تمام بحث کا مدار ہے۔

کسی دلفریب باغ کے نہایت ہی خوبصورت کونے میں بادل کے سائے اور ہوا کی اٹکھیلیوں سے متاثر ہو کر ایک بھولا بھالا نوجوان ایک نیک طینت لڑکی کو یقین دلاتا ہے کہ اُس لڑکی کے بغیر اُس کی زندگی عبث ہے۔ وہ لڑکی دل سے اُسے یقین کرتی ہے اور چند لمحوں کے لئے وہ نوجوان اور وہ دوشیزہ خوشی کے فلکِ ہفتم پر شاہنشاہی کرتے ہیں۔ بھولے پن سے ایک، دوسرے کی محبت بھری نگاہوں کے نشہ سے سرشار ہونا اور اس نشہ میں دنیا و مافیہا کو محو کر دینا، یہ ہے محبت کی بہترین تصویر۔

اگر محبت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہی رہے اور کوئی ناپسندیدہ نتائج اس سے برآمد نہ ہوں تو بھی میں کہوں گی کہ Sex سے زیادہ مخرب اخلاق کوئی جذبہ نہیں کیونکہ اُس کا لازمی جزو یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کو یقین دلاتا ہے کہ زندگی کا جزو کل سے فائق ہے۔ کسی خوددار ہستی کو کبھی یہ سننے کے لئے تیار نہیں ہونا چاہئے کہ کسی دوسری ہستی کی مدد یا خدمت کے بغیر اُس کی اپنی ہستی عبث ہے اور جو کسی اور کو ایسی بات کہے اُسے قانونی سزا ملنی چاہئے۔ انسانوں نے یہ قانون تو بنا لیا کہ جو شخص کسی دوسرے شخص کے چار پیسے چُرا لے وہ قید کیا جائے مگر یہ قانون نہ بنایا کہ جو شخص کسی دوسرے شخص سے خودداری سرقہ کرے اُسے بھی قید یا جُرمانہ ہو حالانکہ صاف ظاہر ہے کہ کسی سے کہنا کہ میری زندگی تمہارے بغیر عبث ہے اپنی خودداری کو بُری طرح کچلنا ہے اور سننے والے کی نسبت یہ فرض کر لینا ہے کہ وہ اس قدر بیہودہ اور سادہ لوح ہے کہ اس کے دل میں اس قسم کے اناپ شناپ کی عزت ہو سکتی ہے۔

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں اظہارِ محبت کو بدترین اخلاقی جرم تصور کرتی ہوں۔ دل میں محبت پیدا ہونے سے توفی الحال شاید مفر نہیں مگر اس کمزوری کو ہنس کر ٹال دینا دانشمندی سے زیادہ قریب ہے اور اس کا اظہار اخلاقی استواری کے لئے قطعی سمِ قاتل ہے۔

آپ نے ضرور سوچ لیا ہوگا کہ اس Debating society کے پہلے اصول کو کہ انسانی حالات پر بحث کرتے ہوئے ہمیشہ اعلےٰ ترین پہلو کو مدِّنظر رکھا جائے فراموش نہیں کیا گیا۔ ہماری اس زندگی میں کیا چیزیں اچھی ہیں؛ باغ، قلعے، پُل، جہاز، ریلیں، سڑکیں، عجائب خانے، تجارت و زراعت کے کرشمے، نظامِ حکومت کے دفاتر اور ڈاک خانے مگر ان سب کو قائم و دائم رکھنے کے لئے lovers کی جماعت قطعی نااہل ہے۔ جو شخص کسی اور سے کہہ سکتا ہے کہ تمہارے بغیر زندگی عبث ہے اور یہ کہے بغیر اس زمانے میں Love کا دعوےٰ فضول ہے وہ اس قابل

نہیں کہ کوئی ذمہ داری کا کام اس کے سپرد کیا جائے۔ Love گویا ایک قسم کی اخلاقی موت ہے اور ہمارا فرض ہے کہ جہاں تک ہمارے بس میں ہو اس مہلک وبا کو دبائے رکھیں زندگی کا جو حصہ محبت اور عبادت میں برباد ہوتا ہے اسے اگر مفید کاموں میں صرف کیا جائے تو یہ دنیا کہیں سے کہیں پہنچ جائے۔

مسٹر نشان۔ میں مس ایمائی کی تقریر مطلقاً نہیں سمجھی۔ ہماری سوسائٹی کا یہ بھی قاعدہ ہے کہ صرف ان مضامین پر بحث ہو جو ہندوستان کے حسب حال ہوں۔ جہاں تک میری معلومات ہیں ہندوستان میں بچے خدا کے حکم سے پیدا ہوتے ہیں اور محبت کو اُن کی پیدائش سے مطلقاً سروکار نہیں۔ دوسرا امر جو قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ اگر Love واقعی لچر اور پوچ ہے اور یہ امر مسلّمہ ہے کہ ہندوستان میں Love کا وجود نہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہر بات میں ہمارا ملک پیچھے ہے؟ ہمیں تو اگر سب سے آگے نہیں تو برابر تو ہونا چاہئے تھا۔ یورپ میں عبادت نہیں Love ہے یہاں Love نہیں عبادت ہے گویا ایک بات میں ہم ذلیل ہیں ایک بات میں وہ پھر زندگی میں اس قدر فرق کیوں ہے؟

مہاتما جی (بزبانِ صدر) محبت کے مضمون کو سمجھنے کے لئے انسان کو گیتا کے سمندر کا غواص ہونا چاہئے۔ کرشن جی مہاراج نے اپنی روحانی تعلیم سے محبّت کو وہ شاندار مرتبہ دیا ہے کہ یورپ کے ماہرین بھی دنگ ہیں۔ جب تک انسان گیتا کے معارف سے فیض یاب نہ ہو وہ خیال ہی نہیں کر سکتا کہ کن حالات میں خود اپنی بیوی سے ترکِ محبت بھی عین عشق ہے۔ مس ایمائی اظہارِ محبت سے متنفّر ہیں۔ مگر انہیں کیا پتہ کہ بعض دفعہ عدم اظہار ہی بہترین اظہار ہے۔

نواب صاحب (بزبان مسٹر عقیدت) اگر مس ایمائی مرد ہوتیں اور اگر اُنہوں نے کسی مشہور گویّا طوائف کا گانا سنا ہوتا تو یہ شبہ کرنے کی گنجائش ہو سکتی تھی کہ انہیں اس مضمون سے کچھ مس ہے

میری رائے میں انہیں اتنا بھی پتا نہیں کہ محبت میں اور فلسفۂ محبت میں زمین آسمان کا فرق ہے ان کی تقریر فلسفۂ محبت پر شاید کچھ روشنی ڈال سکے مگر محبت پر ہرگز نہیں۔

مولانا صاحب۔ (بزبانِ مس ایمانی) عقائدِ اسلامی میں منکوحہ مرد و عورت کے مابین انصاف شرط ہے محبت کا مذکور نہیں۔ باقی رہا اظہارِ محبت کا مضمون کسی امر کا بھی اظہار ہو وہ اچھے طریقے سے بھی ہو سکتا ہے اور بُرے طریقے سے بھی اور اس نقطۂ خیال سے مس ایمانی کی تقریر چنداں معنی خیز نہیں۔ کثرتِ ازدواج کا ایک فائدہ یہ ہے کہ بیویاں ایک دوسرے سے اچھے طریقے والا اظہارِ محبت اخذ کریں۔

پنڈت جی۔ (بزبانِ صریر) ہمارے متبرک شاستروں کی تعلیم سے اگر مس ایمانی کو کچھ واقفیت ہوتی تو اُن کی رائے میں کچھ نہ کچھ تغیر ضرور ہوتا۔ سوئمبر کی رسم دُنیا میں لاثانی ہے لفظی اظہار کی بجائے اظہارِ محبت بذریعہ انتخاب ہوتا ہے گویا مس ایمانی کا اعتراض ہندو واضعانِ رسوم نے ہزارہا سال سے پہلے ہی رفع کر دیا ہے۔

لالہ جی (بزبانِ مسز شان) مجھے مس ایمانی سے پورا اتفاق ہے۔ محبت سے فضول خرچی کی عادت زیادہ ہوتی ہے اور اس لئے ہندو سوسائٹی نے شروع سے ہی یہ تخصیصی انتظام کر دیا ہے کہ سنِ شعور سے پہلے ہی دو چار بچے ہو جائیں۔ جس اظہارِ محبت پر مس ایمانی کو سچا اعتراض ہے اُس کا موقع ہی پیدا نہیں ہوتا۔

شیخ صاحب (بزبانِ مس ایمانی) اگر مس ایمانی کی رائے کو تسلیم کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ تمام اُردو فارسی شاعری غلط ہے اور شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کا کلام اور حافظ شیرازی کا دیوان گویا فضول ہیں۔ میری رائے میں عوام الناس میں اس قسم کی بدعت کا تذکرہ سخت خطرناک ہے۔

صریر۔ حسب عادت ہمارے شاندار لیڈروں نے نفسِ مضمون پر تو غور نہیں فرمایا اور ادھر اُدھر کی ہانکیں

ہانک دیں۔ سوال جو مس ایمائی نے اپنی نہایت دلیرانہ تقریر میں پیدا کیا ہے صرف یہ ہے کہ کیا محبت خودداری کے منافی ہے اور کیا اگر خودداری اولی ترین انسانی فرض ہے تو اظہارِ محبت معیوب نہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ خودداری کے بغیر زندگی ناممکن ہے۔ میری یہ بھی رائے ہے کہ دراصل کسی اور سے محبت جتانا محض اپنے آپ سے زیادہ محبت کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اور اس لئے اگر لوگوں میں سچ بولنے کی عادت ہو تو عاشق کو معشوقہ کو مخاطب کرکے یہ کہنا چاہئے کہ تمہیں دیکھ کر میری خود اپنے آپ سے محبت بڑھتی ہے۔ غالباً مس ایمائی کو اس طریقِ اظہارِ محبت پر چنداں اعتراض نہ ہوگا۔

مس ایمائی۔ چونکہ مسٹر عقیدت اس مضمون پر بحث کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جواب میں صرف چند لفظ کہنا چاہتی ہوں۔ محبت چاہے انتخاب سے ظاہر کی جائے اور چاہے نفیِ اظہار سے اور چاہے مزید خودپسندی کی شان سے ہر حال میں تضیعِ اوقات ہے۔ زندگی نہ محبت کرنے کے لئے ہے نہ خودداری کے نشہ میں غرق رہنے کے لئے۔ خودداری ایک مفید مشین ہے مگر محض مشین ایک قسم کی موٹر کار جس میں سوار ہوکر انسان خوشی خوشی کام کو جلدی سے جا سکے۔ جو لوگ عبادت یا محبت یا خودداری کو زندگی جانتے ہیں وہ اس انسان کی طرح ہیں جو اپنی موٹر کار کے گن گاتا رہے مگر اس میں سوار کبھی نہ ہو۔ قابلِ قدر زندگی صرف وہی ہے جو اپنے آپ سے آزاد ہوکر کسی ساخت میں مصروف ہو۔ اظہارِ محبت چونکہ ہر قسم کی ساخت میں ہارج ہے اسی لئے معیوب ہے۔

بدلیجی۔ آپ کے صدر ہونے کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ ہر ایک مقرر کا شکریہ ادا کروں مگر مشکل یہ آ پڑی ہے کہ میرا رونگٹا رونگٹا کارروائی کے اس حصّہ کے خلاف ہے کہ دو تکیوں کی طرف سے مسٹر صریر نے تقریر کردی ایک کی طرف سے مسٹر عقیدت نے۔ دو کی طرف سے مس ایمائی نے۔ لاحول ولا قوۃ آپ کو کوئی حق نہیں کہ اکابرینِ قوم کا اس طرح مذاق اُڑائیں۔ اگر کسی کو اُن سے اختلاف

ہے تو میدان میں کھلم کھلا اُن کا مقابلہ کیا جائے نہ یہ کہ گھر میں ایک فرضی ناٹک قائم کر کے تالیاں پیٹ لیں اور دل ہی دل میں خوش ہو گئے کہ ہمارے لیڈر ڈبل دقیانوسی ہیں۔ اس قسم کی کارروائی کو ہمیشہ کے لئے بند کرنا چاہئے۔

ایک اور امر قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ کہ محبت یا اظہارِ محبت کا ذاتی تجربہ سے کسی نے ذکر نہ کیا۔ تمام بحث فضول قسم کی کتابی بحث تھی۔ چونکہ سچ بولنے کی ممانعت نہیں مجھے یہ کہنے کی جرأت ہے کہ اصلی اور نقلی بیسیوں قسم کی محبت کی شاہراہیں طے کر چکا ہوں اور میرا تجربہ یہ ہے کہ جتنی مختلف قسم کی محبت کسی نے کی ہو اسی قدر وہ ساخت کے کاموں میں زیادہ مفید ہوتا ہے اور اس کی محبت قابل قدر ہوتی ہے۔ بغیر مشق کے گھاس چھیلنی تو آتی نہیں محبت کرنا کیسے آئے۔ فنونِ لطیفہ میں یہ بھی ایک فن ہے اور کوئی کوئی اس میں ماہر ہو سکتا ہے۔ اور فنون کی طرح اس کے لئے بھی بے انتہا محنت کوشش اور علم کی ضرورت ہے تب جا کر کہیں محبت کرنے کا اور محبت کرانے کا اصلی لطف حاصل ہوتا ہے۔ مس ایمائی نے بہت زور مارا تو باغ کے خوبصورت کونے میں لڑکے اور لڑکی کو بالمقابل کر کے چند رسمی الفاظ اُن سے ادا کرا دیئے۔ انہیں اتنا بھی پتہ نہیں کہ نا تجربہ کار ایسے سینکڑوں موقعے ضائع کر کے تب کہیں لڑکھڑاتی زبان سے دو چار جملے بکتے ہیں اور پھر خود بخود ہی شرما جاتے ہیں اس قسم کے الھڑپن کے اظہارِ محبت کو اصلی محبت سے وہی نسبت ہے جو بیل گاڑی کو موٹر کار سے ہے۔ میں اپنا قیمتی وقت اس مضمون پر زیادہ صرف کرنا پسند نہیں کرتا اور یہ کہہ کر ختم کرتا ہوں کہ اس قسم کی نکتہ چین تقریر سے میرا مدعا دل آزاری نہیں۔ محبت کی گھاتوں میں سے یہ بھی ایک گھات ہے۔ (جلسہ برخاست ہوتا ہے)

تیسرا پردہ

اصریہ کا گول کمرہ۔ وقت دس بجے رات کھانے کے بعد۔ صریہ آدھے گھنٹے کے لئے

ضروری کام کو جاتا ہے۔ صرف مس ایمائی اور بدیعی بالمقابل کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ بدیعی کے ہاتھ میں سبز شراب کا گلاس ہے)

بدیعی۔ (گلاس کو روشنی کے بالمقابل کر کے) آپ کے خوبصورت emerald کا ہمزاد ہے۔

ایمائی۔ کیا آپ کو شراب سے محبت ہے؟

بدیعی۔ بے حد۔

ایمائی۔ پھر آپ پیتے کیوں نہیں؟

بدیعی۔ جس چیز سے محبت ہو اُسے آدمی نگلتا نہیں۔

ایمائی۔ مجھے تو شراب سے عداوت ہے۔

بدیعی۔ پھر تو جہاں ملے نہ چھوڑیئے۔

ایمائی۔ ایسے اُلٹے فلسفے آپ ہی کو مبارک ہوں۔

بدیعی۔ (گلاس رکھ کر نہایت ادب سے) صریر ہم دونوں کی شادی کی فکر میں ہے۔

ایمائی۔ مجھے بھی کچھ شبہ ہوا تھا۔ بچارا صریر۔

بدیعی۔ بچارا کیوں؟

ایمائی۔ آپ تو اُن کے دوست ہیں آپ کو سب پتہ ہوگا۔

بدیعی۔ واللہ باللہ مجھے کچھ علم نہیں۔ چھ سال ہوئے لنڈن میں ہم ایک دوسرے سے جُدا ہوئے۔ اس کے بعد خط ضرور آتے رہے مگر کہاں حضور کا یہ حیدر آباد دکن کہاں مجھ غریب کا لاہور۔ صریر میرا ہیرو تھا اور ہے مگر نہ مل سکا پر نہ مل سکا۔ دو روز ہوئے کہ یک لخت دل میں ولولہ سا اُٹھا کہ اگر فوراً صریر کو نہ دیکھا تو جینا حرام ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کی بابت سب کچھ علم ہے مگر نہ اُسے پتہ ہے کہ میں کیوں شادی نہیں کرتا نہ مجھے پتہ ہے کہ وہ کیوں اب تک آزاد ہے۔ اگر آپ کو علم ہو تو ضرور مجھے باخبر کیجئے۔

ایمائی ۔ شکر ہے کہ ایک بات تو ہم دونوں کی مشترکہ ہے۔

بدیعی ۔ کیا؟

ایمائی ۔ یہ کہ صریر میرا بھی ہیرو ہے۔

بدیعی ۔ خوش قسمت صریر۔

ایمائی ۔ بیچارا صریر۔

بدیعی ۔ آخر کیوں؟

ایمائی ۔ سنئے ۔ صریر کو میری آپا سعیدہ سے اور آپا کو اُن سے بے انتہا محبت ہے، اُس سے بھی زیادہ جو اچھے سے اچھے افسانے میں مل سکے مگر اُن کی شادی نہیں ہوسکتی۔

بدیعی ۔ کیوں؟

ایمائی ۔ اس لئے کہ اُن دونوں نے ایک ہی انّا کا دودھ پی لیا تھا گو وہ ان سے تین سال چھوٹی ہیں۔

بدیعی ۔ کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ صریر کی اگر ایک خوشی پوری نہیں ہوسکتی تو دوسری بھی نہ ہو۔

ایمائی ۔ یہ آپ صریر سے ہی پوچھئے ۔ ہندوستان میں ابھی وقت نہیں آیا کہ لڑکیاں اپنی نسبت خود کریں اور کیا صریر سے آپ کو اس قدر محبت ہے کہ ان کا ذکر بیچ میں چھوڑ اپنا قصہ شروع۔

بدیعی ۔ اگر میں صریر کی جگہ ہوتا تو فوراً کسی اور ملک میں جاکر نکاح کر لیتا۔

ایمائی ۔ یہی تو آپ میں اور اُن میں فرق ہے ۔ وہ اوروں کا خیال کرتے ہیں آپ صرف اپنا۔

بدیعی ۔ میں ایسا بُرا نہیں ۔ میرا مذہب بغاوت ہے اور اپنی پیاری خوشی کے لئے ہر وقت ہر قسم کا جرم کرنے کو تیار ہوں ۔ عاشق کو معشوقہ کی خوشی کے مقابلے میں دنیا اور خدا کسی کی بھی پروا نہیں ہونی چاہئے مگر آپ عشق کو کیا سمجھیں

ایمائی ۔ ممکنات کے تصور سے اُس کا چہرہ تمتمانے لگتا ہے) یہ آپ کی محض کہنے کی باتیں ہیں یا واقعی؟

بدیعی ۔ پہلے اپنا نام بتاؤ؟

ایمانی۔ (غائبانہ طریقے سے) حمیدہ

بدیعی۔ حمیدہ! تمہارا اکھڑ پنجابی جو کچھ کہہ رہا تھا دل سے کہہ رہا تھا اور تمہارے ہی لئے کہہ رہا تھا مگر تم تو اظہارِ محبت کو ذلیل خیال کرتی ہو۔

حمیدہ۔ وہ تو محض میرا جھوٹ تھا۔ صرف اس لئے کہ کسی طرح صریر آپا کا خیال چھوڑ دے۔ صرف ان دونوں کی خاطر محبت کو بُرا کہتی تھی ورنہ مجھ غریب کا محبت نے کیا نقصان کیا ہے کہ میں اسے مٹاؤں۔

بدیعی۔ میں نے بھی اپنی تقریر میں جو یہ کہا کہ عشق کے پختہ کاروں میں سے ہوں وہ جھوٹ تھا آؤ اب موٹر کی سیر کو چلیں (صریر اور سعیدہ کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ صریر بدیعی سے آنکھیں ملا کر مسکراتا ہے سعیدہ بدیعی کو نہیں دیکھتی اور بھاگ کر حمیدہ سے لپٹ جاتی ہے)

سعیدہ۔ حمو! حمو! سنو تو۔ وہ انا والی بات غلط نکلی۔ صریر کی اور میری انا ایک نہ تھی بلکہ دو توام بہنیں تھیں۔ یہ بات آج شام کو قطعی طور پر ثابت ہو گئی۔ ہماری نسبت بھی ہو گئی۔ حمو تمہیں کیا ہوا! تم تو کچھ خوش نظر نہیں آتی ہو۔

حمیدہ۔ آپا بے انتہا خوش ہوں صرف اس بیچارے پنجابی پر رحم آتا ہے؛ (اس وقت بدیعی کا تعارف سعیدہ سے ہوتا ہے)

سعیدہ۔ معاف کیجئے آپ کو دیکھا نہ تھا۔

بدیعی۔ معاف کیجئے اس وقت تو معاف کرنے کی فرصت نہیں۔ حمیدہ اور میں موٹر میں سیر کو جا رہے ہیں لیکن اگر آپ کا دل چاہے تو ہمیں مبارکباد دے دیجئے۔ ہماری بھی منگنی ہو گئی ہے۔

سعیدہ۔ سچ مچ۔

بدیعی۔ بھابی اور آپا اور یہ سردھری (لپک کر سعیدہ کو خوب بھینچ کر گلے لگاتا ہے)۔ اب آیا یقین!

سعیدہ۔ صریر کہتے تھے کہ لندن میں تمہارا نام طوفان تھا، تم اب بھی وہی ہو۔

فرانس اور ہندوستان

ساری دُنیا میں سب سے بھولا ملک فرانس ہے۔ جسے یہ باور نہ ہو فرانسیسی بیوی سے شادی کر کے خود آزما لے۔ اور ملکوں میں سادگی کی کچھ نہ کچھ انتہا ہے مگر فرانس کو دُنیا سو دفعہ دھوکا دے چکی ہے اور ابھی سو دفعہ اور دے گی پر اس پر بھی فرانس والے بھولے پن کی باتیں نہ چھوڑیں گے۔ نہر سویز بنائی فرانس کے سپوت فرڈیننڈ ڈی لسپس نے، اڑا لے گئے کوئی اور۔ پانا ما نہر کا جب چرچا ہوا تو فرانس کا سونا پانی کی طرح بہا۔ پہلا تلخ تجربہ کسی کام نہ آیا اور آخر فرانس کا شروع کیا ہوا کام امریکا نے تیس سال بعد اکتوبر ۱۹۱۳ء میں پورا کیا۔ اس سودے میں فرانس کے حصے میں گھاٹا، ندامت اور بدنظمی آئے اور امریکا کے حصہ میں تجارت، اقتدار اور طاقت۔ جنگِ عظیم میں تو فرانس کے بھولے پن کی ہزاروں مثالیں زبان زدِ خلق ہیں مگر وہی ایک ذکر کافی ہے کہ جب ایک خاص نازک موقع پر شہرۂ آفاق موسیو کلیمنسو سے پوچھا گیا کہ آپ کی پالیسی کیا ہے تو فرمانے لگے:۔

"گھر میں لڑتا ہوں۔ باہر لڑتا ہوں۔ زندگی کے اخیر پندرہ منٹ تک لڑوں گا۔ اور میری پالیسی کیا ہے؟" اور ان چند سادہ جملوں کا وہ برقی اثر ہوا کہ فرانس کی اس وقت کی سیاسی زندگی کے قالب میں گویا نئی رُوح پھنک گئی۔ چار سو ڈپٹیوں نے ہاں میں ہاں ملا دی اور فرانس کے سپاہی کٹنے مرنے پر تُلے رہے۔ بھولے فرانس نے ایک دفعہ بھی نہ پوچھا کہ صاحب آپ لڑتے تو ہیں مگر نتیجہ؟ جنگِ عظیم کے بعد جب انگلستان اور امریکا دونوں سے توقع اُٹھ گئی تو فرانس نے جرمنی پر اعتبار کر لیا۔ جرمنی نے روکھا پھیکا سا جواب دیا تو فرانس اپنے جانی دشمن پوپ سے علیک سلیک کر کے خوش ہو گیا۔ اور جب وہاں سے بھی نامرادی نظر

آئی تو پھر انگلستان سے بات چیت ہونے لگی۔

یہ تو خیر ساری دُنیا کو علم ہو چکا ہے کہ فرانس کا روپیہ سمیٹنا ہو تو فرانس کی دوستی کا دم بھرو اور کوئی بودی سی کمپنی چلا دو۔ فرانس میں اس کا چرچا کرو اور پھر اگر قسمت یاوری کرے تو روپیہ کا کال نہیں رہتا۔ اس مجرب نسخے سے کئی غیر فرانسیسی کمپنیاں مالامال اور کئی ہزار غریب فرانسیسی خاندان برباد ہو چکے ہیں اور ابھی تک فرانس میں بے اعتباری پیدا نہیں ہوئی۔ روس نے تو فرانس کا ہزاروں من سونا کچا چبالیا مگر اُس زمانے میں روس کا ہاضمہ تیز تھا اور یہ کچھ تعجب خیز نہیں۔ تعجب خیز یہ ہے کہ مریض ترک بھی لقمۂ طلائی سے پرہیز نہ کر سکا۔

بقول ایک مورخ "اگر مورخ تاریخ کی کتابوں میں واقعات درج نہ کریں اور واقعات سے نتائج اخذ کرنے کی علت چھوڑ دیں تو تاریخوں میں کس قدر بیش بہا اضافہ ہو!" فرانس کی جبلّی عادت ہے کہ اپنے آپ کو بھولے پن سے دھوکا دے کر خوش ہو۔ فرانس والے خوش رہنا چاہتے ہیں۔ خوشی ایک قسم کا دھوکا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ساری دُنیا میں سب سے بھولا ملک فرانس ہے۔

(۲)

ساری دنیا میں سب سے چالاک ملک ہندوستان ہے جسے یہ باور نہ ہو ہندوستانی بیوی سے شادی کر کے خود آزما لے۔ آج شادی کل بچہ پرسوں اُس کی تقریب۔ ساتھ کے ساتھ بیماری پھر اپنا مرنا۔ اس قدر چالاک بیویاں ہیں کہ کسی اور پر شوہر کو مرنے کی فرصت ہی نہیں دیتیں۔ جو حال ہندوستان کی بیویاں اپنے شوہروں کا کرتی ہیں وہی حال ہندوستان اپنے غیر ہندوستانی حکمرانوں کا کرتا ہے مگر اس کی تہ میں جو چالاکی ہے اُس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔ ابھی کل کی بات ہے کہ انگلستان اور ہندوستان کی شادی ہوئی تھی۔ رنگون میں سارے ہندوستان کا آخری دہلوی تاجدار اور کلکتہ میں لکھنؤ کا آخری لکھنوی فرمانروا شاید ابھی نظروں کے سامنے تھے یا یونہی سے اوجھل ہوئے تھے کہ ملکۂ معظمہ نے قیصرِ ہند

کے شاندار لقب سے مغرب مشرق کا عقد رچایا تھا۔ غدر کے بعد کا اعلان گویا منگنی تھی۔ قیصری دربار گویا بیاہ۔ جھٹ منگنی پٹ بیاہ اور ساتھ ہی کانگرس سی بے چین بچّی۔ یہ بھی ہندوستان کی چالاکی تھی کہ پلوٹھی کا بچّہ بجائے لڑکے کے لڑکی۔ اب اس بچّی نے بھی بچہ دے ڈالا یعنی آل پارٹیز کانفرنس۔ دیکھنا چاہیئے کہ یہ نئی بی کیا گل کھلاتی ہیں مگر ہندوستان کی اصل چالاکی ایک گہرا فطرتی راز ہے۔ کئی ہزار سال سے ہندوستان کا منصوبہ یہ ہے کہ غیر ملکوں سے لوگوں کو ورغلا کر یہاں لایا جائے۔ انہیں حکومت پسندی سکھا کر کمزور کیا جائے اور یہ چال یہاں تک کھیلی جائے کہ ساری دُنیا میں کوئی اس ذلّت سے بچ نہ سکے۔ پہلی آریہ لوگوں کو یہاں بلا کر خوار کیا گیا۔ پھر بیچارے سکندرِ اعظم کو کشاں کشاں لایا گیا (جاتے ہی جان سے گیا) پھر وسطِ ایشیا کے تاتاری آئے۔ چغتائی آئے۔ ایران کا قزلباش۔ افغانستان کا دُرّانی اور کیا کیا۔ ہندوستان کا وہی ایک پُرانا منصوبہ ہے کہ باری باری سب کو ضعیف کر دیا جائے۔ آج کل انگریز بیچارے تختۂ مشق ہیں اس قدر انہیں حکومت پسند بنایا جا رہا ہے کہ جب واپس جاتے ہیں تو خود اُن کے اہلِ وطن اُن کی "کوئی ہے؟" کی ہانک سے چونک اُٹھتے ہیں۔ اصل منشا یہی ہے کہ جب باری باری سب قومیں (کیا انگریز کیا جاپانی کیا چینی) ہندوستان پر حکومت کر کے کمزور ہو جائیں تو پھر ہندوستان ایک دم ساری دنیا پر حاوی ہو کر شاہنشاہی کرنے لگے۔ یہاں کی غربت، افلاس، بیماریاں سب کی سب اس مرکزی چالاکی کی معاونِ تدابیر ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو ہندوستان کو مجبوراً خوش ہونا پڑے مگر خوشی ایک دھوکا ہے۔ (ہندوستان کے فلاسفر پہلے ہی یہ لکھ چکے ہیں) اور اس لئے اس دھوکے سے بچنے کے لئے انسان کو بیمار اور مفلس اور محکوم اور مظلوم رہنا لازمی ہے۔

(۳)

سوال یہ ہے کہ قدیم ہندوستان کی یہ خوفناک سازش جسے آج پہلی دفعہ ہمایوں میں طشت ازبام کیا جا رہا ہے اگرچہ جس کا در اصل دنیا کے پاس علاج کچھ نہیں کیونکہ جب انگریزوں جیسی قوم ہندوستان کے

دامِ فریب میں گرفتار ہو چکی تو باقی قومیں کس گنتی میں ہیں، جب پوری طرح کامیابی ہو گی تو کیا اُس وقت بھی فرانس بھولا ہی رہے گا۔ اور ہندوستان بدستور چالاک رہے گا۔ یا اِن خصائل میں ردوبدل ہو گی، ایک بات تو قطعی یقینی ہے یعنی یہ کہ عارضی وفا کی وہ دیوی جسے غلط العام میں فرانسیسی عورت کہا جاتا ہے اور دائمی جفا کی وہ کالی ماتا جسے اصطلاحاً ہندوستانی بیوی کہا جاتا ہے اپنی عادت نہ بدلیں گی۔ اوّل الذکر بچہ پیدا کرنا نہیں چاہتی، موخر الذکر کو بچہ پیدا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔

مگر جس بات سے شک پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جہاں ہندوستان میں اور لاکھوں متعدی بیماریاں ہیں وہاں کہیں خوشی کا مرض لاحق نہ ہو جائے۔ فرانس کا تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ خوشی ضرور متعدی ہے۔ ہندوستانی دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہندوستان میں خوشی نہ آئے کیونکہ خوشی آئی تو ہندوستان گیا۔ گویا یہ لازم ہوا کہ ہندوستان اور فرانس کے درمیان معاشرتی پردہ مستحکم کیا جائے ورنہ بالکل ممکن ہے کہ اگر یہ پردہ قائم نہ رہا تو فرانس سے خوشی کا مرض ہندوستان میں کھیل جائے اور یہاں بجائے اُس ریں ریں کے چرخے کے (جس کے مسٹر گاندھی بڑے پیغمبر ہیں) ناچ اور رنگ کی محفلیں قائم ہو جائیں اور ہندوستان کا اصل مطلب یعنی یہ کہ ہندوستان ساری دُنیا سے اپنے اوپر حکومت کرا کے پھر ساری دنیا پر مسلط ہو افوت ہو جائے۔ کیونکہ اگر ہندوستان خوش ہوا تو ہندوستان ہی نہیں رہے گا تو پھر ساری دنیا پر ہماری حکومت کس کام کی۔

(۴)

جو چالاک ہوتے ہیں وہ ثابت قدم ضرور ہوتے ہیں۔ نہ اُبھتے ہیں نہ گرتے ہیں۔ پڑے پڑے پٹا کرتے ہیں۔ اُس اپنی اصلی دُھن میں کہ پیٹنے والے خود تھک تھکا کر دفع ہو جائیں گے اور پھر ہم اُٹھ کر سب کچھ سنبھال لیں گے۔ اُن میں فرانسیسیوں والی عادت نہیں ہوتی کہ "لڑیں گے اور مریں گے"۔ وہ نفع نقصان سوچا کرتے ہیں۔ تیل دیکھتے ہیں تیل کی دھار دیکھتے ہیں۔ یہ قدرتی پردہ تو بھولے اور چالاکوں

میں ضرور ہے مگر وہ معاشرتی پردہ جس کی ہندوستان کو ضرورت ہے اور جس کے بغیر فرانس ہماری آنے والی عظمت کے لئے ایک مہلک خطرہ ہے کس طرح قائم ہو؟ سب سے پہلے تو یہ لازم ہے کہ فرانس کے خلاف ایک بھاری پروپیگنڈا شروع کیا جائے کہ ہندوستان کا اگر کوئی دشمن ہے تو فرانس ہے۔ اس شدت سے اس امر کی تلقین کی جائے کہ ہندوستان میں ہر کہ ومہ فرانس کے نام سے بیزار ہو جائے۔ اور اس پروپیگنڈا کا بھی شروع کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ جس طرح ہمارے بزرگوں نے کئی ہزار سال پہلے یہ پالیسی اختیار کر لی تھی کہ دُنیا کی قوموں کو یکے بعد دیگرے کمزور کرنا چاہئے اسی طرح ہم کو بھی اپنی آئندہ عظمت سے کئی ہزار سال پہلے اس خطرہ کا تدارک کرنا چاہئے جو تب ہمارے لئے شاید نمودار ہو۔ وہ قومیں محض بے وقوف ہیں جو اپنی پالیسی دس بیس سال کے مستقبل کو مدِنظر رکھ کر قائم کرتی ہیں۔ جس طرح روحانی معاملات میں ہندوستان نے آواگون کے چوراسی لاکھ قالب کے جال کو پھاڑ کر صرف نروان مدنظر رکھا ہے اسی طرح سیاسی معاملات میں بھی ہم کو چوراسی ہزار سال نہیں تو کم از کم چوراسی سو سال پیشتر اپنی پالیسی قائم کرنی چاہئے۔ باقی سب دُنیا سے ہم نپٹ سکتے ہیں اور ضرور نپٹ لیں گے صرف وقت کی دقت ہے اور اس کی ہمیں کچھ پروا نہیں مگر فرانس، بھولا فرانس، بھال اوروں کا تو خیر کیا ذکر خود میاں کا بیوی سے کرا کر دل لبھا لیتی ہے، وہ مہیب خطرہ ہے جس کا فوری تدارک لازم ہے۔ اس لئے اگر ہمیں کامیاب ہونا ہے تو اولین فرض یہ ہے کہ حسب ذیل تجاویز پر عمل کیا جائے۔

ا۔ جو ہندوستانی بیوی تیس سال کی عمر میں نانی اور چالیس سال کی عمر میں بڑھیا نہ ہو اُسے دو تین من سونا پہنا کر کافی گہری جگہ گنگا اشنان دیا جائے۔ وہ سونا پھر کام آسکتا ہے۔

ب۔ خوشی کے خلاف ہر بندرگاہ میں، ہر شہر میں، ہر گاؤں میں بلکہ ہر زوج میں ایک (QUA-RAN TINE) قرنطینہ قائم کی جائے۔ اس پر بھی اگر خوش رہنے کا مرض پھیلے یعنی کوئی

کسی کو دیکھ کر یا یاد کر کے خوش ہو تو اسے فوراً قتل کر دیا جائے۔

ج۔ فی شہری قوم کم از کم تین لیڈر رہونے لازمی ہیں۔ ان میں سے ایک مذہب کا، ایک ماضی کا، اور ایک مستقبل کا حامی ہو مگر سب کے سب خوشنما ساڑھی، پتلی کمر سے محبت کرنے کے خلاف ہوں۔ نہ صرف اُن کا لباس بلکہ اُن کی رُوح بھی موٹے کھدڑ کی ہو۔

آنکھ کا جادُو

ڈراما

مصنف

مصنف کا دوست

مصنف کی معشوقہ

معشوقہ کی سہیلی

پہلا پردہ وقت ساڑھے دس بجے دن

(مصنف ہاتھ میں کاغذ لئے اپنے کمرے میں ٹہل رہا ہے۔ اُس کا دوست دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور اس کے "آیئے" کہنے پر داخل ہوتا ہے۔)

دوست ۔ تم اور کاغذ! وہی دماغ کو چکرا دینے والی پرانی تصویر! تم تو شاید کفن بھی کاغذ کا بنواؤ گے؟

مصنّف ۔ نہیں، ہرگز نہیں! کاغذ، وہ کاغذ جس پر اُس کا نام ہو اُس کے نام کی یاد ہو زندگی کا بہترین تحفہ ہے۔ کفن چاہے وہ کتان و حریر کا ہو اور اُس پر مقدس ترین الفاظ پاک ترین ہاتھوں سے کشیدہ کئے ہوں دنیا کی بدترین گالی ہے۔ جس کی زندگی بجائے خود ایک شعلہ ہو وہ کفن کا محتاج نہیں ہوتا۔

دوست ۔ سبحان اللہ! کیا پرواز ہے! (یہ کہہ کر مصنف کے ہاتھ سے یک لخت کاغذ چھین کر اُسے بلند آواز سے پڑھنے لگتا ہے۔ مصنف بے بس ہو کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

(کاغذ کی تحریر)

مجھے لفظ چاہئیں۔ دراز قد ریش پوش سیاح لفظ نہیں بلکہ وہ جنہیں گھر سے باہر قدم نکالنے کی عادت کم ہو۔ بھولے بھولے صاف مگر گہرے اور چمکیلے بالکل تیری آنکھوں کی طرح۔ وہ لفظ اگر آ جائیں تو تجھ سے ایک بات کہوں۔ بالکل چپکے چپکے۔

تو تاروں کو دیکھا کرتی ہے۔ کاش کہ میں آسمان بن جاؤں اور پھر تجھے اتنی آنکھوں سے دیکھوں جتنے تارے ہیں! کس قدر تجھے دیکھ لوں؟

تو باغ میں نکلتی ہے۔ کاش میں باغ کی ہوا بن کر چاروں طرف سے تجھ سے لپٹ جاؤں، میں تجھے دیکھوں تُو مجھے نہ دیکھے!

تیرے لئے زندگی ایک معمّا ہے۔ میرے لئے تُو ایک پہیلی ہے۔ کاش کہ مَیں تجھے بُوجھ لوں اور تیرا معمّا بن جاؤں!

(مصنف کا دوست باقی تحریر نہیں پڑھتا اور کاغذ کو مصنف کی گود میں پھینک کر یوں مصنف سے مخاطب ہوتا ہے)

دوست۔ بھئی ہو بڑے حضرت۔ ضرور کسی نہ کسی دن ایک نئے فیشن کی بکواس کے موجد قرار دیئے جاؤ گے مگر جس غریب پر یہ بوچھاڑ ہے اُن کا حلیہ تو ذرا بیان کرو اور آخر یہ سچ مچ کا خط ہے یا محض لفظی طبع آزمائی؟

مصنّف۔ سچ مچ کا خط ہے جسے کبھی کوئی ڈاک والا چھُونے نہ پائے گا۔

دوست۔ یہ تمہاری مرضی مگر بندے کی یادداشت ایسی بُری نہیں۔ جو اُن کا پتہ عنایت ہو جائے تو بلا تأمل جا کر سُنا دوں۔

مصنّف۔ سبحان اللہ کیا پرواز ہے؟

دوست۔ تو آخر تم پتا نشان بتانے سے اس قدر کتراتے کیوں ہو؟

مصنّف۔ واللہ بالکل گدھے ہو۔ یہ خط میری طرف سے میرے ایک سابق قصّے کی ہیروئن کی طرف ہے۔

دوست۔ بس ہارا۔ ڈاکٹری کتابوں میں ہر قسم کے خبط کا علاج ہے مگر اس مرض کا ذکر نہیں کہ اگر مصنف خود اپنے تخیل کی زائیدہ ہیروئن پر عاشق ہو جائے تو کیا کیا جائے۔

مصنّف۔ تسلیم۔ اب تو آپ کو یقین آیا کہ میں بھی نیا میرے مرض بھی نئے۔

دوست۔ ضرور۔ تم بھی نئے تمہارے جھوٹ بھی نئے مگر جو تمہاری معشوقہ سن پائیں گی تو انہیں وہ رہا سہا شک جو تمہارے مخبوط الحواس ہونے میں ہے وہ بھی جاتا رہے گا اور میں اُن کی طرف سے تمہارے لئے پیغام لایا تھا۔

مصنّف۔ (چونک کر) کیا؟

دوست۔ یہ کہ آج چار بجے بعد دوپہر تم چا پر اُن کے ہاں آنکلنا۔

مصنّف۔ کون کون آرہا ہے؟

دوست۔ چائے ہے اور پھر ٹینس۔ سُنتا ہوں کہ اُن کی ایک سہیلی وارد ہوئی ہے اور چونکہ وہ ٹینس نہیں کھیلتی یا کھیلنا نہیں چاہتی تو تمہاری ضرورت محسوس ہوئی کہ شریف انسان تو ٹینس کھیلیں گے اور باقی باتوں میں لگے رہیں گے۔

مصنّف۔ تم ہو گے؟

دوست۔ جی ہاں مگر بندے کے مذہب میں ٹینس کو عشق پر ہزار درجے ترجیح ہے (یہ کہہ کر دوست چلا جاتا ہے)

(مصنف تھوڑی دیر سر ہاتھوں میں تھامے بیٹھا رہتا ہے اور پھر کسی مصمم ارادے سے اُٹھ بیٹھتا ہے)

دوسرا پردہ (وقت ساڑھے چار بجے بعد دوپہر)

(تین ہندوستانی جنٹلمین فلالین کی پتلونیں اور بلیزر کوٹ پہنے ہوئے گول کمرے سے نکل کر ٹینس گراونڈ کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ ان کے بعد تین ساڑھی پوش خاتونیں نکلتی ہیں۔ ایک کی ساڑھی بہت زرق برق ہے اور جوتا بھی بہت شاندار ہے۔ دوسری دو ربڑ کے تلے والے جوتوں میں ہیں اور سفید ساڑھیاں پہنے ہیں)

مصنّف کا دوست۔ (مصنف کو مخاطب کر کے) تم تو کہتے تھے کہ ٹینس چھوڑ دی۔

مصنّف۔ گر ضرورت بود روا باشد۔

(اتنے میں فیصلہ ہوتا ہے کہ کون کس کے ساتھ کھیلے اور مصنف اور زرق برق ساڑھی الگ بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے ہیں۔ جب ٹینس کا ایک سٹ ختم ہوتا ہے تو مصنف کی معشوقہ بادلِ ناخواستہ مصنف کو مدعو کرتی ہے کہ ٹینس میں شریک ہو۔ مصنف بلا تامل ٹینس میں شریک ہونے کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور معشوقہ کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ معشوقہ کے بشرے سے صاف ظاہر ہے کہ ٹینس میں خاک بھی مزہ نہ آئے گا مگر مہمان کے ساتھ کج اخلاقی فیشن کے خلاف ہے۔ وہ مسکرا کر کہتی ہے کہ "میں آپ کی طرف کھیلوں گی"۔ مصنف جھک کر شکریہ ادا کرتا ہے۔ ٹینس کے کھیل میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف باقی تین مردوں سے بدرجہا بہتر کھلاڑی ہے اور اس کی معشوقہ تو اس قدر حیران بلکہ نادم ہوتی ہے کہ بات بات میں اپنی گذشتہ غلط فہمی کی تلافی کرنا چاہتی ہے۔ ٹینس کا کھیل ختم ہونے پر چونکہ موسم سردی کا ہے سب پھر کمرے میں جمع ہوتے ہیں)

مصنّف کا دوست۔ (مصنف کی معشوقہ کو مخاطب کر کے) یہ حضرت تو بڑے چھپے رستم نکلے۔

معشوقہ۔ جی ہاں۔

سہیلی۔ مجھے تو سخت گلہ ہے۔ میں سمجھی تھی کہ ان کے ساتھ لمبی علمی گفتگو ہوگی۔

مصنّف۔ معافی چاہتا ہوں مگر خوش بھی ہوں کیونکہ میرے علمی معلومات بہت ہی محدود ہیں اور میری تمام قلعی کھل جاتی۔

سہیلی۔ مصنّفوں کے لئے کسرِ نفسی تو بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔

مصنّف۔ آپ کی بات کیسے پلٹ دوں مگر واقعی مجھے کچھ نہیں آتا۔ (معشوقہ کی طرف اشارہ کرکے) یہ گواہ ہیں۔

معشوقہ۔ مجھے گواہ بناتے ہو تو پھر سچ سننے کے لئے بھی تیار رہو۔

مصنّف۔ ضرور، فرمائیے وہ کیا سچ ہے؟

معشوقہ۔ یہ کہ آپ کو اور کچھ آتا ہو کہ نہ آتا ہو جھوٹے قصے بنانے خوب آتے ہیں۔

مصنّف۔ سوال یہ نہیں کہ میرے قصے جھوٹے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان قصوں میں کہیں بھی علمیت کی بُو ہے؟

معشوقہ۔ یہ تو کسی عالم سے پوچھئے؟

("تھینک یُو" "بہت اچھا کھیل رہا" "پھر کھیلیں گے" "آپ ہمارے ہاں آ کر پرسوں کھیلئے" "ضرور" "تھینک یُو" "خدا حافظ" کا شور ہوتا ہے۔ کچھ مہمان رخصت ہوتے ہیں اور صرف مصنّف، اُس کی معشوقہ، سہیلی اور مصنّف کا دوست رہ جاتے ہیں۔ چاروں کرسیاں ایک دوسرے کے قریب کر کے باتیں کرنے لگ جاتے ہیں)

سہیلی۔ (مصنّف کو مخاطب کرکے) سب سے پہلی بات جو آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ آپ کے چھوٹے بڑے سب قصّوں میں ایک خصوصیت ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ نے کبھی موسم کا ذکر نہیں کیا۔ مثلاً یہ کہ بادل تھے کہ دھوپ تھی کہ ہوا تھی۔ اور مصنّف موسم سے اس قدر مدد لیتے ہیں کہ اگر

اُن کی ہیروئن کے سر میں درد ہو تو موسم غریب کو ضرور گدلا ہونا پڑتا ہے، اور اگر ہیرو پر کوئی مصیبت آئی ہو تو آسمان کا رنگ پہلے بدلتا ہے۔ مگر آپ کے ہاں ان باتوں کا تذکرہ تک نہیں۔ آخر آپ نے نیچر کو ردی کی ٹوکری میں کیوں ڈال رکھا ہے؟

مصنف۔ میری تمام تر دلچسپی انسانوں سے بلکہ انسانوں کے خیالات سے ہے۔ ممکن ہے کہ موسم کا اثر خیالات پر ہو مگر مجھے کبھی یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ خیالات کا نشوونما کس طرح ہوتا ہے۔ میں تو جو خیالات فی الواقع موجود ہوں اُن کو لے لیتا ہوں اور اُن کے نتائج اخذ کرتا ہوں۔ اس لئے میری تحریر کو موسم سے کچھ بھی سروکار نہیں۔

معشوقہ۔ نتائج تو آپ ہمیشہ اُلٹے پلٹے نکالتے ہیں۔ کبھی یہ کبھی وہ۔ مجھے تو کبھی بھی پتہ نہ چلا کہ آپ کو انسانوں سے محبت ہے کہ نفرت ہے۔ مذہب کو مرض سے تشبیہ آپ نے بیس دفعہ دی ہوگی۔ جس شخص کو بنی نوع انسان سے محبت ہو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ مذہب کو ایک قسم کی عالمگیر وبا تصور کرے بلکہ یہاں تک لکھ دے کہ انسانی قوم من حیث القوم ایک قسم کا کیڑا ہے جو کرۂ زمین کی اُوپر کی جلد میں پیدا ہوتا ہے اور پھر خود ہی اپنے آپ کو کاٹ ڈالتا ہے۔ ایک طرف تو آپ یہ لکھتے ہیں اور پھر دوسری طرف تصوف کی لہر جو چلتی ہے تو انسانوں کو آپ کی طرف سے یہ تلقین ہوتی ہے کہ محبت کے نشہ میں چور رہو۔ خدا جانے آپ کو انسانوں کی کمزوریوں پر ہنسنے میں کیا مزہ ملتا ہے؟

مصنف۔ آپ کی نکتہ چینی قطعی درست ہے کیونکہ آپ کو یہ علم نہیں کہ میں ایک نئے مذہب کا موجد ہوں۔

سب۔ وہ کیا! وہ کیا!

مصنّف۔ وہ یہ کہ انسان نہ صرف اپنی کمزوریوں پر بلکہ اپنی طاقت پر، نہ صرف اپنی طاقت پر بلکہ اپنی ترقی کی خواہش پر خوب طرح ہنسیں۔ نہ صرف ہنسیں بلکہ کھُلے دل سے اس ترقی کی خواہش کا استہزا کریں۔ یہی ایک مذہب ہے جو انسان کو اُس اصلی جہنّم سے بچا سکتا ہے جس کا نام خود پسندی ہے

اور جس کا سیدھا راستہ وہ تمام مذاہب ہیں جو اس وقت مروّج ہیں یعنی وہ تمام مذاہب جن میں انسانی تخیل کے ساختہ دیوتا یا دیوتاؤں کو مٹانے والی بڑی طاقت خوف و اُمید دلا کر احکام کی تعمیل پر مُصر ہے

معشوقہ ۔ چہ خوب ۔ آپ کو صرف مصنّف ہونا پسند نہیں بلکہ پیغمبر ہونے کی بھی خواہش ہے (قہقہہ لگا کر) یہ خود پسندی!

مصنّف ۔ خواہش تو اس سے بہت بڑھ کر تھی مگر خود پسندی کی وجہ سے نہیں بلکہ آپ کی پرستش کی وجہ سے ۔

معشوقہ ۔ باتیں بنانے پر اُتر آئے آپ!

مصنّف اور اُس کا دوست ۔ (اکٹھے کہتے ہیں) اب اجازت دیجئے ۔ دیر ہو گئی ۔ بہت بہت شکریہ

(معشوقہ اور اُس کی سہیلی رہ جاتے ہیں)

سہیلی ۔ یہ شخص اگر پاگل نہیں تو ہزاروں لاکھوں میں انتخاب ہے ۔ تم کس قدر خوش قسمت ہو کہ ایسا آدمی تم پر مرتا ہے ۔

معشوقہ ۔ مرنے ورنے کی تو خبر نہیں مگر اتنا میں جانتی ہوں کہ پاگل واگل خاک نہیں ۔ سو کو پاگل کر کے چھوڑے ۔ یونہی بنتا بہت ہے ۔

سہیلی ۔ کیا تمہیں بھی اُس نے اپنا دیوانہ بنایا ہے کہ نہیں؟

معشوقہ ۔ کیسی باتیں کرتی ہو ۔ میری بلا کسی مرد کے پیچھے دیوانی ہو ۔

سہیلی ۔ کیسی بے رحم ہو ۔ واللہ باللہ اگر میں تمہاری دلی سہیلی نہ ہوتی تو اس شخص کو ضرور تم سے چُرانے کی کوشش کرتی ۔

معشوقہ ۔ ایک دفعہ نہیں سو دفعہ ۔ آزادی کا زمانہ ہے ۔

سہیلی۔ لعنت ہے اس آزادی پر کہ سہیلی کو سہیلی پر اعتبار نہ رہے۔ میں تو تم سے اپنے دلی پیار کے باعث پوچھ رہی تھی کہ آخر اس کے ساتھ شادی میں کیا ہرج ہے؟

معشوقہ۔ (سہیلی کے گلے میں باہیں ڈال کر) بہن سچ پوچھو تو ایسی دو دلی ہو رہی ہوں کہ کیا بتاؤں؟ کبھی تو دل میں آتا ہے کہ ایسے آدمی کے ساتھ زندگی بسر کرنے سے تو بھیک مانگنا بہتر ہے کیونکہ اُس کی جو بات ہے سو نرالی۔ دُنیا سے وہ متنفر، عاقبت سے وہ باغی۔ آئے دن دُنیا بھر کے اعتراضوں کا جواب دینے میں کون سر کھپائے؟ اور کبھی دل میں یہ آتا ہے کہ یہ زندگی تو کسی نہ کسی طرح گزر ہی جائے گی مگر اس شخص کے ساتھ دوزخ کا بھی لطف رہے گا۔

سہیلی۔ روپے پیسے کا کیا حال ہے؟

معشوقہ۔ سنتی ہوں کہ کافی جائداد ہے مگر ایسے آدمی کا کیا اعتبار؟ جس دن جی میں سمائے گی سب جائداد بیچ سادھو بن جائے گا۔

سہیلی۔ تم بھی پوری احمق ہو۔ تمہارے لئے ساڑھی خریدنے کے لئے تو شاید کچھ بیچ دے، ورنہ یہ شخص تو روپیہ گنوانے والا نظر نہیں آتا۔

معشوقہ۔ چلو اب چھوڑو بھی یہ قصّہ۔

سہیلی۔ ایک شرط پر۔

معشوقہ۔ وہ کیا؟

سہیلی۔ مانو تو بتاؤں۔

معشوقہ۔ اچھا۔

سہیلی۔ صبح اسے کھانے پر بلواؤ مگر اور کوئی نہ ہو۔

معشوقہ۔ اچھا۔

(تیسرا پردہ (دوسرے دن صبح دس بجے)

(معشوقہ اُس کی سہیلی اور مصنّف کھانے کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ معشوقہ کے رو ئیں رو ئیں سے شرارت ٹپکتی ہے۔ مگر صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ شرارت دِلی بے چینی کا بُرقع ہے)

مصنّف۔ (معشوقہ کو مخاطب کر کے) اس ہمارے ملک کو مذاہب تو روند کر تباہ کر ہی چکے ہیں۔ رہا سہا دم موجودہ تہذیب کی لتاڑ سے نکل جائے گا۔

معشوقہ۔ اس دانشمندانہ جملے کی شانِ نزول کیا ہے؛ کیا مجھ پر کوئی اعتراض ہے؟۔

مصنّف۔ مجھے اور اعتراض کی مجال؛ ناممکن! صرف یہ خیال کر رہا تھا کہ تہذیب سے مجبور ایک خاتون اپنے دل کو کچل رہی ہیں۔

سہیلی۔ خدا کی پناہ۔ اگر آپ دِل کی آنکھیں بند نہیں کر سکتے تو کیا اپنی زبان پر بھی آپ کو قابو نہیں؟

معشوقہ۔ یہ نہ کہئے۔ نہ کہنے کی باتوں میں تو یہ خضرِ وقت ہیں کشتی ڈبو دیں گے مگر وجہ نہ بتائیں گے مگر نہیں میں خوش ہوں کہ مجھے انہوں نے موقع دیا ہے کہ میں بھی اپنی عقل کی قینچی سے ان کی دماغی قطع و برید کروں مگر پہلے یہ بتاؤ کہ کیا تم پولیس کی نوکری کر سکتی ہو؟

سہیلی۔ ضرور۔

معشوقہ۔ اچھا یہ شخص ایک گرفتار شدہ ملزم ہے اس کی جیبوں کی تلاشی لو۔ اور اگر کوئی کاغذ ہو وہ نکال لو۔

(سہیلی جیبیں ٹٹولتی ہے۔ اتفاق سے وہی کاغذ جو مصنّف کے دوست نے پہلے دن پڑھا تھا نکلتا ہے۔ مصنّف خاموشی سے تلاشی ہونے دیتا ہے۔)

مصنّف۔ میں سچے دل سے عرض کرتا ہوں کہ یہ کاغذ ہرگز بالارادہ میری جیب میں نہ تھا بلکہ محض اتفاقیہ اور میری نہایت مؤدبانہ عرض ہے کہ یہ پرچہ بن پڑھے مجھے واپس عنایت کیا جائے۔

معشوقہ۔ ہرگز نہیں۔(سہیلی سے) تم اسے بلند آواز سے پڑھو۔

مصنّف۔ ظلم کی کوئی حد بھی ہوتی ہے۔

معشوقہ۔ وہ ظلم ہی کیا جس کی حد ہو۔

مصنّف۔ آپ کی خوشی۔

(یہ کہہ کر مصنف تو کرسی پر بےبسی کی حالت میں بیٹھ جاتا ہے اور سہیلی اتنا ہی حصّہ پڑھتی ہے جو پہلے دن پڑھا گیا تھا)

معشوقہ۔ کیا ختم ہوگیا؟

سہیلی۔ نہیں چند سطریں اور ہیں مگر کون پڑھے۔ مجھے تو اس قسم کی تحریر ذرا نہیں بھاتی۔

معشوقہ۔ مجھے بہت پسند ہے۔ تم یقین جانو کہ یہ کسی انسان کی طرف اصلی خط نہیں ہے۔

(مصنّف اپنی معشوقہ کے اس جملہ پر بے اختیار چونکتا ہے اور بہت ہی استعجاب ظاہر کرتا ہے)

سہیلی۔ خط نہیں تو پھر کیا ہے؟

معشوقہ۔ یہ حضرت روحوں کے تاجر ہیں۔ انہیں کسی کی شخصیت سے کچھ بھی انس، کچھ بھی دلبستگی نہیں بلکہ چاہتے یہ ہیں کہ رُوحیں بٹور کر جمع کرتے جائیں بخیل کنجوسوں کی طرح۔ اور پھر خود ہی اس خزانے کا لطف اُٹھائیں۔

سہیلی۔ انوکھی بات ہے مگر اس خزانے سے فائدہ؟

معشوقہ۔ وہی خود پسندی۔

مصنّف۔ کیا مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے؟

معشوقہ۔ شوق سے فرمایئے۔

مصنّف۔ آپ کی تشخیص ادھوری ہے۔ مجھے اگر کہیں سے کوئی روح البشر بشرطیکہ وہ حاصل کرنے

کے قابل ہو ، مل جائے تو میں اُسے گرفتار کر کے بند رکھنا نہیں چاہتا بلکہ اُسے آزاد کر کے اُس کی خدمت کی کوشش کرتا ہوں کہ وہ اپنے آپ سے واقف ہو اور اس نئے تعارف سے زندگی کا لطف اُٹھائے۔

معشوقہ ۔ کیا معنی ؛

مصنّف ۔ کئی معنی اور ہر شخص کے لئے مختلف معنی۔

معشوقہ ۔ میرے لئے اس جُملے کے کیا معنی ؛

مصنّف ۔ یہ کہ آپ کے جسم میں بجائے ایک رُوح ہونے کے دو رُوحیں ہیں اور وہ ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرِ پرخاش ہیں۔ ایک کامل آزادی کی حامی ہے۔ دوسری مصلحتِ زندگی کے دام میں گرفتار ہے۔ آج یہ دوسری روح جو اصل میں مردانہ روح ہے برسرِ اقتدار ہے۔ دوسری جو زنانہ روح ہے اور جو کامل آزادی کی حامی ہے وہ مقیّد ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر مجھے موقع ملے تو ان دونوں کو ایک دوسرے کا ممد و معاون کر دوں تاکہ پھر آپ کو اس کشمکش سے آزادی ہو۔

معشوقہ ۔ یہ فقرے تو آپ ہر خاتون کو کہہ سکتے ہیں اور میں تو روح کی قائل ہی نہیں۔

مصنّف ۔ آپ کے قائل نہ ہونے سے روح تو غائب نہیں ہو جاتی۔

معشوقہ ۔ اچھا تو پھر مطلب کیا نکلا ؛

مصنّف ۔ اصلی مطلب ان چند سطروں میں ہے جو پڑھنے سے رہ گئیں۔

معشوقہ ۔ اچھا تو آپ وہ سنائیے۔

(مصنّف پڑھتا ہے)

" مگر یہ پہیلی مجھ سے نہ بُوجھی جائے گی میں وہ معمّا نہ ہوں گا جب تک کہ تم خود اپنے آپ کو آسمان بن کر نہ دیکھو، خود اپنے آپ سے ہوا بن کر نہ لپٹو۔

پیاری کوئی کسی کا بن نہیں سکتا جب تک کہ وہ خود اپنا نہ بنے۔ تم اپنی بنو تو دُنیا تمہاری ہے۔

پیاری تم حسن سے بالاتر ہو۔ تمہیں حسن کی ضرورت نہیں۔ خوبصورتی تمہاری اُتری ہوئی پوشاک ہے مگر کاش کہ تم عقل سے بھی بالاتر ہو جاؤ۔ زندگی کے عقدے کو حل کرنے کی کوشش چھوڑ دو بلکہ اس عقدے میں خود سما جاؤ مگر یہ تب تک نہ ہو گا جب تک وہ زبردست طاقت جسے جاہل لوگ نیچر کہتے ہیں تم پر جادو نہ کرے۔"

معشوقہ۔ کیسا جادو؟

(سہیلی کسی بہانے سے کمرے سے باہر نکلتی ہے، چار خوبصورت آنکھوں میں صرف ایک خوبصورت نگاہ ہے۔ آنکھ کا جادو چل جاتا ہے۔)

(اور اس کے بعد قہقہے پر قہقہہ)
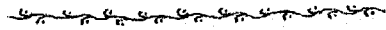
کہاں ہے؟

وہ تنگ و تاریک پیچ در پیچ گلیوں کا مجموعہ جو میرا دماغ ہے اور جس کے حفظانِ صحت کے ذمہ دار چند شاعر، چند فلسفی، اور چند مؤرخ ہیں۔ اس کرۂ زمین کی طرح اپنے گرد بھی گھومتا ہے، سالانہ چکر میں بھی ہے اور نظامِ شمسی کی طرح خدا جانے کدھر سے آیا ہے اور کدھر کو جا رہا ہے۔ مجھے نہ اس کی گردش پر اعتراض ہے نہ اس کے قرار کی پروا۔ سیر تماشے سے غرض ہے اور وہ پوری ہو رہی ہے۔ رات ان گلیوں میں عجیب طوفان برپا ہؤا اور وہ یوں ہؤا:۔

منگل کے دن دس جولائی ۱۵۸۴ء کو "خاموش ولیم" اپنی بیوی کے ہمراہ ساڑھے بارہ بجے بعد دوپہر کھانے کے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ بالتھزار جرارڈ (Balthazar Gerard) نے پاسپورٹ طلب کیا۔ شاہزادی (خاموش ولیم کی بیوی) اس شخص کی ہیئت سے متعجب ہوئی اور سراسیمگی سے اپنے سرتاج سے پوچھنے لگی کہ "یہ اجنبی کون ہے"! خاموش ولیم نے اس سائل کے مضطرب چہرے کو کچھ نہ پرکھا اور ایک سکرٹری کو حکم دے دیا کہ پاسپورٹ فوراً تیار کردو۔ شاہزادی کو چین نہ آیا اور پھر گھبرا کر دبی زبان سے بولی کہ "اس قسم کا شیطنت فرسودہ چہرہ پہلے کبھی نہیں دیکھا"۔ مگر "خاموش ولیم" پر کچھ اثر نہ ہؤا اور کھانے کی میز پر حسبِ معمول شاہانہ مگر متین دل لگی والی فقرے بازی ہوتی رہی۔ دو بجے یہ لوگ میز سے اُٹھے، شاہزادہ سب سے آگے تھا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والی منزل میں اپنے پرائیویٹ کمرے کی طرف روانہ ہؤا۔ دوسری سیڑھی پر قدم رکھا تھا کہ ایک ساتھ والی محراب سے ایک شخص نے نکلتے ہی ایک دو فٹ کے فاصلہ سے پستول کی تین گولیاں چلائیں،

سیدھی دل کی طرف ۔ ایک تو جسم پھاڑ کر پرلی دیوار پر لگی اور دو جسم میں رہیں ۔ شاہزادے نے فرانسیسی زبان میں یہ دو جملے کہے ۔

"اے خدا ! میری روح پر رحم کر"

"اے خدا ! میری غریب رعایا پر رحم کر"

سوائے ایک 'ہاں' کے یہ آخری جملے تھے جو "خاموش ولیم" کی زبان سے نکلے یعین ان فقروں کے بعد اُس کی ہمشیرہ کیتھرین نے اُس سے پوچھا کہ کیا تم اپنی روح یسوع مسیح کے سپرد کرتے ہو اور اُس نے ہچکیاں لیتے ہوئے سخت نقاہت کی حالت میں نیم شنود

"ہاں"

کو زبان پر رواں کیا اور پھر "خاموش ولیم" ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا ۔

(۲)

قاتل یعنی بالتھزار جرارڈ (Balthazar Gerend) ایک پہلو والے دروازے سے نکل کر انتہائی سُرعت سے لپکا ۔ قلعہ کی دیوار تک تقریباً پہنچ چکا تھا کہ ایک کوڑے کی ڈھیر سے پاؤں اٹکنے کے باعث ٹھوکر کھا کر گرا ۔ اُٹھا تو کئی غلام اور سپاہی کلہاڑیاں لئے ہوئے اُس کے سر پر تھے ۔ انہوں نے اسے دلوچا ۔ وہ اپنے دونوں پستول وہیں پھینک آیا تھا جہاں اُس نے قتل کیا تھا ارادہ اُس کا یہ تھا کہ خندق سے تیر کر نکل جائے اور اِس مطلب کے لئے اُس کے پاس دو مشکیزے اور اُن میں پھونک بھرنے کے لئے ایک پائپ موجود تھا ۔ خندق کے پار اُس کے لئے ایک گھوڑا حاضر تھا ۔

جب گرفتار ہوا تو اُس نے دلیری سے جُرم کا اقبال کیا ۔ فوراً اُسے واپس لایا گیا اور شہر کے مجسٹریٹوں نے اُس پر سوال کئے ۔ اس کے بعد اُسے طرح طرح کے عذاب دیئے گئے ۔

یہ پست قامت کریہ منظر بالتھزار جرارڈ (Balthazar Gerend) جو ایک ٹھٹھیرے کی مار

نہ تھا عجب دل گردے کا انسان تھا۔ جب یونہی جھوٹ اُس سے کہا گیا کہ شہزادہ نہیں مرا تو نہ اُس نے اس بات پر اعتبار کیا نہ مایوسی ظاہر کی بلکہ نہایت اطمینان سے یہ کہنے لگا۔ "تین زہر آلود گولیاں شہزادے کے معدے میں مَیں نے چلائیں۔ وہ ضرور مر چکا ہوگا۔ مجھے صرف یہ افسوس ہے کہ دوسری پستول کی گولیاں نہ چلا سکا۔ اگر میں ہزار فرسنگ دُور ہوتا تو پھر بھی اس قتل کے لئے واپس آتا۔"

اس کے بعد قاتل نے مکمل اطمینان سے ایک طول طویل اقبالی جرم تحریر کیا۔ اُسے ہر قسم کے وحشیانہ عذاب دیئے گئے مگر ہر عذاب کے بعد وہ آسانی و تحمل سے بلکہ فصاحت سے گفتگو کرتا اور اس بردباری پر اُس کے جج اس قدر متعجب ہوئے کہ انہیں یقین ہو گیا کہ یہ شخص جادوگر ہے۔ ہر قسم کے عذاب اُس نے سہے مگر ایک دفعہ اُس نے

"آہ"

نہ کی۔ یہی کہتا رہا کہ "اگر ہزار دفعہ مجھے سزائے موت دی جاتی تو بھی یہ ہم مَیں ضرور دُہراتا۔" جو موجود تھے اُن میں سے بعض نے تو اُس کے انسان ہونے ہی کو باور نہ کیا۔ بعض نے یہ پوچھا "تم نے کب سے اپنے آپ کو شیطان کے پاس فروخت کیا ہے؟" وہ نرمی سے جواب میں کہنے لگا کہ "مجھے شیطان سے تعارف نہیں۔" جو خوراک اُسے قید خانہ میں ملتی رہی اُس کے لئے اُس نے ججوں کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ اس عنایت کے صلے میں وہ انہیں نیک اجر دے گا۔ جب پوچھا گیا کہ "کیسے" تو بولا کہ بہشت میں اُن کے لئے وکالت کرے گا۔ قاتل کو یہ حکم سُنایا گیا کہ اوّل اُس کا دایاں ہاتھ آگ کی طرح گرم لوہے سے جلایا جائے گا اور چھ مختلف چمٹوں سے اُس کا گوشت اُس کی ہڈیوں سے نوچا جائے گا۔ زندہ اُس کے ٹکڑے کئے جائیں گے اور اُس کی انتڑیاں زندگی کی حالت میں نکالی جائیں گی اور اُس کا دل نکال کر اُس کے مُنہ پر پھینکا جائے گا اور پھر اُس کا سر کاٹا جائے گا۔

۱۴ جولائی کو یہ سزا پُوری طرح سخت وحشت سے دی گئی۔ جرارڈ کے اعصاب اِس بلا

کے بعد کہ پھانسی پر چڑھنے سے پہلے وہ ایک نیم بریاں لوتھڑا تھا مگر جب ایک لوہار کو جو اُس کے پستول کو ہتھوڑے سے چکنا چور کر رہا تھا ایک اُڑنے والے ٹکڑے سے کان پر ذرا سی چوٹ آئی اور لوگ اُس پر ہنسے تو جرارڈ بھی مسکرایا۔ ان ہونٹوں پر وہ تبسم ابھی تھا جب اس کا دل چیر کر اُس کے مُنہ پر پھینکا گیا۔ اُس وقت اُس کا دم واپسیں تھا۔

(۳)

حکومت کے راز عجیب وغریب ہوتے ہیں۔ خاموش ولیم ۵۱ سال ۱۶ دن کا تھا جب اُسے قتل کیا گیا۔ اُس نے اپنے ملک کو سپین کی غلامی سے آزاد کرنے میں وقف رکھا۔ سپین والوں نے سارے یورپ میں علانیہ مشہور کر رکھا تھا کہ جو شخص خاموش ولیم کو قتل کرے گا اُسے بے شمار انعام ملیگا۔ یہ انعام فلپ شاہنشاہ سپین کے حکم سے جرارڈ کے وارثوں کو ملا۔ ڈیوک (*Parwa*) نے اپنے شاہنشاہ کو ان لفظوں میں اطلاع دی کہ "بیچارا جرارڈ پھانسی پا چکا ہے مگر اُس کے ماں باپ موجود ہیں اور وہ سفارش کرتا ہے کہ وہ انعام عطا ہو جس کا ایسا قابلِ تعریف اور فیاضانہ فعل پوری طرح مستحق ہے" بجائے پچیس ہزار کرون موعود کے تین نوابیاں جرارڈ کے والدین کو ملیں اور اُن کا شمار رؤسا میں ہونے لگا۔ کچھ سالوں بعد جب خاموش ولیم کا ولیعہد ستائیس سال سپین میں رہ کر اپنی ڈچ عادات گنوا کر واپس اپنے ملک میں آیا تو فلپ ثانی شاہنشاہ سپین نے خسروانہ مرحمت سے یہ کہا کہ "تمہیں وہ تینوں نوابیاں واپس مل سکتی ہیں بشرطیکہ تم محصول کا ایک مقررہ حصّہ اپنے والد کے قاتل کے خاندان کو مقررہ طور پر ادا کرتے رہو" یہ تینوں نوابیاں خاموش ولیم کی تھیں۔ بیٹے نے اس ستم ظریفی سے نفرت ظاہر کی مگر انسانی تاریخ ہمیشہ کے لئے اس زہر سے آلودہ رہے گی کہ حکومت کے زور پر قاتل کے ورثا کو مقتول کی جائداد بطورِ قصاص ملی۔

خاموش ولیم کا نہ مٹنے والا نام اب بھی اس کے ملک میں زندہ ہے مگر یاد میں صرف کبھی کبھی

آتا ہے۔ لوگوں کو فرصت نہیں کہ پُرانے دھندوں میں سر کھپائیں۔

(۴)

طوفان چاہے سمندروں میں ہوں اور چاہے دماغوں میں آخر تھمتے ہیں اور جب خاموش ولیم اور جرارڈ اور اُن کے رفیقوں اور دشمنوں کو مَیں آرام سے سُلا چکا اور اپنے اور اُن کے درمیان پورے تین سو چوالیس سال کا فاصلہ از سرِ نَو قائم کر چکا اور وقت کی دِقت مجھے اکثر رہتی ہے۔ پڑھتے پڑھاتے کبھی میں افلاطون کے یونان میں جانکلتا ہوں تو کبھی شیلے کے انگلستان میں اور پھر مجھے بیسویں صدی میں واپس آنا قدرے دشوار معلوم ہوتا ہے۔ جو لوگ صرف آنکھوں سے پڑھتے ہیں مگر دل کو متحرک ہونے سے روکتے ہیں وہ زندہ افلاطون اور زندہ شیلے کی ملاقات سے محروم ہیں) تو یہ خیال آیا کہ اس سارے نظامِ عالم کو "خاموش ولیم" کی طرح خاموش کرنے والا کیا کوئی جرارڈ ہوگا اور کہاں سے آئے گا یا یہ نظام یونہی بے بسی سے خاموش ہو جائے گا؟ جرارڈ اپنی نظروں میں ایک اعلیٰ ترین ہستی تھا۔ جب اُسے ایک سخت مکروہ قسم کا عذاب دیا گیا اور اُس کا سر خُون آلود تھا تو وہ اُٹھا اور اُس نے بڑے غرور سے کہا:-

"ECCO HOMO"

عیسائی ملکوں میں استعارۃً اِس جملے کے وہی معنی ہیں جو اسلامی ممالک میں انا الحق کے ہیں جرارڈ خلوصِ دل سے رومن کیتھولک تھا اور اُس کے عقیدے میں "خاموش ولیم" جیسے مرتد کو قتل کرنا کارِ ثواب تھا۔ اِس لئے اُس نے اپنے آپ کو مسیح کے برابر سمجھا۔ اپنے نزدیک وہ ایک مرتد کو قتل کر کے نظامِ عالم کو ایک نئی رُوح بخش رہا تھا۔ کیا یہ نظام مرتد ہو رہا ہے اور اگر ہو رہا ہے تو کیوں کوئی جرارڈ پیدا نہیں ہوتا؟

(۵)

یا یہ ہوگا کہ "خاموش ولیم" کے برعکس نظامِ عالم اپنی بیوی کی با موقع خبردار کرنے والی فریاد کو سُن لے!! اور یوں قتل ہونے سے بچ جائے۔ اگر وہ مردم شناس رفیقِ زندگی کہاں ہے؟

پچیس[۲۵] اور تیس[۳۰]

ان دو میں یوں تو صرف پانچ سال کا فرق ہوتا ہے مگر مجھ سے پوچھو جو تیس[۳۰] ہوں! مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ تیس منفی پچیس پانچ نہیں پچاس ہیں۔ ان کمبخت پانچ سالوں نے کیا کچھ نہ بدلا۔ یوں تو اب بھی خوشی کے وقت ایک کی بجائے دو دو سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر خواب گاہ کی طرف لپکتا ہوں مگر...... مگر...... (او سچ! خدا کرے تو مر جائے خدا کرے تیرا جنازہ نکلے!) قدرے قلیل ہانپتا ہوا۔ پچیس میں ہانپنا کہاں تھا؟ ہائے پچیس! ہائے وہ دن کہ شیطان علیہ اللعنۃ ہانپتا ہوا پیچھے اور ہم کوسوں آگے!! مگر اب تو ایک نہیں دو بچے ہیں اور اُف غضب کہ جب بیگم بہت کس کر ساڑھی باندھے تو کچھ پہلی سی جھلک دکھائی دیتی ہے مگر اس غریب کا کیا قصور؛ خود میری پچیس والی پتلون مجھے...... نہیں مگر سچ جائے جہنم میں یہ بات نہ لکھوں گا۔ ہاں مگر میرے لندن والے درزی کی وہ تاسف آمیز نگاہ مجھے نہ بھولے گی جب اس سال اُس نے مجھے کمر کے گرد ناپا اور کمبخت نے یہ بھی کہہ دیا کہ "جناب اب تو آپ مضبوط ہو رہے ہیں۔" ہائے اس کمبخت انگریزی زبان کی وسعت تو دیکھو کہ بھدے کو مضبوط کس خوبصورتی سے کہا!

جی میں آتا ہے کہ کسی طرح وقت کو اُلٹا پھاند جاؤں۔ کاش کہ ۲۵ کے آگے ۲۴ ہوتا اور پھر ۲۳ اور اس طرح اب میں ۲۰ کے لگ بھگ ہوتا مگر اس کمبخت ملک میں ماں باپ کی خوشی کے لئے باپ بننا ضروری ہے۔ خدا جانے ماں باپ کو بچوں سے اس قدر نفرت کیوں ہے کہ بچے یا بچی کو ماں یا باپ بنا کر چھوڑتے ہیں۔ اللہ میاں کاش تیری کمر موٹی ہوتی اور تجھے وہ سوگ ہوتا جو مجھے ہے! پھر تو تو

ہندوستان کے اماں باوا کی آنکھیں کھولتا کہ بچوں کو اور سو طرح سے مارو مگر شادی سے حلال نہ کرو۔ مگر اللہ میاں کو کوسنے سے کیا ہوتا ہے! وہ ہندوستان میں ہے ہی کہاں؛ یہاں تو مسٹر گاندھی ہیں یا بم والے اور ان کمبختوں کو کسی کے دُکھ درد سے کیا مطلب؛ ان کا تو اوڑھنا بچھونا انگریزی حکومت ہے۔ انگریزی حکومت نہ ہو تو خدا جانے یہ کہاں کی مکھیاں ماریں۔

تیس! انتیس!! ارے کہاں کے تیس؛ آج کم بخت سال گرہ ہے۔ سچ پوچھو تو تیس بھی محض خواب وخیال ہے۔ کیا اب حسین لڑکیاں کبھی میری نکٹائی جرابیں نہ دیکھیں گی؛ یہ سالگرہ کیا جھریوں کا پیش خیمہ ہے؛

ہاں خوب یاد آیا! اُس کم بخت بڈھے کو تو دیکھو! خدا جانے کئی سو پُشت مجھ سے بڑا ہے مگر کل مُسکرا کر کہہ رہا تھا کہ ۲۲ سال کی پُرانی پتلون پہنے ہوں اور میری بھولی بیگم کس قدر تعجب سے مُسکرا کر اُس سے کہہ رہی تھی کہ جھوٹ کے تو آپ نپولین ہیں۔ بائیس سال پہلے تو نرس آپ کا مُنہ دُھلاتی ہو گی! وہ داڑھی مونچھ منڈا بڈھا اس تعریف سے پھولا نہ سمایا۔ چالیا کہیں کا؛ ایسے فقرے اسے یاد ہیں کہ سچ بولتا ہے اور کوئی اسے باور نہیں کرتا۔ مجھ سے لڑکوں میں لڑکا بنا رہتا ہے، مگر میں کیا اب لڑکا ہوں؛ ارے او خانہ خراب گذشتہ تیس! تُو نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ کیا اب جھریاں آئیں گی؛ مگر اس بڈھے کے چہرے پر تو ایک بھی جھری نہیں۔ ممکن ہے آج سے بیس سال بعد میری بھی وہی حالت ہو۔ کس طرح اس چالیے کا مربد بن جاؤں اور اس سے لازوال شباب کا نسخہ حاصل کروں۔ جب سنو یہی سنو کہ وہ بڈھا اُس لیڈی کے ساتھ سیر کو گیا اُس مس کے ساتھ تھئیٹر گیا فلاں حسینہ میم کے ساتھ ٹینس کھیلا، فلاں بزم کا وہ روح رواں تھا۔ خدا جانے اس کے پاس کیا جادو ہے؛ جب کوئی لڑکی پاس نہ ہو تو خود میرا دل اس کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ ضرور اس کا مربد بنوں گا۔

مگر آخر سوچوں تو سہی کہ اس میں بات کیا ہے؛ یونہی میں اُس سے جلتا ہوں یا کوئی بات بھی

ہے ؛ گمان ہوتا ہے کہ اگر کوئی بات ہے تو صرف یہ کہ اُس نے چالاکی سے پچیس سال کی عمر میں عہد کر لیا ہوگا کہ مِس مسجد کی بجائے مِس کلیسا کا دم بھرے ۔ ہو نہ ہو بات یہی معلوم ہوتی ہے کیونکہ مسجد میں علاوہ درازیِ ریش کے ضعفِ پیری بھی ہے اور اس کے برعکس مِس کلیسا شہیدِ شباب ہے ۔ اللہ میاں کاش ہماری مِس مسجد بھی مِس کلیسا کی طرح پوڈر کریم اور لپ سٹک (LIP STICK) کو شرمندۂ احسان کرے ۔ پھر تو شاید ہم بھی کبھی بوڑھے نہ ہوں ۔ کس مزے سے ہفتے میں ایک دفعہ بھُول کر تیری عبادت کریں ۔ پھر تو ہماری زندگی سے بھی یہ سالگرہ کی ڈائن شاید دُور ہو ۔ مگر بچے ! بچے !! بچے !!! پچیس اور ایک نہیں بلکہ دو بچے !!! اللہ میاں یہ کیا ستم ہے ! خدا کے لئے تو بھی اپنی عادت بدل ڈال ۔ مجھ پر اور میری اس غریب نیک بخت پر رحم کر ! کیا تجھے انگریزی حکومت نظر نہیں آتی ؛ ساری دُنیا پُوچھتی ہے کہ مسلمانوں کو کس نے پیسا ؛ کوئی کہتا ہے مولویوں نے ، کوئی کہتا ہے بنیوں نے ۔ ایسے عقل کے اندھے ہیں کہ اس سیدھے سے سوال کا جواب نہیں سُوجھتا ۔ مسلمانوں کو کس نے پیسا ؛ بچوں نے ! جسے باور نہ ہو اماں اللہ سے پوچھ لے ۔ ایک بچہ سقاؤ نے ۔

تیس بلکہ اکتیس ! اے میرے دادا نانا کے خدا ! کیا تو مسلمان نہیں ؛ اور اگر تُو ہے تو تجھے کیوں حساب آتا ہے ؛ اب اکتیس شروع ہے ! میں مسلمان ہوں ، زبان سے ، دل سے ۔ مجھے گھاٹے کا بنج منظور ہے ۔ اپنے تیس لے لے میرے پچیس مجھے دے دے ۔ جو یہ منظور نہیں تو کچھ اور کم کر دے ۔ میرے باوا کو وہ اُس کا ہونہار اٹھرہ سا بچہ دے دے ۔

—— ••• —— ••• —— ••• ——

دو خط

پیاری

جس طرح تم ایک شاندار نظم ہو اسی طرح میں ایک بے سروپا کہانی ہوں جس طرح تم سے دُنیا کی توقع یہ ہے کہ بجائے نظم بنے رہنے کے تم ایک کامیاب روحانی جاروب کش بن جاؤ اسی طرح مجھ پر گلہ یہ ہے کہ میں ایک کارآمد بوریا کیوں نہیں؛

دُنیا کا جو جی چاہے سوچے، جو جی چاہے بنے، لاکھ طرح سے بنے اور کروڑ طرح سے بگڑنے تم پیاری اس کے فریب میں نہ آنا۔ کچھ نہ کہنا، کچھ نہ سُننا، کچھ نہ کرنا۔ بغیر کہنے، سننے، کرنے کے یہ حال ہے تو اگر خدانخواستہ تم نے دُنیا کو کوئی نیک مشورہ دے دیا تو ستم ہو جائے گا۔

اچھا! کیا وہ بات تمہیں یاد ہے کہ ایک بھری مجلس میں تم نے ایشیائی تہذیب (یا عدم تہذیب) کا مرقع ان الفاظ میں پیش کیا تھا۔ تم کہہ رہی تھیں کہ ایشیائی تہذیب جہاں تک اس کا صنفِ نازک سے تعلق ہے یہ ہے کہ بھولی بھالی لڑکیوں کو اس طرح سے پالا جائے کہ بڑے ہو کر اگر اُن میں دل لبھانے کی کوئی ادا باقی رہ جائے تو خود انہیں تعجب ہو۔ تم اپنے لطیف طنزیہ پیرائے میں کہہ رہی تھیں

عشق کی بات بیسوا جانیں

ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

بات یہاں تک پہنچی تھی کہ کسی نے شاہزادی زیب النساء کا ذکر شروع کر دیا اور اس پر مجھے موقع مل گیا کہ زیب النساء کا وہ مشہور شعر پڑھ دوں

بشکند دستے کہ خم در گردنِ یارے نہ شد
کور بہ چشمے کہ لذت گیرِ دیدارے نہ شد

اس سے بات پھر وہیں پلٹ آئی جہاں سے شروع ہوئی تھی یعنی یہ کہ مسلمان خاتونیں خشک نیکی کی ایسی بے دام لونڈیاں بنی ہیں کہ اُن کی ہر حرکت ہر بات، اُن کی نشست برخاست سب پکار پکار کر کہہ رہی ہیں

"خدا نہ کرے کہ کوئی ہمیں چاہے"

اور واقعی اس تربیت نے یہ کرامت کر دکھائی ہے کہ بہت کم صورتیں نظر آتی ہیں جن میں چاہے جانے کے قابل بنانے والی کوئی ادا باقی رہی ہو۔ لڑکیاں تو لڑکیاں خود میرے حلقے میں ایک نوجوان اس مرض میں مبتلا ہے کہ حسن سے چھپتا پھرے۔ عجب تہذیب ہے کہ ہر اس چیز سے گریز ہو جس سے زندگی کی گدڑی میں کہیں کہیں جو بیش بہا لعل اٹکا ہوا ہے وہ ذرا بھی نظر آئے۔ اماں باوا بھی یہاں کے نرالے ہیں، اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ان کی اولاد چاہے جانے کے قابل نہیں بن سکتی۔

ہاں تو جو بات تمہیں لکھنا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ تمہاری اس گفتگو کا بعض دائروں میں ضرورت سے زیادہ چرچا ہو رہا ہے۔ تم نے تو یونہی ایک چلتی سی بات کہہ دی تھی مگر اب اُس کا بتنگڑ بنایا جا رہا ہے۔ کہنے والے یہ کہہ رہے ہیں کہ لڑکیوں کو تعلیم دینے کا اگر یہ نتیجہ ہے کہ وہ آبائی طرزِ خیال کو چھوڑ کر دُنیا کے نیک و بد کی نسبت خود شخصی رائے قائم کریں تو اس تعلیم کو دُور سے ہی سلام ہے۔ پیاری تم سمجھیں کہ تعلیم سے قومی لیڈروں کا اصل مطلب کیا ہے؛ وہ مطلب یہ ہے کہ تعلیم تو تم پا جاؤ مگر کہو وہی جو بزرگ کہتے آئے ہیں۔ پڑھو لکھو سب کچھ مگر چلو نانی دادی کے نقشِ قدم۔ اور جگہ تو تعلیم حالاتِ حاضرہ سے فائدہ اُٹھانے کے لئے ہے مگر ہمارے ہاں تعلیم اس لئے دی جا رہی ہے کہ ہم زمانے کا مقابلہ کریں۔ زمانہ ہمیں اگر دو قدم آگے کی طرف لے جانا چاہے تو ہم تعلیم کے زور سے

چار قدم پیچھے ہٹیں۔ میرے خیال میں کیا ہی اچھا ہو جو کوئی خاتون ایک انجمن "ترکِ تعلیم نسواں" کے نام سے قائم کر دے۔ کسی اچھے سے چلتے پرزے پیر کو اس مجلس کا مربّی قرار دے دے اور اس کے مریدوں اور مریدنیوں سے خوب ترکِ تعلیم نسواں کے متعلق چندے جمع کرے۔ یہ تو تمہیں پتہ ہی ہے کہ پنجاب میں پیروں کا کال نہیں۔ اس سرزمین نے تو نبی پیدا کر دیئے پیر کس گنتی میں ہے۔

یہ خط شیطان کی آنت ہو گیا۔ لکھنا کچھ چاہتا تھا لکھ کچھ گیا جو نہیں لکھا وہ سمجھ لو جو لکھا ہے وہ بھول جاؤ۔ تمہارا

مکرر یہ کہ خط کو جب دوبارہ پڑھنے بیٹھا تو تعجب ہُوا کہ یونہی رواروی میں کیا ایک لاجواب بات میرے قلم سے نکلی یعنی یہ خیال کہ نسوانی تحریکوں کے متعلق پیروں سے کام لیا جائے۔ یہ لوگ واقعی بہت کام آسکتے ہیں۔ کسی زمانے میں ان کے اردگرد عورتوں کے ٹھٹھ ہوتے تھے۔ اگر کوئی زباں آور ساڑھی کبھی مقبولِ عام پیر کو اپنا مرید کر لے تو کئی نسوانی یونیورسٹیاں قائم ہو جائیں مگر تم سے یہ ذکر ہی فضول ہے۔ تم تو چاہتی ہو کہ طبقۂ اناث اپنی مدد خود آپ کر کے مردوں کو نیچا دکھائے اور دنیا پر یہ ثابت کرے کہ ہندوستان کی عورتیں مردوں سے کم ناقص العقل ہیں۔ تمہارا

"سہ کرر" یہ کہ جس دن تمہاری یہ رائے کہ شادی ایک قسم کی خباثت ہے جس سے کسی شریف عورت کو سرِدست اس ملک میں مفر نہیں تبدیل ہو تو مجھے سب سے پہلے مطلع کرنا۔ ہاں اور مہربانی کر کے یہ بھی لکھنا کہ تم اس ملک میں پیدا کیوں ہوئیں؟

جواب

ڈیر مسٹر ——

آپ کا خط کچھ ایسا ضروری تو نہیں کہ جواب جلدی تحریر کیا جائے مگر کیا آپ کے لئے

یہ بہت تکلیف دہ امر ہے کہ آپ اپنے بیش قیمت شورے بے طلب پیش نہ کیا کریں ؛ یوں تو آپ کو بہت دانشمندی کا دعویٰ ہے مگر نہ آپ میری گفتگو سمجھے نہ لوگوں کے اس پر بہتان ۔

میں تو دل سے چاہتی ہوں کہ مردوں کی مجالس میں عورتوں کا ذکر شد و مد سے ہو۔ اس بات کی ہمیں ذرہ برابر بھی پروا نہیں کہ نکتہ چینیاں ہونگی ۔ کیا لوگ ابھی سے بھول گئے کہ وہ دن کچھ بہت پرانے نہیں ہوئے جب ہمارا ذکر ہی مفقود تھا ۔ بہت کوئی کم بخت مجبور ہوتا تھا تو یوں ذکر کرتا تھا "گھر میں طبیعت اچھی نہیں" مہربانی کر کے اپنے سب دوستوں سے ضرور کہئے کہ بے باک خاتونوں کی ایک فوج تیار ہو رہی ہے ۔ اور یہ بات ذرا اننک مرچ لگا کر کہئے یعنی اس طرح کہ یورپ میں عورتوں نے مردوں کو وہ ناچ نہیں نچایا جو عنقریب ہندوستان میں رائج کیا جائے گا ۔ ہاں اور یہ بات ذرا وضاحت سے کہئے کہ ہمارے آئندہ مظالم ان کے لئے نہیں جو ہمارے کھلم کھلا مخالف ہیں بلکہ اُن بزدل کنارہ کشوں کے لئے ہیں جن میں ہمارے دوست بننے کی ہمت نہیں ۔ صنفِ نازک کے سب سے بڑے دشمن وہ ہیں جو ہمیں نہایت رقت آمیز خلوص سے کہتے ہیں " بیویو ذرا سوچ کر قدم بڑھاؤ " اور کیا لکھوں ۔ کاش کہ آپ کسی زنانہ مدرسے کے تعلیم یافتہ ہوتے ۔ پھر شاید آپ کے خط میں کچھ دلیری کی جھلک ہوتی ۔

زندگی کی ناقابلِ ملامت جفاؤں میں سے ایک یہ ہے کہ چار پیو، کیک کھاؤ اور ہاں میں ہاں ملاؤ۔ یہ ایک مذہب ہے اور اس کی نماز یہ ہے کہ چار گول کمرے میں رچا ہے وہ چوکھونٹا ہی کیوں نہ ہو، پی جائے اور اُس وقت کا بے تابی سے انتظار کیا جائے جب اس نماز کی امام مسکرا کر پوچھے کہ مصری کی ڈلیاں ایک کہ دو؛

جو لوگ اس مذہب کے پکے نمازی ہیں انہیں شاید ایک جماعت کی سوانح عمری کے ایک جزو میں کچھ دلچسپی ہو۔ وہ سوانح عمری یہ ہے :۔

ایک کمرے میں چار تھی، بیرن تھیں، سامانِ آرائش بہتر سے بہتر، چند لیڈیز، ایک یہ کالہ لیاقت زیتا اور کچھ غیر ضروری بھتنے۔ بھتنوں کو معاشرتی اصطلاح میں جنٹلمین کہا جاتا ہے مگر ایک کی نکٹائی گریزاں تھی (آپ امان اللہ کے مداحوں میں سے تھے) ایک حضرت کے اُسترے اور ٹھوڑی میں روزانہ نا تمام بحث کے آثار نمایاں تھے۔ ایک نوخیز شباب کے نشے سے لڑکھڑا رہے تھے۔ ایک کاہل الوجود کو سفید بالوں کے لئے سیاہ بوٹ پالش میسر نہ ہوا تھا۔ غرض یہ کہ ان بھتنوں کو جنٹلمین کہنا اس لفظ کی آبرو کھونا ہے مگر چونکہ جنٹلمینوں کے بغیر یہ نماز ادا نہیں ہو سکتی یہ تھے اور ضرور تھے۔ یہ تھا وہ مجمع یا جماعت جس میں ایک شخص نے زیتا کی لیاقت سے تنگ آ کر اُسے یہ دھمکی دی تھی کہ "کسی رسالے میں تمہاری خبر لوں گا۔"

زیتا نے اُس وقت تو کچھ نہ کہا مگر دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ آخر یہ شخص کیا لکھ سکتا ہے؟

زیادہ سے زیادہ یہ کہ میری زبان ماسکو کو سبق آموز ہے یا یہ کہ میرے جذبات میرے ماحول سے ایک صدی مستقبلانہ ہیں یا یہ کہ میں اِس کم سنی میں زندگی کے بہترین انعاموں کو پرکھ کر رد کر چکی ہوں! لکھ دے، ایک دفعہ نہیں بلا سے سو دفعہ لکھ دے۔ اوّل تو کوئی شائع نہیں کرے گا اور کرے گا تو پڑھنے والے کیا خاک سمجھیں گے۔ یہ فیصلہ کر کے زیتا نے اس گفتگو کو دل سے محو کر دیا۔

(۲)

جس شخص نے زیتا کو مذاق مذاق میں یوں دھمکایا تھا اُس کا اس وقت تک تو خیال صرف یہ تھا کہ گول کمرے کی چلتی چلاتی باتوں میں زیتا کے علمی تیر و تفنگ بے محل ہیں۔ اس لیاقت کی پُتلی کو چاہئے کہ اپنے ہم پلّہ کسی پروفیسر سے بحث کرے۔ خواہ مخواہ ہم واجبی واجبی پڑھے لکھوں پر نہ پل پڑا کرے مگر بعد میں جب اُس نے غور کیا تو وہ اِس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ معجزہ جس کا نام زیتا ہے تنقید سے بالاتر ہے۔ اگر ہندوستان کے نصیب نیک ہیں تو یہ کراماتی شعلہ بھبھوکا ہزاروں دقیانوسی اوہام کو خاک سیاہ کر دے گا۔ اس نتیجہ پر پہنچ کر یہ شخص بھی اس گفتگو کو بھول گیا۔

(۳)

. . . . . . نے بھی یہ دھمکی سنی۔ اس کا لطف بھی اُٹھایا مگر عمیق ندیوں میں زمانہ کی ہوائیں شور نہیں پیدا کر سکتیں۔

اوروں کو زیتا سے صرف محبت ہے . . . . کو زیتا سے عشق ہے اور ان کی دُنیا بھر کی اچھی خواہشیں زیتا کے لئے وقف ہیں۔ وہ زیتا کی لیاقت پر نازاں بھی ہیں اور اس سے ترساں بھی دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگیں کہ کاش زیتا کی لیاقت بجائے شعلہ بن کر بھڑکنے کے پھول بن کر کھلے۔ یہ دُعا مانگ کر وہ بھی اس بات کو بھول گئیں۔

(۴)

گول کمرے میں (جیسا گول کمروں کی زندگی کا تقاضا ہے) دھیمی دھیمی سی آوازیں سنائی دیں کہ آؤ تاش کھیلیں۔ میز کھسکنے لگے، کرسیاں وقار سے جمنے لگیں، بکس میں سے تاش نکلے۔ اِدھر اُدھر سے پتے تراشنے کے لئے ہاتھ بڑھے اور جب یہ فیصلہ ہوگیا کہ کون کس کا آڑی ہو تو پتوں کی تقسیم کی تیاری ہوئی۔

(۵)

پتوں کی سرسراہٹ کی آواز سن کر تین فرشتے (وہ سماوی مہمان جو مسلمان گھروں میں اب تک آتے جاتے رہتے ہیں) گول کمرے سے نکل کر باہر چمن میں گلگشت کرنے لگے (مسلمان فرشتوں کو اب تک تاش کے پتوں سے نفرت ہے) اور یوں باتیں کرنے لگے :۔

ایک فرشتہ ۔ تم نے زینا کی بے نیازی ملاحظہ کی؟ یوں سمجھتی ہے گویا زندگی کی تمام طاقتوں پر حکمران ہونا اور رہنا اس کے اپنے بس کی بات ہے ۔

دوسرا فرشتہ ۔ ہاں اور . . . . . کی زیرِ لب دعا سنی؟ بچاری یہ تصور کئے بیٹھی ہیں کہ نیک ہونا، ہمدرد خدمت گزار ہونا گویا قسمت کو خرید لینا ہے ۔

تیسرا ۔ اور اس خود پرست کو نہ دیکھا؟ عجب انسان ہے۔ یہ خیال کرتا ہے کہ کسی بات کی ماہیت کو سمجھ لینا گویا افعال پر حاوی ہونا ہے ۔

دوسرا ۔ سچ پوچھو تو وہ بچارا سب سے زیادہ قابلِ رحم ہے سمجھ اس میں ہے مگر قدرت نہیں۔ اس کے سارے جسم میں صرف آنکھیں تعلیم یافتہ ہیں اور جدھر وہ چل نکلیں وہیں حضرت کا دل و دماغ بھی حاضر ہے۔ ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے اور دعوٰے یہ کرتا ہے کہ میں ماہرِ حسن ہوں ۔

پہلا ۔ ان باتوں کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ کیا ہم زینا کی کچھ مدد کر سکتے ہیں اور اگر کرسکتے ہیں تو کیا ہمیں مدد کرنی چاہئے؟

دوسرا۔ ہاں ضرور کرنی چاہئے۔

تیسرا۔ اچھا میں یہ کروں گا کہ وہ سو رہی ہوگی تو میں چپکے سے اس کی رُوح کو شفق کی ندی میں دھو لاؤں گا۔ بہتر سے بہتر گلرنگ روح میں اُسے لپیٹ دوں گا۔

پہلا۔ شاباش، اگر دوست کیا تمہیں بنی آدم کی اس حماقت پر ہنسی نہیں آتی کہ سب کے سب یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ روح انسان کے اندر رہوتی ہے۔ عجب اُلو ہیں۔ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جسم روح کا جامہ نہیں بلکہ روح جسم کا جامہ ہے۔ میلے ہاتھوں، ناپاک نگاہوں سے اس لباس کو چاک کرتے رہتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ روح تو اندر ہے اور مامون ہے۔

دوسرا۔ پھر تم نے وہی انسانوں پر تنقید شروع کی، یہ کہو کہ زیتا کے لئے تم کیا کروگے؟

پہلا۔ دوست کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کسی انسان کی مدد کرنا عذاب خریدنا ہے۔ انسان کو تو اگر خدائی دے دو تو اسے بھی خوار کر دے گا۔

تیسرا۔ اب تم باتیں نہ بناؤ۔ یا تو ہمارے ساتھ نہ آنا تھا یا آئے ہو تو کچھ کر کے دکھاؤ۔ خود ہی تو تم نے مدد کا سوال نکالا تھا۔

پہلا۔ سچی بات یہ ہے کہ میری زیتا کی نسبت اتنی بلند رائے ہے کہ میں اسے لیاقت اور نیکی کے زہر سے بچانا چاہتا ہوں۔ اس کی بہترین مدد یہ ہے کہ میں اسے شک دے دوں۔ اعلےٰ سے اعلےٰ ترین خوشی کے موقع پر بھی وہ شک سے آزاد نہ ہو۔ کبھی کبھی خود اپنے آپ پر شک کرنے لگے۔ اس قسم کے اضطراب اور کشمکش میں گرفتار رہے کہ یہی کشاکش اُس کا نغمہ ہو۔ موسیقی زندگی کا بہترین عکس ہے دیکھے بعد دیگرے سُروں کا پیدا ہونے کے ساتھ ہی مرنا اس فوری زیست و موت کے سلسلۂ تلاطم کا نام راگ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ زیتا کے شکوک کا ایک دوسرے کو قتل کر کے پھر پیدا ہوتے رہنا اس انداز سے ہو کہ میرا دیا ہوا شک وہ گرہ ہو جو زیتا کی دلربائے

ناز کے سُر پیدا کرتا رہے۔

دوسرا: تم اسے شک دو گے تو میں اسے اُمید کی قوسِ قزح دوں گا۔ اس میں جھُول جھُول کر وہ تمہارے تمام شکوک کو پھینک دے گی۔

(ایک افسر فرشتہ آتا ہے اور گہری آواز میں کہتا ہے "کیا تم لونڈوں کا کھیل ابھی ختم نہیں ہؤا؟ کچھ کام بھی کرو گے یا یونہی دن عید رات شب برات!" سب فرشتے چلنے لگتے ہیں)

(۶)

گول کمرے میں تاش کا کھیل ختم ہؤا۔ وہ شخص جس نے زیتا کو دھمکایا تھا کہ کبھی رسالے میں تمہاری خبر لوں گا عین اس وقت باہر نکلا جب کہ فرشتے چلنے پر تیار تھے۔ پھولوں میں عجب طرح کی خوشبو تھی۔ ان کا رنگ بھی کچھ نرالا تھا۔ یہ شخص کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا مگر ایک بڑے سے پھول کے پاس جا کر انتہائے آرزو سے کہنے لگا "زیتا کے لئے یہ کچھ اور میرے لئے؟" پھول نے مسکرا دیا گویا یہ کہہ رہا ہے کہ مانگنے کے قابل تو بنو۔

ساڑھی اور سُوٹ

کچھ عرصہ ہُوا کہ شملہ کی کسی سڑک پر ایک خالی ساڑھی خراماں تھی یعنی ساڑھی تھی پر ساڑھی کے اندر کچھ نہ تھا یا کم ازکم معلوم یہ ہوتا تھا کہ گھر والی گھر میں ہے اور ساڑھی ہوا خوری کے لئے تنِ تنہا خود ہی نکل پڑی ہے۔ خدا جانے ساڑھی اور ساڑھی پوش میں تُو تُو مَیں مَیں تک نوبت پہنچی تھی اور ساڑھی تنگ آکر نکل پڑی تھی یا بچاری پہننے والی کو گھر کے کام کاج سے فرصت نہ تھی اور اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ میں تو مرتی ہی ہوں یہ بچاری کیوں سڑے بُسے، بہرحال کچھ بھی وجہ ہو چند آنکھوں والوں نے دیکھا کہ ساڑھی موجود ہے اور ساڑھی پوش غائب۔ ان میں سے ایک حضرت نے جرأت کر کے قدم بڑھایا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر کہ کوئی تاک میں تو نہیں یہ صاحب ساڑھی کے پاس جا نکلے اور ٹوپی اُٹھا کر قدم ساتھ ملانے کو تھے کہ کسی غیبی طاقت نے ان حضرت کو سُوٹ سے غائب کر دیا اور ان کا خالی سوٹ اس ساڑھی کے ساتھ سیر گشت کرنے لگا۔ اسی غیبی طاقت نے صاحب موصوف کو سوٹ اور ساڑھی کی گفتگو سمجھنے کی لیاقت تو دے دی اور یہ بھی مجبور کیا کہ یہ ساڑھی اور سوٹ کے عقب میں چلتے رہیں مگر اور ہر قسم کی طاقت اُن سے لے لی۔ جو مکالمہ ان حضرت نے ساڑھی اور سُوٹ کا سُنا اُسے آپ یوں بیان کرتے ہیں:-

سُوٹ۔ معاف کیجئے، اگر جی چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ سیر کا لطف اُٹھاؤں انکار نہ کیجئے!

ساڑھی۔ آپ ساتھ ساتھ تو چل ہی پڑے مگر میں سوچتی ہوں کہ میرا آپ کا کیا ساتھ؛

سُوٹ۔ کیوں؛

ساڑھی۔ جناب یہ بندی کسی غریب ہندوستانی جلاہے کی دستکاری کا سیدھا سادھا نمونہ اور وہ بھی

ایسا جیسے سبھی کہ وہ بے بھولے پن سے لپٹ جانے کی عادت، اور آپ ماشاء اللہ مغربی جیتی جاگتی چالاکی کا بہترین اشتہار۔ چلیں تو اکڑ کر اور رہتا ہوں تو وہ بھی شکنجے میں۔

سوٹ۔ بنانے میں تو آپ مشاق معلوم ہوتی ہیں۔

ساڑھی۔ واللہ بنا نہ رہی تھی۔ کیا جو کہتی ہوں وہ غلط ہے؟ مجھ غریب کا تو دامن آج تک جیب سے آلودہ نہیں ہوا اور آپ ہیں کہ اوپر جیب، نیچے جیب، اندر جیب، باہر جیب۔

سوٹ۔ (ہنس کر) خالی جیب سے جیب نہ ہونا اچھا ہے۔

ساڑھی۔ (انداز دلربائی سے) جی ہاں، جیب خالی اور اس پر اکڑ بازی۔

سوٹ۔ جناب یہ آپ کے آنچل کا ذرا سا کھسکنا سب کس بل نکال دیتا ہے۔

ساڑھی۔ اوہو! آپ تو شاعر مزاج معلوم ہوتے ہیں۔

سوٹ۔ ہوں تو نہیں مگر بننا پڑتا ہے۔

ساڑھی۔ اچھا آپ زبردستی شاعر نہ بنئے اور کچھ آپ بیتی کہئے۔ جھوٹ چاہے کتنا دلفریب ہو سچ کے سامنے ہیچ ہے۔

سُوٹ۔ تعمیلِ ارشاد میں عذر نہیں مگر بہتر تو یہی ہے کہ آپ بیتی نہ کہوں۔

ساڑھی۔ جی نہیں، ہم تو ضرور سنیں گے۔

سُوٹ۔ اچھا تو سنئے۔ میں جب سے اس ملک میں آیا ہوں در اصل جلا بھنا رہتا ہوں۔ میرے وطن میں بہت ہی میری ذلت ہوتی تو بھی یہ خوشی ضرور رہتی کہ کبھی کبھار کوئی اچھا سا فراک میری گود میں بیٹھتا گا ہے ماہے قہقہوں کی لہر مجھ سے فراک تک اور فراک سے مجھ تک رواں ہوتی۔ چہل پہل میں وقت گزرتا مگر جس دن سے یہاں آیا ہوں میری تو مٹی خوار ہے۔ یہ سنتے سنتے کہ حد سے تجاوز نہ کرو، اعتدال سے کام لو، چلو تو سنبھل کر، بیٹھو تو سمٹ کر، دیکھو تو جھک کر، پاس رہو مگر دُور دُور رہیں تو

جان بلب ہوں ۔ اچھا ہو جو کسی دن پھٹ پھٹا کر اس دنیا سے چل دوں ۔

ساڑھی ۔ کیوں ؛ میں نہ کہتی تھی کہ میرا آپ کا ساتھ نہیں ۔ آپ کون ہیں یہاں کی تہذیب پر نکتہ چینی کرنے والے ؛ کیا اتنا بھی پتا نہیں کہ عبیر کا کیا مذکور بھائی بہن کو نہیں کہہ سکتا کہ "بہن تم حسین ہو" جب زمانہ بدلے گا تو بدلے گا فی الحال تو پرانی تہذیب رائج ہے اور اُس کے مطابق خوبرو کو حسین کہنا گناہ ہے اور اپنے آپ کو بُرا ثابت کرنا ہے ۔

سُوٹ ۔ یہی تو رونا ہے کہ دیکھیں تو بُرے ، کہیں تو بُرے اور جو قدرے قلیل آزادی چاہیں تو بُرے ۔ آپ نے مجھ سے میرا حال پُوچھا کیوں تھا ؛

ساڑھی ۔ خدا جانے کیوں مگر مجھے تو کچھ ہمدردی پیدا نہیں ہوئی ۔ ہمارا پُرانا فلسفہ تو یہ کہتا ہے کہ رنج میں بھی راحت ہے اگر انسان کا ایمان ٹھیک ہو ۔

سُوٹ ۔ یہ بات مطلقاً سمجھ میں نہیں آئی ۔ رنج میں کس طرح راحت ہو سکتی ہے ؛

ساڑھی ۔ آپ روحانیت سے بالکل عاری معلوم ہوتے ہیں ۔ رنج خدا کی طرف سے ہے اور جب اُس کی مرضی سے ہے تو اُسے بخوشی قبول کرنا چاہیے ۔ آپ کی خواہشات کے مطابق دنیا کا نظام جب نہیں ہے تو بہتر ہے کہ آپ وہ خواہشات ترک کر دیں ۔ یہاں اگر فراک اور ساڑھیاں آپ سے ملنے سے کتراتی ہیں تو آپ اُن سے ملنے کی خواہش ہی دل سے نکال دیں ۔ قسمت کے آگے سرِ تسلیم خم کریں ۔

سُوٹ ۔ یہ ہو چکا ۔ اگر روحانیت یہی ہے کہ کوشش نہ کی جائے تو ایں جانب کا روحانیت کو دُور ہی سے سلام ہے ۔ کوشش کر کے آپ سے نہ ملتا تو یہ چند لطف کی باتیں کیسے سُنتا ؛

(۲)

صاحب سُوٹ بیان کرتے تھے کہ کبھی نکڑ پر یک لخت ساڑھی غائب ہو گئی اور اُن کا سُوٹ پھر اُن

کے گلے کا ہار ہو گیا اور یہ بھی کہتے تھے کہ اُس دن سے وہ اپنے سُوٹ سے۔ ماننے سخت خجل رہتے ہیں کہ اس پردیسی کی زندگی عبث حرام کی۔ جب ان کی طبیعت ذرا زیادہ گداز ہوا کرتی ہے تو فرمایا کرتے ہیں کہ اس ملک میں انسان تو کیا اچھا کپڑا بھی اپنی نظروں میں ذلیل ہو جاتا ہے۔

اس امر کی بہت کوشش کی گئی کہ پتہ چلایا جائے کہ کیا ساڑھی نے ساڑھی پوش سے اس ملاقات کا ذکر کیا یا اس تمام واقعے کو کھا گئی مگر اُڑتی اُڑاتی بھی کوئی خبر نہ سُنی۔ البتہ اس واقعہ سے ایک دو مہینے بعد کسی خاتون کی تحریر ایک رسالے میں شائع ہوئی۔ اس تحریر سے شاید عقدہ کشائی ہو سکے وہ تحریر حسب ذیل ہے:۔

ساڑھی سے گفتگو

"چڑیل یہ تیرا اکھڑ کنا مجھے کہیں کا نہ رکھے گا! کیا کہا کہ بیوی! یونہی خفا ہوتی ہو!' الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ بھلا جو میں یونہی خفا ہوتی ہوں تو یہ بتا کہ کل جو میں جوہری کی دُکان پر کھڑی تھی تو تو کیوں اس جنٹلمین کے سوٹ کو چھو رہی تھی؟' 'ہوا کی اٹھکیلیاں' اُف ری لپاٹن! ہوا کا تو وہاں نام و نشان نہ تھا۔ اچھا ہاں سچ بتاؤ۔ کیا کہا کہ 'ایک دفعہ یونہی ملاقات ہو گئی تھی۔ سوٹ کا مجھ سے اور میرا سوٹ سے رنگ کھلتا تھا' 'اچھا کہاں ملاقات ہوئی تھی؟' بیوی وہ تہ ہونے کے لئے گیا تھا اور مجھے آپ نے رنگنے کے لئے دیا تھا۔ وہ ایک بھلے سے آدمی کی دُکان ہے ناٹھنڈی سڑک پر۔ بس وہیں ہم دونوں تیار تھے لیکن لینے کوئی نہ آیا تو ہم یونہی چہل قدمی کے لئے ذرا نکل پڑے تھے۔ اللہ کی قسم ایسے مزے کی باتیں کرتا ہے کہ کیا کہئے مگر میں نے اُسے خوب بنایا۔ اب آیا میری سمجھ میں یہ تیرا بنا ٹھنا رہنا۔ شرم حیا گھول کر پی گئی ہو کیا کہا؟' کیا کروں کہ رنگ ہی شوخ ہے' تیرا تو دماغ چل گیا ہے مگر بندی اس آزادی کی حامی نہیں کیا کہا کہ 'تم نے اسے بہت سمجھایا؟ بچارا رو دیا تو رحم آیا' جی نہیں ایسے رحم کو تم رہنے دو۔ لوگ کچھ کا کچھ

سمجھنے لگتے ہیں۔ اب تمہاری زبان بند بھی ہوگی یا یونہی قینچی کی طرح چلتی جائے گی؟ کیا کہا کہ 'ہنسنا بولنا کیسے بند ہو؟' ہے نا تو آفت! اب جو کچھ کہوں گی تو رد دو گی۔ کیا کہا کہ برا ماننے کی بات نہیں مگر امر واقع یہ ہے کہ انسان کپڑے سے ہی بنتا ہے، جی ہاں۔ گویا وہ جاہل لوگ جو کپڑا نہیں پہنتے انسان ہی نہیں۔ اری ہے تو تُو دیسی مگر باتیں تیری سب فرنگنوں کی سی ہیں۔ کیا کہا کہ میری بلا فرنگن ہو۔ بات یہ ہے کہ سب ساڑھیوں نے حلف اٹھایا ہے کہ ہندوستان کی خاتونوں کو آزاد کر کے چھوڑیں گی، اُف ری تیرے دعوے! گویا یہ جو ہندوستان میں ترقی کی رَو ہے اُس کے محرک سوت، کپاس اور ریشم ہیں۔ کیا کہا کہ ہاں بیوی سچ تو ہے۔ مردکم بخت ولایت گئے تو وہاں سے ٹویڈ اٹھا لائے مگر ایک صدی سے ہندوستان کی روئی سفر کر کے ململ بن کر آرہی ہے آخر کچھ تو اس سفر کا اثر ہونا تھا مجھ میں بھی ولایتی تاگا ہے مگر اس کی بدولت نہیں بلکہ نشو و نما کا تقاضا ہے کہ ہم آزادی چاہیں۔ دیسی کھیتوں میں امریکن کپاس کا بیج، انگریزی نہروں کا پانی، جاپانی کارخانوں کی مانگ۔ چھوڑیئے وہ اب اپنی پرانی ترنگ، تُو تو بڑی عالم فاضل نکلی۔ کیا کہا کہ 'اب مسکرا دوں۔' کیوں؟ کیا تجھے میرا مسکرانا بھاتا ہے؟ اری کیوں لپٹی جا رہی ہے۔ چلوں؟ کہاں؟ باہر۔ دیوانی ہو خواہ مخواہ چل نکلوں، کیا کہا کہ 'اور کئی ساڑھیاں مل جائیں گی'۔ اور جوان کے ساتھ مرد ہوئے؟ کیا کہا کہ 'اگر ہوئے تو کوئی اچھی سی بات ہی کہیں گے کچھ کھا نہ جائیں گے'۔ نہ بابا تُو تو بڑی دلیر ہے"۔
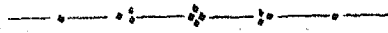
مسافر

فلک فرسائیاں کچھ ہوچکیں، جو باقی ہیں سو ہوتی رہیں گی مگر آج ایسے مسافروں کا ذکر مقصود ہے جن کی عالم بالا تک قطعی رسائی نہیں۔ یہ شوریدہ سر مسافر ٹڈی دل کی طرح آتے ہیں پھیلتے ہیں، جو کچھ ملے اسے چٹ کرتے ہیں مگر پھر ایسے غائب ہوتے ہیں کہ گویا کبھی آئے نہ تھے۔ طرفہ یہ ہے کہ ان مسافروں کی زندگی کا مدار باہمی کشمکش پر ہے۔ جس قدر ایک دوسرے سے برسر پرخاش رہیں اسی قدر ان کی گرم بازاری ہے۔ جہاں ان کا لڑائی ڈنگا مٹا وہیں یہ خود بھی کس مپرسی کے بوجھ تلے دب مرے۔

یہ مسافر عقائد ہیں۔ عالم بالا میں جبرئیل بیچارے کے پر جلتے ہیں تو ان لڑاکوں کی کیا مجال؟ وہ جگہ جو تُو تُو مَیں مَیں سے خالی ہو، جہاں جو پہنچے وہ کچھ نہ رہ کر سب کچھ بن جائے عقائد کے جنجال سے آزاد ہے، وہ جگہ جو ہے مگر جس کا ذکر گناہ برتر از کفر ہے...... نہیں، نہیں! میں اپنے قارئین کو وہاں نہ کھینچوں گا۔ جسے وہاں جانا ہو وہ پہلے یہاں کے مسافروں کا حال سُنے اور جب ان سے چھٹکارا ہو جائے (قطعی اور کلّی) تو پھر ممکن ہے کہ.......

دوست! پیارے دوست!! کیا تم نے سمجھا کہ میرا قلم کیوں رُکا؟۔ یہ بھی ایک عقیدہ ہے کہ "عقیدہ نہ ہو" میں ایسی مہلک چیزوں سے کوسوں بھاگتا ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مجھے عقائد سے محبت ہے، اور مجھے اچھی طرح علم ہے کہ لنگڑوں کو تیمور ہونے اور قیصروں کو بے دست و پا ہوتے دیر نہیں لگتی۔ لو اب سنو۔

(۲)

جب میں چھوٹا ہوتا تھا تو جادو میں اعتقاد خاص لاہور میں کافی زوروں پہ تھا۔ ہر شخص کی زبان

پر تھا "جادو برحق جادو کرنے والا کافر" اس زمانے میں بہت سی بیماریاں جو اب جراثیم کے سر تھوپی جاتی ہیں جادو کا نتیجہ ہوتی تھیں۔ ان کا علاج بھی جادو ہی کے ذریعہ سے ہوتا تھا۔ کئی آدمی مشہور جادوگر تھے۔ ان کی خاصی دوکان چلتی تھی۔ مقدموں میں ہارجیت بعض دفعہ جادو کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ وہی لاہور اب ہے کہ نہ جادوگر ہیں نہ جادو۔ یہ پرانا اعتقاد اب موت کی طرف رینگ رہا ہے اور کوئی ایسا نہیں کہ اس بڈھے کے مرنے پر شادیانے بجانے کی آرزو رکھتا ہو۔

یہ بھی ایک اعتقاد تھا کہ بڈھے کا مرنا خوشی کا موجب ہے۔ اب اول تو کوئی بڈھا مرنا نہیں چاہتا (سول لسٹ کے طالب علموں سے اس کا حال پوچھا جائے) اور مرے بھی تو کس اُمید پر۔ کوئی خوشی کرنے والا نظر نہیں آتا۔ چنانچہ یہ اعتقاد بھی تپ دق کے تیسرے درجہ میں مبتلا ہے۔ تعویذ باز بھی اپنے پرانے ایمان سے پھرے نظر آتے ہیں۔ جھاڑ پھونک نہ گنڈے۔ ڈاکٹروں کی چاندی ہے۔ پیروں کے گھر بک رہے ہیں مگر کیا مجال کہ کسی کم بخت آنکھ سے ایک آنسو بھی بہا ہو کہ تعویذوں میں اعتقاد اب بستر مرگ پر ہے۔

ایک سب سے بڑا اعتقاد تھا کہ ہاتھ کا دیا کام آتا ہے۔ کئی حضرت ما بزرگوں کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ چھپ چھپ کر خیرات کرتے تھے کہ اس مولا کے نام کے سودے کا چرچا نہ ہو۔ اب جس چندہ دہندہ کا نام نہیں اخباروں میں نہ چھپے وہ سمجھتا ہے کہ دُنیا احسان فراموش ہے۔ یہ پرانا اعتقاد بھی چل بسا۔ وہ اللہ والے مولیٰ پرست ہی نہیں تو مولا سے سودا کون کرے؛

تعجب ہوتا ہے کہ جب انسان اعتقادوں کے لئے زندہ ہیں اور اعتقادوں کی یہ حالت ہے کہ کچھ دن فیشنیبل رہ کر پھر وہ ایسے مرتے ہیں کہ کوئی اُن کا نام لیوا تک نہیں رہتا تو کیوں اس قدر اعتقاد پرستی پر زور ہے؛ کیوں انسان اس قدر بے بس ہیں کہ بجائے اس کے کہ اپنے لئے زندہ رہیں وہ پسند کرتے ہیں کہ اپنے دماغوں کو مرنے والوں، اعتقادوں کے مزار بنائیں؛

اسی ادھیڑبن میں تھا کہ تین چار پھٹے پرانے کپڑوں والے کمرے میں داخل ہوئے۔ محض عادتاً میں تعظیم کے لئے کھڑا ہوا اور ان حضرات سے اشارے سے کہا کہ آپ تشریف رکھئے۔ بیٹھتے بیٹھتے ان لوگوں نے رسمِ تعارف ادا کی۔ ایک صاحب بولے "مجھ مسکین کا نام خیرات ہے"۔ دوسرے بزرگ بولے "اس عاجز کو پیری مریدی کہا جاتا تھا"۔ تیسرے ترانے نے دبی زبان سے کہا "مجھ خاکسار کو جادو کے نام سے یاد کیا جاتا"۔ چوتھے صاحب کچھ کہنے کو تھے کہ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں بول اٹھا، "حضرت تعارف تو ہوتا ہی رہے گا آپ بیٹھئے تو سہی۔ مسلمان کا گھر ہے۔ آپ کا اپنا گھر ہے۔ اس قدر تکلف کیوں فرماتے ہیں؟" یہ جملہ چونکہ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا تو ان بزرگوں کے چہرے پر کچھ رونق سی نظر آئی۔ دل ہی دل میں خوش ہوا کہ مجھ بدنصیب سے آج تک کوئی نیک کام نہ ہوا تھا۔ شاید یہی نیکی کام آ جائے کہ میں ان لوگوں سے اچھی طرح ملا ہوں۔

تھوڑی دیر تو اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ گردشِ ایام کی نسبت فقرے چست ہوئے۔ غرض کے بندوں کو برا بھلا کہا گیا۔ لوگوں کے ظاہر باطن کا پول کھولا گیا مگر آخرکار یہ وفد اپنے اصل مطلب پر آیا۔

جادو۔ سنئے مسٹر۔ ہم جو مخل ہوئے ہیں تو کسی غلط فہمی کی وجہ سے نہیں ہوئے۔ اپنا وقت اچھا یا برا ہم لوگ گزار چکے۔ نیا دَور دَورہ ہے اور اگر ہم لاکھ معقول وجہ بھی آپ کی سائنس کے خلاف پیش کریں تو بھی ہم کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ہم ہزار دفعہ کہیں کہ "طوقِ زریں ہمہ در گردنِ خرمی بینم" مگر ہماری سنتا کون ہے۔ جن لوگوں کی نظروں میں خر خر ہی نہیں بلکہ خر عیسٰے ہے ان سے بحث فضول ہے۔ ہمیں یہ فخر کافی ہے کہ ہماری اتزن سائنس کے زیبِ سر ہے۔ ہم تو صرف یہ کہنے آئے ہیں کہ اگر ہم لوگوں کے لئے پنشن بھی میسر نہیں ہو سکتی تو آپ کم از کم یہ تحریک تو کریں کہ ہماری تجہیز و تکفین تو ایک معقول طریقے سے کر دی جائے۔ اس سے زیادہ ہمارا کچھ مطلب نہیں۔ ہم اہلِ دنیا کی

خدمت کرتے کرتے تھک گئے۔ خود اپنے آپ سے تھک گئے۔ ہم اب چلتے بھلے مگر کیا آپ کی خودداری اس امر کی اجازت دے گی کہ آپ کے بزرگوں کے ہم نوالہ ہم پیالہ اس غیر حالت سے مریں کہ ع

کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

میں ۔(رسمی طور پر) بندہ پرور للہ مجھ سے تو ایسے الفاظ نہ کہیئے۔ بزرگوں سے جو آپ کی مراعات تھیں وہ میرے دل پر نقش ہیں اور کافر ہو جو یہ جانے کہ آپ کا وقت پورا ہو چکا۔ ابھی تو ہندوستان میں صدیوں آپ کا ڈنکا بجے گا۔

خیرات ۔ آپ ہم مسکینوں سے یہ رسمی جملے استعمال نہ کیجئے۔ ہمارا جنازہ آج نہ نکلا تو کل نکلے گا۔ آپ سے عرض کرنے کا مدعا صرف اس قدر تھا

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

خدا کی شان کہ خود آپ بچپن میں ہم سے کھیلے اور اب یہ بیگانگی کہ مغربی تہذیب کے دام تزویر پھیلائے جاتے ہیں۔

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

میں ۔ معاف کیجئے۔ آپ کی حالت واقعی قابل رحم ہے۔ قوم کی احسان فراموشی کی آپ زندہ تصویر ہیں مگر آخر یہ تو فرمایئے کہ قوم بچاری خلافت والوں سے طلاق لینے کے بعد سیدھی تبلیغ تنظیم والوں کے گھر جا پڑی اور وہ لوگ پیسے کے پیر ہیں اب آپ کے لئے رقم آئے تو کہاں سے؟

پیری مریدی ۔ تو گویا آپ کی طرف سے صاف جواب ہے۔

میں ۔ جی نہیں۔ میں تو آپ لوگوں کا خادم ہوں جس باوفا نے آپ لوگوں کو لندن اور پیرس میں نہ بھلایا جس نے وہاں سفید ہاتھوں پر بیعت کی ہو اور جو احضر آنکھوں کے جادو سے نہ بچا ہو وہ آپ

سے کیا بے اعتنائی کرے گا مگر آپ ہی ارشاد کیجئے کہ اب صورت ہو تو کیا ہو؟

جادو، خیرات، پیری مریدی۔ (یک زبان ہو کر نہایت مایوسی کے لہجہ میں) کیا آپ کو یقین ہے کہ مسلمان ایسے گئے گذرے ہو گئے کہ ہمارے نام سے بھی بیزار ہیں۔

میں۔ معاذ اللہ معاذ اللہ۔ آپ یہ نہ فرمایئے۔ اب بھی لاکھوں خدا کے بندے ہیں جو آپ کا دم بھرتے ہیں مگر رفتار زمانہ تو دیکھئے۔

سب۔ تو ہم آپ سے کیا اُمید رکھیں؟

مَیں۔ مجھ بے بس کا زور چلے تو آج سب کو مثل سابق تخت نشین کر دوں اور میری قوم کو بھی شاید عذر نہ ہو مگر مصیبت تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو غیر مذاہب وہابی ہونے پر مجبور کر رہے ہیں۔ مکّے مدینے میں لوگ وہابی ہو گئے تو لاہور بیچارے پر کیا گلہ۔

سب۔ بڑی مشکل ہے۔ مرنے آپ نہ دیں جینے کے یوں لالے ہم کریں تو کیا کریں۔

مَیں۔ حضرت۔ قرائن سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ کو رحلت ہی کرنی ہوگی اور وہ بھی خفیہ خفیہ مگر شرطِ ایمان تو یہ ہے کہ لَا تَقْنَطُوا۔ ممکن ہے کہ آپ کے دن پھریں اور پھر آپ اور میری قوم شیر و شکر ہو کر رہیں۔

سب۔ آپ نے رہا سہا بھی ہماری اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ گو ہم تھک گئے ہیں مگر ہم اب چلیں گے رونا صرف یہی ہے کہ اگر ہم کو ذرا بھی شبہ ہوتا کہ مسلمان بھی ہم سے غداری کریں گے تو ہم آج سے کئی سو سال پہلے اس قوم سے پہلو تہی کرتے۔ افسوس ہے تو بس اس قدر کہ آپ نے بھی حقِ صحبتِ دیرینہ ادا نہ کیا۔ لیجئے۔ خدا حافظ۔

وہ بزرگ تو چل دیئے مگر ان کا آخری جملہ تیر کی طرح کھٹکا۔ میں ان کے پیچھے لپکا کہ انہیں بلاؤں

گلے سے لگاؤں اور یقین دلاؤں کہ اوروں کا تو ذمہ لینا مشکل ہے مگر جہاں تک میرا دم ہے ان کی عزت حرمت میں فرق نہ آنے گا۔ مگر وہ تھکے مسافر بلا کے گرم رفتار نکلے۔ یونہی جھلک سی دکھائی دی کہ وہ اسی گروہ میں مل گئے جس میں پرانے مصری فرعونی اعتقاد۔ پرانے یونانی اعتقاد۔ پرانے رومن اعتقاد۔ پرانے تورانی اعتقاد تھے۔ بہت دیر تک کلیجہ مسوسا کیا مگر آخر شکر کیا کہ اب مسلمانوں کو بھی موقع ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ یہ سوچیں کہ کیا تھا، یہ سوچیں کہ کیا ہو۔ مگر میرا شکر قبل از وقت ثابت ہوا کیونکہ جونہی میں مڑا تو پہلو سے ایک ناگوار قہقہہ کی آواز آئی اور وہ بزرگ جن کو اپنا تعارف کرانے سے میں نے ٹوک دیا تھا تضحیک آمیز لہجہ سے فرمانے لگے "آپ نے اس وقت میری بات نہ سنی۔ مجھے بھی ان کا نام رواج ہے۔ آپ چند بوسیدہ اعتقادوں کے اُٹھ جانے پر اس قدر خوش کیوں ہیں؟ ابھی تو میرا تسلّط قائم ہے۔ جب تک شادی بیاہ، ترکہ، میراث اور روزانہ میل جول میں پرانے رسم و رواج قائم ہیں تب تک کیا ہوا کی تدبیر عبث ہے۔ مشرقی انڈوں سے مغربی مرغے پیدا ہو چکے مگر میں آپ کو وعظ سنانے کے لئے حاضر نہیں ہوا۔ میں جو ان جوانا مرگوں کے ساتھ مل کر آپ کے پاس پہنچا تو اس کی علّتِ غائی صرف یہ تھی کہ آپ کو اس خطرہ سے آگاہ کروں جو ذاتی طور پر آپ کو درپیش ہے۔ ایک دفعہ آپ میرا مقابلہ کرکے زک اُٹھا چکے ہیں۔ اب آپ کا خیال یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں غازی کمال پاشا کے خیالات کی توسیع ہو اور دعوےٰ آپ کا یہ ہے کہ آپ کے یہ خیالات اُس وقت سے ہیں جب ابھی کسی نے غازی پاشا کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ آپ کے لئے بہتر یہی ہے کہ قوم کے لیڈروں کی ہاں میں ہاں ملائیے اور اپنی مشرقی گگڑوں کوں کو جاری رکھیئے۔

(۳)

جب یہ بڈھا اپنی بک بک ختم کر چکا تو مجھے خیال ہوا کہ رواج مذہبی عقائد سے کہیں زیادہ مضبوط ہے اور جو چند مستورات اس بڈھے کا گلا دبانے میں مصروف ہیں وہ اسے مذہب کے پھندے سے پھانسی

دینا چاہتی ہیں حالانکہ رواج کی جان یہ ہے کہ جہاں اس سے لڑو وہیں وہ پہلے سے زیادہ مستحکم ہوتا ہے۔ یہ سوچتے ہی ہر روحانی روزانہ اخبار میں ایک اشتہار روانہ کیا۔

"ضرورت ہے سخت ضرورت ہے۔ فوراً ضرورت ہے۔ ایسے خندۂ پیہم کی جو ایک بڈھے کو ہنساتے ہنساتے اس کا دم نکال دے۔"

سائنس کی طرف سے جواب آیا کہ جناب من میرے کارخانے میں اور سب کچھ ہے مگر ہنسی کی ساخت شروع نہیں ہوئی۔

مذہب کی طرف سے جواب آیا "کارِ خیر میں بھی ہنسی سے امداد طلب کرنا مذہب کی توہین ہے۔"

اس جواب پر تولاحول پڑھا اور پھر شیطان کا خط شوق سے کھولا۔ لکھتے ہیں:۔

"حضرت میرے ایک چیلے سے میرے دوسرے چیلے کو قتل کرانا چاہتے ہو! بڑے اُستاد ہو کہ مولویوں کے کام میں ابلیس کی اعانت کے مدعی ہو۔"

جب ابلیس سے بھی مایوس ہوا تو عقل کے پوسٹ کارڈ پر نظر پڑی۔ بڑی بی نے صرف ایک جملہ لکھا۔

"تم تو سودائی ہو"

(۴)

مگر مجھے اس بڈھے مسافر کو ضرور اگلے جہان کا ٹکٹ لے کر دینا ہے۔ اور اس ٹکٹ کے دام وہی ہیں یعنی خندۂ پیہم۔ اس قدر اس بڈھے پر ہنسا جائے، اس قدر اسے ہنسایا جائے کہ جہاں پیری مریدی کی قبر ہے وہیں اس کی بھی مٹی بن جائے۔

شیطان اور بزرگ

بیٹھے بیٹھے انجیل کا ایک جملہ جو یاد آیا تو معاً یہ خیال گذرا کہ یا اگلے وقتوں کے لوگ بہت غصیلے تھے یا آج کل کے لوگ زیادہ شائستہ ہیں۔ وہ فقرہ یہ ہے "Get thee behind me, Satan." اس کا لفظی ترجمہ ہے "پیچھے ہٹ بے شیطان!" لاحول ولاقوۃ۔ یہ کہاں کی شائستگی ہے کہ ایک ہستی اپنا فرضِ منصبی ادا کرے اور اُسے جھڑک کر کہا جائے "چل! ہم نہیں آتے۔ تیری ایسی کی تیسی!" اگر بفرضِ محال یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ نیک رہنے کے لئے ترش رو ہونا لابدی ہے پھر بھی ناگوار سا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی مقدس ترش روئی کے ساتھ اندازِ گفتگو بھی بازاری ہو۔ آج کل کی زندگی میں سینکڑوں دفعہ دیکھنے میں آیا ہے کہ شیطان کو سخت سے سخت جواب اگر کسی نے دیا تو بس اتنا ہی کہا " واللہ معاف کیجئے۔ آج ناچ میں شریک نہ ہو سکوں گا۔" قصہ ختم ہُوا۔ نہ یہ کہ بازاری زبان اور پھر ہزاروں سالوں تک اس کا چرچا! آخر وہی دنیا ہے وہی شیطان ہے مگر اخلاق وسیع تر ہیں، یہاں تک کہ آج کل کے محمد شاہ رنگیلوں کو عیش پرستی کا تواتر بھی بارِ خاطر ہے۔ یہ فرق کیوں ہے؟ اسی خیالی کشمکش میں تھا کہ حضرتِ ڈلیش کی خوشبو آئی۔ نہیں اُن کے سگرٹ کی! ابھی کمرے سے باہر ہی تھے کہ فرماتے ہیں:۔

ڈلیش۔ اب کہیں چلو گے بھی یا یونہی اس کمرے کا ناک میں دم کرو گے؟ تمہارا کمرہ تم سے اکتا چکا ہے۔ کمرے کا حق ہے کہ کبھی کبھی تازہ ہوا اسے بھی نصیب ہو۔

مَیں۔ ایک مشکل حل کر دو تو جہاں کہو چلوں۔

ڈلیش۔ اگر مشکل ہے تو تو بندہ حاضر ہے لیکن آسان مشکلوں کے لئے کسی قومی لیڈر کو چندہ عطا کیجئے۔

میں۔ واقعی خوفناک شکل ہے (یہ کہہ کر اسے "ہٹ بے شیطان" والی وقت پیش کی۔ ڈیش صاحب نیا سگرٹ جلاکر فرماتے ہیں)

ڈیش۔ میں تم سے بیس دفعہ کہہ چکا ہوں کہ موجودہ زندگی کا پہلا سبق یہ ہے کہ زمانۂ گذشتہ کی کسی بات کو بھی اس طرح نہ بیان کرو جس طرح کہ وہ ہوئی بلکہ اس طرح سے بیان کرو جس طرح سے کہ تمہارا اپنا نصب العین پورا ہو۔ مرنے والے مرمرا چکے۔ نہ ہم سے پوچھ کر وہ پیدا ہوئے نہ ہم سے پوچھ کر انہوں نے کھایا، پہنا، برتا، پوجا۔ اگر ان کا ہم پر کوئی حق ہے تو بس اس قدر کہ ہم یہ ثابت کریں کہ وہ بہت گمراہ تھے۔

میں۔ تو گویا تاریخ کوئی چیز نہیں۔

ڈیش۔ بہت بڑی چیز ہے، بالخصوص اس لئے کہ اسے بدلتے رہنا ہمارے اپنے اختیار میں ہے۔ اخبار روزانہ کھلم کھلا حالاتِ حاضرہ کو بدلتے رہتے ہیں۔ ایک اخبار میں ایک وزیر دانشمندی کا پتلا ہے تو دوسرے میں تعصّب کا بھوت۔ آخر تاریخ اسی مصالحے سے تیار ہوگی اور آج کل کے ٹکے سیر والے وزیر تو کیا ہمارے سامنے کئی نپولین، کئی کلائو، کئی اورنگ زیب موجود ہیں اور جیسی ضرورت ہوگی ابھی اور تیار ہوں گے۔

میں۔ اچھا! آپ تاریخ کو رہنے دیجئے۔ اصل مطلب پر آیئے۔

ڈیش۔ یہی تو اصل مطلب تھا کہ جس طرح ہم تاریخی ہستیوں کی حسبِ ضرورت اصلاح کرتے رہتے ہیں اسی طرح ہمیں پیغمبروں کی اصلاح کا بیڑا بھی اُٹھانا چاہیئے۔

میں۔ توبہ کرو توبہ! کیا کفر بکتے ہو!

ڈیش۔ کفر تم تو لتے ہو۔ تم اور تمہارے ہم خیال ہر دفعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہو کہ سب کے سب پیغمبر ناکامیاب ہوئے اور دنیا ویسی ہی بُری ہے جیسی کہ ان کے نازل ہونے سے پہلے بُری

تھی۔ میرے دل میں چونکہ پیغمبروں کی سچی عظمت ہے میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ وہ بے انتہا کامیاب ہوئے۔

میں۔ وہ کیسے؟

ڈیلش۔ بالکل آسان ہے۔ فرض کرو کہ کسی پیغمبر نے حکم دیا کہ زیتون کا تیل حرام ہے۔ مگر خود اس کی اُمت کے کچھ لوگ دبغا دمیں نطرزی میں ہلدی میں زیتون کے تیل کے خُم لنڈھاتے رہے۔ تم لوگ تو یہ کہہ دوگے کہ اس امر کی تعمیل نہیں ہوئی۔ گویا پیغمبر کو اس خاص معاملہ میں ناکامیابی ہوئی۔ میں یہ کہوں گا کہ ممانعت ہرگز نہ تھی۔ صرف یہ حکم تھا کہ جنہیں آسانی سے میسّر نہ ہوسکے وہ خواہ مخواہ زیتون کے تیل کی ہوس میں مقروض نہ ہوں۔ یہی صورت اس جملے کی ہے۔ میں اس جملے کا ترجمہ یوں کروں گا "جنابِ من۔ مجبوراً میں آپ کی طرف پیٹھ کر رہا ہوں۔ مجھے دوسری طرف جانا ہے"۔ قصہ ختم ہوا۔ فرض کرو کہ تم نے یہ نتیجہ نکالا ہوتا کہ اگلے وقتوں کے لوگ بہت صاف گو تھے اور آج کل منافقت کا زور ہے۔

میں۔ یہ نتیجہ تو ہرگز نہیں نکل سکتا تھا۔ اگلے وقتوں کے لوگ تو ذرا ذرا سے عقائد کے فرق پر دھمکیاں دیتے تھے کہ جلوگے، بھنوگے، دُنیا غرق ہوجائے گی۔ بات بات پر قیامت کے آثار دکھائی دیتے تھے۔

ڈیلش۔ تم بہت اکھڑ ہو۔ یہ اُن لوگوں کا محاورہ تھا، رنگیں بیانیاں تھیں۔ اور کچھ بھی ہو سوال یہ نہیں کہ وہ کیا سمجھتے بلکہ یہ کہ ہم انہیں کس کام میں لاسکتے ہیں؟ کسی چیز کو پڑا کھنا اور پھر اُسے استعمال کرنا کہاں کی دانشمندی ہے؟ ہمارا فرض عین یہ ہے کہ اگلے وقتوں کے لوگوں کے عقاید تبدیل کرتے رہیں۔ تمام موجودہ تنقیدی تفسیروں کا مرکزی اصول ہی یہ ہے کہ زمانۂ سابق کے عقائد کی اصلاح کی جائے نہ صرف عقاید کی بلکہ عادات کی۔

میں ۔ خاک تم نے میری مشکل حل کی ۔ ایک مشکل کو دس مزید گورکھ دھندوں میں لپیٹ دیا۔

ڈلیش ۔ بھائی تم فیشن ایبل انسان ہو ۔ میں بچارا سیدھا سادھا قدامت پسند ہوں ۔ مجھے واقعی زمانۂ ماضی کی ہر وہ چیز پسند ہے جو میری رائے کے موافق ہے اور جو بظاہر میری رائے کے موافق نہیں اُسے میں عقل کے زور سے اپنی رائے کے موافق کر لیتا ہوں ۔ آخر خدا نے عقل انسان کو اس لئے تو نہیں دی کہ اُس کا استعمال نہ کیا جائے ۔ بندۂ خدا! لوگ معجزوں پر ہاتھ صاف کر چکے، ضروری غیر ضروری احادیث رائج کر چکے اور تم ابھی یہ ٹھوکریں کھا رہے ہو کہ معمولی سے ترجمے میں تصرّف جائز ہے کہ نہیں ۔ اگر کچھ بھی تمہیں پاسِ وفا ہے تو اللہ کا نام لو اور ماضی کو بدنام نہ ہونے دو ۔

(میری بیگم کمرے میں داخل ہوتی ہیں)

ڈلیش ۔ (کرسی اُن کی طرف کھسکاتے ہوئے) آداب ۔ اجی بیگم صاحب کچھ ان حضرات کی تو اصلاح کیجئے! فیشن کے مارے بزرگوں سے علیک سلیک رکھنے کے روادار نہیں ۔

میں ۔ تم ڈلیش کی بک بک پر نہ جاؤ ۔ آپ فرماتے ہیں کہ بزرگوں کے عقائد کی اصلاح ہمارا فرضِ عین ہے۔

بیگم ۔ سبحان اللہ ۔ اپنے دھندوں سے تو فراغت نہیں بزرگوں کے پیچھے عقل کی لاٹھی لئے کون پھرے!

ڈلیش ۔ ایں خانہ تمام آفتاب است ۔ بیگم صاحبہ یہ تو سوچئے کہ ہمارے بزرگ نہ ہوتے تو ہم کہاں ہوتے۔ اگر اُور ان سے اچھا کام کوئی نہ بھی ہُوا ہو تو یہ تو کارِ خیر دہ کر گئے کہ ہم سے جانشین چھوڑ گئے ۔

بیگم ۔ مگر اُن کے عقائد کی اصلاح کس طرح ممکن ہے ؟

ڈلیش ۔ وہ خود تو میدان میں آکر لڑنے سے رہے ۔ اب تو جو ہم کہیں سو وہ وہ ہیں ۔ عصائے موسوی اور قبائے یوسفی سے آخر ہمیں کچھ کام لینا ہے یا نہیں ؟ ۔ اگر لینا ہے تو اپنی طرح ان چیزوں کو بدل کر قدامت پسندی کا ثبوت دیں ۔

بیگم ۔ آپ دراصل ہر بات کی تضحیک کرتے رہتے ہیں اور مولوی بچارے سچ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں

الحاد کا زور ہے۔ خود تو ملحد ہوئے سو ہوئے اب بزرگوں کو بھی آزاد خیال کرنے چلے۔ یہ بے ایمانی کیا نیا مذہب ایجاد ہؤا ہے؟

ڈلیش۔ عورتوں کی اس تنگ خیالی سے دق آکر اسلام نے گذشتہ سات آٹھ سو سال میں کوئی عالم عورت پیدا نہیں ہونے دی۔ ہر نیا مذہب ابتدا میں ایک ناپسندیدہ بدعت ہوتا ہے۔ مگر ساتھ ہی ہر نیا مذہب یہ بھی کہتا ہے کہ دُنیا کو وہی سکھایا جا رہا ہے جو پہلے پیغمبر سکھلا گئے۔

بیگم۔ میں تو بحث کے مخمصے سے کوسوں بھاگتی ہوں۔ یہ بتایئے کہ چائے ابھی منگواؤں یا تھوڑی دیر ٹھیر کر!

میں۔ جیسے تمہاری خوشی ڈارلنگ۔

ڈلیش۔ (تمسخر سے) ایمانداری کے دعوے اور ساتھ ہی ملحدوں کو چائے کی دعوت؟

بیگم۔ (قہقہہ لگا کر) یہی تو ہماری اخلاقی عظمت کا ثبوت ہے کہ سوشل تعلقات میں مذہبی اختلاف حارج نہیں ہوتے۔ اللہ کے بندے آپ کو چائے پلائیں گے مگر اللہ آپ کو جہنم ہی بھیجے گا۔

ڈلیش۔ مجھے جہنم رسید کر کے آپ کو کیا خوشی ہوگی؟

بیگم۔ (ہنستے ہوئے) بے انتہا خوشی! یہ خوشی کہ انصاف ہؤا اور سچ پوچھو تو جنت میں رہنے کی اصل خوشی یہی ہے کہ جن لوگوں نے یہ نہ مانا وہ جہنم میں ہیں۔ تمام اصلی اور سچی خوشی کی بنیاد یہ ہے کہ کوئی اور اپنی غلطی کے باعث تکلیف میں ہو۔

ڈلیش۔ معاذ اللہ، معاذ اللہ۔

(بیگم چائے کے لئے حکم دینے جاتی ہے)

میں۔ کیا تم کبھی بھی متانت سے کسی مشکل مسئلہ پر گفتگو کر سکتے ہو؟

ڈلیش۔ میں تو ہمیشہ ہی متانت سے گفتگو کرتا ہوں۔ تم ہی بتاؤ کہ تمہیں کیوں تکلیف ہوتی ہے اگر کسی نے شیطان سے درشت کلامی کی؟

میں ۔ لاحول ولاقوۃ! عجب احمق ہو! شائستگی سے گفتگو کرنا ہر شریف آدمی کا ذاتی فرض ہے متکلم چاہے کوئی ہو۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ شیطان جو مسلمانوں کا پیچھا نہیں چھوڑتا اس کی وجہ زیادہ تر غالباً یہ ہے کہ ہم اسے ہر وقت ستاتے رہتے ہیں۔ کبھی شیطان الرجیم کہتے ہیں، کبھی اعوذ باللہ کہتے ہیں۔ آخر اس فضول دل آزاری سے کیا حاصل ہے؟ اگر ہم اس کے ساتھ شریفانہ برتاؤ کریں تو ممکن ہے کہ وہ بھی ہمیں کم دُکھ دے!

ڈلیش ۔ کیا مطلب؟

میں ۔ یہ مطلب کہ اگر خوشامد خود خدا کو پسند ہے تو شیطان کو تو بہت ہی زیادہ پسند ہوگی۔ کیوں ہم شیطان کی اس کمزوری کا فائدہ نہ اٹھائیں؟ جس مسلمان کو شیطان ملے وہ بجائے اعوذ باللہ کہنے کے خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ اسے موٹر میں سیر کرائے اور اگر موقع ملے تو کسی ہندو کانگرسی یا مہاسبھائی لیڈر سے شیطان کا تعارف کرائے۔ شیطان کے لئے بھی ایک نئی دلچسپی ہوگی اور کانگرس کا بھی بھلا ہوگا ہم لوگ اپنی کج اخلاقی سے خواہ مخواہ شیطان کو اپنی طرف راغب کرتے ہیں۔

ڈلیش ۔ خیال تو بہت اچھا ہے مگر مہاتموں اور پنڈتوں میں شیطان بیچارا کیا کرے گا؟

میں ۔ کرے یا نہ کرے ہمارا تو کچھ چھٹکارا ہو۔

ڈلیش ۔ اچھا تو تم شیطان کو ہر دل عزیز بناؤ اور میں بزرگوں کے عقاید کی اصلاح کروں۔ اس تقسیم کار سے شاید قوم کچھ اُبھرے۔

نفاست کا طلسم

بعض دولت مند ہندوستانی کوٹھیوں کے گول کمرے میں فرش فروش، میز اور کرسی، پردے اور قالینیں، آتشدان کے نمائشی نوادرات اور دیواروں پر رُوکھے پھیکے فوٹو مکینوں کے نوتعلیم یافتہ (یا نا تعلیم یافتہ) مذاق کا زندہ ثبوت ہیں۔ قالین اگر آگ بھبوکا ہے تو پردے جوگی اور میز پوش خاکی۔ کرسیوں کے علاوہ کی آب و تاب اگر ایک بھی ہو تو بھی ہر کرسی کا دم خم الگ ہے۔ ایک پر بیٹھو تو تحت الثریٰ تک پہنچائے بغیر نہیں چھوڑتی، اور جو دوسری پر سستانا چاہو تو گویا کمر میں کسی نے آہنی سلاخ ٹھونک دی۔ جس قدر یہ کمرے آنکھ کے لئے گستاخ اور کمر کے لئے ناہموار ہیں اسی قدر ان کی روحانی آب و ہوا کثیف ہے بھلا جہاں قالین چیخ چیخ کر پردے سے کہہ رہی ہو "بھیا! خدارا اپنے پاؤں تو ذرا ہٹاؤ" اور جہاں زرق برق میز پوش دیوار کی تصویروں پر ناک بھوں چڑھا رہے ہوں وہاں ملنے کا کیا لطف، اور اگر مل بھی بیٹھیں تو ناممکن ہے کہ فرنیچر کے اس شور و بکا میں نیچی نظروں کا میٹھی باتوں کا جادو چلے اور رنگ لائے۔

انسان بالکل پھول ہیں۔ جس طرح لُو پھولوں کو جھلس دیتی ہے اُسی طرح گرم فرنیچر خیال کی عروسیت کو سوخت کر دیتا ہے۔ ہزار رعنائی تصور سے انسان ایسے کمرے میں داخل ہو، فصاحت کے ہزار دُر شاہوار نثار خندۂ سیم تناں ہونے کے لئے تیار ہوں مگر جہاں ایسے کمرے میں ذرا بیٹھے تو باتیں یہ ہوتی ہیں کہ کلب میں آج کل جوتے میں دال بٹ رہی ہے، کانگرس کا چرخا نہیں چلتا، سرکار کا حقہ پانی بند ہے اور علیٰ ہذا القیاس۔ یعنی جو باتیں برآمدے کے کسی ذلیل کونے میں ہونی چاہئیں وہ فرنیچر کے تشدد سے گول کمرے میں اُگلی جاتی ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ایسے گول کمرے ہیں بھی اسی قابل۔

جن لوگوں کو اس تنقید پر شک ہو، وہ ایک سیدھے سادے معیار سے اپنے گول کمرے کی لیاقت کو پرکھ لیں۔ کسی ماہر موسیقی شیریں ادا سے دو بول سن لیں۔ اگر کمرے کا رنگ، پردے اور باقی لباس موزوں نہیں تو راگ دیواروں سے سر پٹخ پٹخ کر جان دے دے گا۔ لیکن اگر کمرہ کسی نستعلیق ہستی کی توجہ کا ممنون ہوا ہے تو راگ پھیلے گا، چیزوں سے لپٹے گا، دلوں میں کھُبے گا، آنکھیں بند ہونگی، سارے جسم میں خفیف سا رقص ہوگا اور راگ رُوح کو لے اُڑے گا۔

راقم حروف کو کسی کمرے کی توہین مقصود نہیں اور یہ تنقید محض تعلیمی ہے۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ امیر ہندوستانی کوٹھیوں میں اگر بچوں کی تعلیم کی طرف توجہ ہے تو اب یہ بھی لازمی ہے کہ کمروں کی تعلیم کی بھی ابتدا ہو۔ بعض کوٹھیوں میں اس وقت بھی گول کمرے نمایاں طور پر دلفریب ہیں۔ اس ضمن میں بیگم ب۔ ت کا گول کمرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ داخل ہوتے ہی معلوم ہوتا ہے کہ کمرے میں انسانیت ہے۔ اگلے دن چند منٹ مجھے تنہا اس کمرے سے ملاقات کا موقع ملا۔ نہ تو کمرہ مجھ پر جھنجھلایا نہ "ادھر دیکھو، اُدھر دیکھو" کہہ کر اُس نے میرے کان کھائے۔ نہ کہیں رنگ ایک دوسرے کو پھاڑے ڈالتے تھے نہ تصویروں سے دیواریں جھُکی پڑتی تھیں۔ بعض اچھے گول کمروں کا سامان بھی بسا اوقات اس قسم کا ہوتا ہے جیسے غزل میں شعر یعنی ایک دوسرے سے آزاد، مگر بیگم ب۔ ت کے کمرے کے سامانِ آرائش میں عزورِ حسن سے بھی بڑھ کر خلوصِ یگانگت کی جھلک تھی، یعنی یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی مزاج شناس نے ہر مختلف چیز کو زندہ اور بامذاق سمجھ کر اس کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اس کے لئے ٹھیک جگہ اور مناسب ہمنشیں تجویز کئے ہیں اور اس مزاج شناسی کی داد میں کمرے کی ہر چیز خوش و خرم تھی۔

جب میں داخل ہُوا تو پہلی ہی کرسی نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ ساتھ والی میز نے رسیلی آواز سے کہا "اس فوٹو کو تو ملاحظہ کیجئے!" فوٹو نے انداز سے کہا "میرے بغاوت پر مستعد کاکل میری CHIN کے لئے کس قدر دلفریب BACK GROUND (پس منظر) ہیں؟ بندے نے پنجاب میں بیٹھے

بیٹھے اس بہاری ادا کے عکس کی داد دی اور دل ہی دل میں کہا "کمرہ کیا ہے کسی کی طبعی نفاست کا طلسم ہے۔"

لوٹ۔

CHIN کا اُردو ترجمہ ایسے کمرے کے ذکر میں استعمال کرنا گناہ ہے۔ اس کمرے کی نفاست کا یہی کافی ثبوت ہے، کہ سینکڑوں میل اس سے دُور بیٹھے بھی اس کے خیال کے ساتھ زنخدان اور ذقن جیسے لفظ بھی ثقیل معلوم ہوتے ہیں۔

ہندی خاتون

اقبال منزل کی نشست گاہ میں

اقبال منزل کی نشست گاہ میں داخل ہونے پر نگاہِ حسن تلاش کے لئے دو مقناطیس ہیں دائیں طرف ایک قطعہ ہے جس میں خوشنویسِ ازل کا نام یعنی

اللہ

بڑی شان سے ہویدا ہے اور بائیں طرف ایک تصویر ہے

یعنی یہ ——— ؎

اللہ کی بندی

ان دو کو نہ دیکھنا تقریباً ناممکن ہے۔ انہیں دیکھ کر دوبارہ نہ دیکھنا قطعی ناممکن ہے۔ اس بتِ ہندی کی ادنیٰ نخوت یہ ہے کہ انسان اللہ سے منہ موڑے تو پھر اسے دیکھے۔

یہ تو پتہ نہیں کہ یہ کسی کی تصویر ہے یا محض مصوّر کی ذہنیت ہیں صنفِ نازک کی خیالی معراجِ کمال ہے مگر بینا دیکھنے والوں کا دل یہ ضرور کہتا ہوگا ؏

بہشت راچہ می کنم بُتا بہشتِ من توئی

؎ یہ لکیر کا تیر اُلٹا ہے۔ تیر انداز وہ ہے۔ دائیں بائیں مقابل جس طرف سے دیکھو۔ کمرے کے جس حصّہ سے دیکھو۔ پیرو مرشد غالب کے اِس شعر کی مصداق ہے دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

آکاش کے جوگی کی سُورگ اُس کے اپنے دل میں ہے مگر اس تصویر سے اتنا وہ ضرور کہے گا :۔

"کہیں نہ کہیں تُو ضرور ہوگی! یہ نہیں ہوسکتا کہ خدا مصوّر سے پیچھے رہ گیا ہو!! تُو ہوگی اور ضرور اپنی اِس تصویر سے بڑھ چڑھ کر ہوگی۔ اے رُخِ زیبا! اس تصویر میں تیری صرف ایک جھلک ہے۔ ہاتھ مالا میں، مالا گلے میں اور وہ دو میٹھے پڑوسی یعنی تیرے ہونٹ بس ہلا ہی چاہتے ہیں، تم باذنی کہنے کو ہیں مگر کہاں تُو خود اور کہاں تیرے فردوسِ ناز کا یہ اختصار؛ اس میں تیری خوشبو کہاں، تیری گفتگو کہاں؛ مصوّر نے ذرا سا کچھ دکھلا کر کیا کیا نہیں چھپایا؛ کس قدر تجھے ڈھانکا ہے؛ مگر مصوّر سچا تھا۔ ورنہ جو سجائے تیرے لباس کی تہ در تہ دلفریبیوں کے خود تیری گلعذاری کی شعریت کی داد دیتا، جو تیرے رنگ کی رونق کو تیرے دوپٹے کے فروغ کو یوں نہاں نہ کرتا تو تُو اے برقِ مستور خدا جانے کہاں کہاں گرتی؛ اے ناز آفریں! تیرا حسن بجائے خود ایک خدائی پیغام ہے مگر اس کی ترجمانی کا وقت نہیں ع خرابِ بادۂ لعل تو ہوشیار انند کا راگ کون شروع کرے اور اُس کے سننے والے کتنے ہیں؛ مگر ہاں یہ یقین رکھ کہ تو جہاں کہیں بھی ہے دُنیا تیری غزل خواں ہے۔ لے اب اے پری رخسار خدا حافظ! ہمالیوں میں یہ سفر تجھے مبارک ہو مگر اپنی سُرخ تلک والی بہنوں کی طرف ایک پیغام لیتی جا!۔ اُنہیں کہہ دے کہ گنگا والے تو مرنے کے بعد اپنی جلی راکھ گنگا میں ڈبوتے ہیں مگر اللہ والے جیتے جی اپنی آبرو گنگا میں بہا چکے ہیں، اب ان سے غصہ گلہ فضول ہے۔ انہیں کہہ دے کہ برسوں تُو خود دیکھ چکی ہے کہ ان کی آنکھیں اس شرم سے جھکی رہتی ہیں کہ ان کے دلوں کی اُمنگ کہ ہندوستان کی سیوا کریں پوری نہ ہوئی۔ کہہ دے کہ یہ شرمسار ہیں کہ چھُوت مٹانے آئے تھے مگر خود اچھوت بن کر رہ گئے اور ان کی انتہائی ندامت یہ ہے کہ جو کام انہوں نے شروع کیا وہ پُورا اب کسی اور سے ہوگا۔ یہ سب کچھ کہنا اور پھر اپنی بہنوں سے پوچھنا کہ "اپنوں کو غیر کب تک بناتی رہیں گی"۔"

صُوفی اور مُلحد

ملحد ۔ آپ کا فرمانا یہ ہے کہ لغوی معنی اگر لئے جائیں تو کوئی شخص کبھی دہریہ نہیں ہو سکتا کیونکہ زمانہ یا 'دہر' شخصی ہستی سے بالاتر ہے اور اس معنی میں اگر کوئی دہریہ ہو سکتا ہے تو وہ خود خدا ہی ہو سکتا ہے۔

صوفی ۔ مگر آپ یہ بھول گئے کہ میں متشرع صوفی ہوں ۔ شرعاً اس قسم کے سوال کہ خدا کی اپنی نسبت کیا رائے ہے، کیا وہ خود اپنا قائل ہے اور اگر ہے تو کیوں، قطعی ممنوع ہیں۔ غلط العام میں "دہریہ" لفظ کا اس شخص پر اطلاق ہوتا ہے جو ذاتِ باری کی صفات میں چوں و چرا کرے یا اُن سے منکر ہو۔ زبان کی لغزشوں میں سے یہ ستانہ ترین لغزش ہے کہ "دہریہ" جیسا متبرک اور محیطِ ہستی لفظ ایسے شخص کے لئے استعمال کیا جائے جو صرف مروّجہ عقاید سے باغی ہو۔ صُوفی نقطۂ خیال سے آپ جیسے لوگ دہریہ نہیں صرف ملحد ہیں۔

ملحد ۔ میرے ایک دوست نے مجھے یہ تحریر بھیجی ہے (پڑھ کر سناتا ہے)

تحریر

اے ہستی مطلق!

تو میرے دوستوں کا خدا ہے اور انہیں اپنے آپ کو تجھ سے جدا کرنے میں مزہ ملتا ہے۔ نہیں، تُو خود یہ مزہ لیتا ہے! جدائی کا اور جدائی کے ساتھ ملاپ کا مگر میرے دوستوں کو اس کا پتہ نہیں! وہ محض انجان بلکہ بے جان پیمانے ہیں اور تو شراب بن کر انہیں عبور کر جاتا ہے۔ پیمانے کو کیا پتہ کہ اس میں

پانی تھا کہ دوا تھی کہ شراب؛ پیمانے کو کبھی پیاس نہیں لگتی، نہ اسے کبھی شفا ہوتی ہے، نہ کبھی وہ نشہ میں چور ہوتا ہے۔ پیمانے کو تو تھوڑے اور بہت کی بھی تمیز نہیں۔ تو جسے چاہے بھر دے!

اے ہستیٔ مطلق!

میں جو تیرا قلیل سا جزو ہوں اس بزرگ نسبت کے باعث حمد سے، لعنت سے، گدا سے بے نیاز ہوں۔ نہ مانگتا ہوں، نہ دیتا ہوں، نہ ڈرتا ہوں،

اے ہستیٔ مطلق!

مجھے کسی چیز سے بچنے کی ضرورت نہیں یہاں تک کہ مجھے رسمی نیکی سے بھی گریز نہیں۔

اے ہستیٔ مطلق!

اگر تو دیکھنے والا ہے تو میں دیکھتا ہوں۔ اگر تو سمیع ہے تو میں سنتا ہوں مگر مجھے اس علم کا علم نہیں

اے علم کی ضرورت و قید سے بالاتر ہستیٔ مطلق!!

اے بے خبر باخبروں کا روپ بھرنے والی ہستیٔ مطلق!!

اے خیال کے جنجال سے آزاد ہستیٔ مطلق!!

تجھے بُلا نہیں رہا، بھُلا نہیں رہا، سیکھ نہیں رہا سکھا نہیں رہا۔ تو اعلانِ مطلق ہے مگر وہ اعلان جس میں عبارت نہیں، لفظ نہیں، حرف نہیں جس میں صدا کی ادا نہیں۔

اے خوشی کی مصیبت سے بالاتر ہستیٔ مطلق!!

اے نام کی زنجیروں سے معرّا ہستیٔ مطلق!!

تجھے نام دے کر خوشی چاہنے والوں کی صف کس قدر طویل ہے؛ خیال کرتے ہیں کہ اسی سے تیرے نام کی رونق ہے!

اے نورِ مطلق!

تو رونق سے بے نیاز۔ تیرا یہ جز ولاینفک عقاید سے عاری!"

جو شخص یہ لکھے اس کی نسبت آپ کا کیا خیال ہے۔

صوفی۔ لفظ کہیں کہیں اچھے ہیں۔ شاید معنی بھی ہوں مگر مجھے اس شخص کی نسبت رائے پیش کرنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

ملحد۔ آخر کچھ تو آپ نے خیال کیا ہی ہوگا؟

صوفی۔ یہ خیال ضرور آیا کہ یہ شخص دروغ بافی میں ماہر ہے۔ اپنے آپ کو عقاید سے مبرا بتلاتا ہے اور ساتھ ہی اس عقیدہ پہ زور ہے کہ وہ ہستی مطلق کا جزو ہے۔ اسے جزو اور کل کی تمیز کیونکر ہوئی اور اگر ہوئی تو اسے ظاہر کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ صوفیائے کرام اپنی تعلیم کے ایک خاص مقام پر خاموش ہو جاتے ہیں۔ اگر اس شخص کی تعلیم صحیح ہوتی تو یہ شخص بھی خاموش ہو جاتا۔

ملحد۔ کیوں حضرت! راستی کا اظہار کیوں نہ کیا جائے؟

صوفی۔ جناب من میرے مذہب میں بحث منع ہے۔ صرف آپ کے سوال کا جواب دوں گا۔ راستی کا اظہار منع نہیں بشرطیکہ وقت ہو اور سننے والے کے مبلغ علم کا پورا اور صحیح اندازہ ہو۔ راستی کوئی سنگریزہ نہیں کہ اٹھایا اور پھینک دیا۔ یہ وہ گراں بہا لعل ہے کہ صرف گوہر شناس کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔

ملحد۔ گویا آپ کا تصوف اجازت دیتا ہے کہ اخفائے حق کیا جائے۔

صوفی۔ اجازت کیسی یہی حکم ہے کہ جس کی جتنی سمجھ ہو اس سے اسی قدر بات کی جائے۔ جو شخص موجودہ عقاید کا صحیح استعمال کرنے کے ناقابل ہیں انہیں بہتر عقاید بتلانے سے کیا فائدہ؟ گدھے کو ہوائی جہاز میں سیر کرانے سے گدھے کے لئے کیا مفید نتیجہ نکلے گا؟

ملحد۔ آپ کے نزدیک زندگی ایک سربمہر راز ہے جس کی کلید سینہ بسینہ صوفیائے کرام کی تفویض

نہیں ہے۔

صوفی۔ یقیناً۔

ملحد۔ تو مجھے آپ کچھ تلقین کر سکتے ہیں؟

صوفی۔ جناب من مثال کے طور پر آپ یوں سمجھئے کہ میں اپنی فوج کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں۔ میں کبھی اپنی وردی کو داغ نہ لگاؤں گا۔ جو مجھے حکم ملے گا اس کی تعمیل کروں گا اور یہ کبھی نہ پوچھوں گا کہ یہ حکم کیوں ملا اور نتیجہ کیا ہو گا۔ اس لئے میں تو یہی تلقین کر سکتا ہوں کہ آپ اپنے الحاد میں ثابت قدم رہئے۔ آخر آپ کو اپنے الحاد سے یا میرے تصوف سے ڈر کیوں لگتا ہے؟

ملحد۔ نہیں چاہتا ہوں کہ آپ کی فوج قطعی مٹ جائے۔

صوفی۔ کیوں؟

ملحد۔ نوع کی خوشی کے باعث اور احیائے حق کی خدمت میں۔

صوفی۔ آپ کی تعلیم ابھی اپنے دروغ باف دوست کی تعلیم سے بھی کم ہے۔ جو شخص خوشی کے لئے زندہ ہے وہ گویا مردہ ہے۔

ملحد۔ اچھا آپ فرمائیے کہ آپ کس لئے زندہ ہیں؟

صوفی۔ مجھے کیا پتا! میں صرف... اس قدر جانتا ہوں کہ چونکہ میں زندہ ہوں اس لئے مجھے حتے الوسع لغو سوالوں لغو کاموں سے اجتناب لازمی ہے۔ وقت دوبارہ نہیں آتا اور علم کی کوئی حد نہیں۔ اس لئے علم سے زیادہ عمل کی ضرورت ہے۔ جتنا کم کھا سکو اتنا کم کھاؤ اور دل جسم کو صاف رکھو۔ اس سے زیادہ نیکی کی ضرورت نہیں گو اس کا حاصل ہونا بھی بہت مشکل ہے۔

ملحد۔ میرے پاس دلیل کوئی نہیں مگر میرا دل کہتا ہے کہ آپ کی تعلیم قطعی غلط ہے۔ بہت کھانے والا اور دل جسم کا گندا بھی ایسا موقع حاصل کر سکتا ہے کہ بہت بڑا کام کر جائے۔ محض از راہِ ہمدردی

کسی ڈوبتے کو بچالے، کسی مریض کو اپنا خون دے دے، کسی مجروح کو پیٹھ پر لاد کر شفا خانے پہنچا دے۔

صوفی ۔ بجا اور قطعی بجا مگر آپ زندگی کو لمحوں میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے دیکھتے ہیں۔ ہم لوگ ساری رَو کو دیکھتے ہیں۔ زندگی یہ نہیں کہ کسی ایک موقع پر عروج ہو جائے بلکہ اصلی زندگی یہ ہے (کیونکہ موت کا وقت معین نہیں) کہ ہر وقت انسان اُجلا ہو۔ روحانیات میں کوئی خاص فعل خاص طور پر قابلِ تعریف نہیں ہوتا بلکہ جس طاقت سے فعل سرزد ہوتے ہیں اُس طاقت کو ہر وقت بے لوث رکھنا قابلِ تعریف ہوتا ہے۔

"جی، جا"

—— • —— ••• —— •❖• —— ••• —— • ——

زندگی ضرور اور صرف پشیمانی کے لئے ہے گو میری تمنا ہمیشہ یہ رہی اور رہے گی کہ پشیمانیاں خوبصورت اور شاعرانہ ہوں! یعنی یہ حسرت نہ ہو کہ کیوں غلطی کی بلکہ یہ ہو کہ کیوں اعلےٰ تر غلطی نہ کی! یہ البتہ ضرور صحیح ہے کہ غلطی کے لئے جرأت درکار ہے اور مجھ جیسے مذہب کے سوکھے ٹکڑوں پر پلے ہوئے نحیف و زار میں جرأت کہاں؟ اس لئے میرے پشیمانیوں کے خزانے میں گراںبہا خلعت کم ہیں۔ عام طور پر اس توشہ خانے میں صرف دیسی اور بھاری پوشاکیں ہیں۔ ولایتی گلشنیں بہت نایاب ہیں اور خالص ولایتی اعلےٰ قسم کا ریشم تو گویا ہے ہی نہیں۔

یہ بھی سچ ہے کہ اعلےٰ تر بلکہ اعلےٰ ترین غلطی کی متواتر اور زبردست خواہش نے مجھے ہزارہا ذلیل قسم کی غلطیوں سے محفوظ رکھا گویا میں محض اپنے شدید قسم کے کفر کی بدولت اکثر رسمی ایمان میں مضبوط رہا۔ اے کاش کہ ایمان کی تلاش والے اس سہل طریقے کو سمجھ لیں کہ دوزخ کے دلدادوں کو ان کی ناکامیابی کی سزا میں بہشت ملے گی!

گناہ کی طرف منہ اٹھائے چلے جانے نے مجھے سیدھا دارالثواب میں داخل کر دیا! کس قدر میں بھٹکا؟
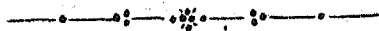
بڑی کتابیں اور چھوٹے آدمی

"ہمایوں" کے "فلک پیما" اور اپنے دوست میاں عبدالعزیز صاحب کو جو برطانوی حکومت کی طرف سے گول میز کانفرنس کے ایک سیکرٹری بن کر لندن تشریف لے گئے ہیں میں نے لکھا کہ اگر مصروفیت کی وجہ سے ہمایوں کے لئے وہ کوئی خاص مضمون نہ لکھ سکیں تو کم از کم انگلستان کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ اس کے جواب میں انہوں نے ذیل کا مضمون بھیجا :۔
اُن کے خط سے جو مضمون کو ساتھ لے کر آیا ناظرینِ ہمایوں کی دلچسپی کے لئے میں بغیر اُن کی اجازت کے چند اقتباسات یہاں درج کرتا ہوں۔

ب ۔ ر

بشیر!

میرے مضمون کا عنوان ہوگا

"بڑی کتابیں اور چھوٹے آدمی"

غالباً اس ہوائی ڈاک میں ڈال دوں گا ۔ خدا کرے جہاز بچ رہے۔

بشیر! انگلستان سمجھ میں آتا ہے بیان میں نہیں آتا ۔ ٹیلوں کو یہ لوگ پہاڑیاں کہتے ہیں، ندیوں کو دریا، کیاریوں کو باغ ۔ ایسے کم بخت اُلٹے ہیں کہ کھانے میں رہت بڑے کھانے میں کبھی اشور نہیں کرتے، گلہ نہیں کرتے اور اکل و شرب و مجلس ہر چیز کا لطف اُٹھاتے ہیں ۔ سچ تو یہ ہے کہ انہیں خوش رہنے کا مرض لاحق ہے ورنہ ایسے میلے موسم میں ایسی اجلی طبیعتیں ہرگز نہ ملیں ۔ ہوائیں دھواں اس قدر

ملا ہوا ہے کہ انسان تو انسان بجلی کا گلا بیٹھا جاتا ہے ۔ آج صبح زور شور سے بجلی کی کڑک ہوئی ۔ میرے لئے زندگی کی انتہائی خوشی یہ ہے کہ بادل زور سے گرجے اور پھر یکایک ۔ ایسا دھما کا ہو کہ دل دہل جائیں مگر اس کثیف ہوا میں بجلی بھی گرجی تو اس طرح کہ گویا اُسے بھی زکام تھا ۔

بشیر! بجلی خدا کی آواز ہے ، یہاں کم سنائی دیتی ہے ۔ تبھی یہ کم بخت روحانیات سے اس قدر دُور ہیں ۔ خدا کرے کہ اول تو اس کفرستان میں کوئی مسلمان وارد نہ ہو اور جو آ ہی پہنچے تو پھر یہیں کا ہو رہے ۔ اس جگہ کے سیل تبسّم کے بعد اپنے دیس کی گرمجوشیاں اور تپاک کس قدر پھیکے معلوم ہوتے ہیں ۔

بشیر! میں انگلستان کا کچھ بھی نہیں دیکھ رہا ۔ مگر چونکہ یہاں ہوں بالکل بھی آنکھیں بند نہیں کر سکتا ہر روز دس بیس نئی کتابیں ، ایک دو نئے ڈرامے ، اخبار ، رسالے ، جہاز ، جلسے ، ناچ اور لکچر ، نامۂ اعمال لکھنے والے یہاں سے Strike کر کے بھاگ گئے ۔ حشر کے دن ہر انگریز کے اعمالنامے پر صرف یہی لفظ ہوں گے ۔

"اس شخص کو فرصت نہ تھی"

بشیر! تم سے یہاں لاکھوں ہیں یعنی نہ ناچیں نہ گائیں نہ شراب نہ سیگرٹ مگر ان بے نصیبوں کو بھی فرصت نہیں ۔ مرد تو مرد عورتیں بھی ایسی ہیں جو شراب اور سیگرٹ کے لئے دل نہیں رکھتیں عجیب دنیا ہے ۔ ہر شخص کسی نہ کسی طرح مفید ہے ! یہ زندگی ہندوستانیوں کے لئے جنہیں صرف مضر ہونے کی عادت ہے کس قدر بھاری ہے ؛ میرا یہ یقین کہ ایشیائی طبائع ضرور نظام عالم کی صحت کے منافی ہیں اور پکّا ہو گیا ہے ۔ اگر ایشیائی طرز خیال کائنات کے لئے مضر نہ ہوتا تو خدا کبھی یہ حکم نہ دیتا کہ یہ نہ مانو اور یہ نہ کھاؤ ۔ اب ختم کرتا ہوں ۔ LOVE

2/11/30

عزیز

"کتابیں سب غلط ہیں، انسان سب صحیح ہیں"

انسان سچا اس لئے ہے کہ وہ اپنے جذبۂ پرستش کو چھپاتا نہیں۔ اعتراض جو کچھ بھی ہوتے ہیں (اور شروع تاریخ سے ہوتے چلے آتے ہیں) اس کے معبودوں پر ہوتے ہیں اس کی عبودیت سے کبھی کسی نے انکار نہیں کیا۔ پھول ہوں کہ ہونٹ ہوں، کہ شعر ہو کہ شعر سے بھی زیادہ دلفریب تبسم کوئی تارا ہو کہ کوئی تارا سی آنکھیں ہوں۔ چاند سورج ہو کہ چاند سورج سا کوئی مکھڑا ہو، انسان سر جھکا دیتا ہے، آنکھیں بچھا دیتا ہے۔ اُسے پوجنا فرض ہے اور اس سے سروکار نہیں کہ بت ہے کہ خدا کہ پیر ہے یا پیر کی قبر ہے۔ کتابیں غلط اس لئے ہیں کہ وہ جذبۂ پرستش کے دریا کو کوزے میں بند کرنے کا دعوےٰ کرتی ہیں۔ ایک کہتی ہے کہ "خدا ہے اور باقی سب فنا!" حالانکہ یہ صاف ظاہر ہے کہ اگر انسانی جذبۂ پرستش نہ ہو تو خدا کو ڈھونڈے کون؛ دوسری کہتی ہے کہ شباب ہے اور باقی سب گناہ!!"۔ اگر شباب کو پرستارانہ نگاہوں سے گلے لگانے کی جبلی عادت نہ ہو تو رندِ مشربی ٹکے سیر نہ بکے۔ کتابوں میں کچھ لکھا ہوتا ہے۔ بعض دفعہ بہت کچھ لکھا ہوتا ہے مگر جو کچھ بھی ہو، جہاں بھی ہو، جتنا بھی ہو، باریک ہوتا ہے، تاریک ہوتا ہے۔ بدترین کتابیں وہ ہیں جن میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ غریب کے ذمہ امیر کا قرض ہے۔ بہترین غالباً وہ ہیں جن میں انسان کے ذمہ خدا کا قرض درج ہو اگرچہ بعض ایسے کم فہم بھی ہیں جو یہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ "خدا اور سا ہوکار؛ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن خدا نے جب انسان کو تصنیف کیا تو صرف ایک ہی حکم دیا یعنی یہ کہ جو جی چاہے کرو مگر مجھ سے نہ پھرو!" ایک نیا گروہ ہے جو کہتا ہے کہ کتابیں سانپ ہیں، انسان تریاق ہے مگر انسان کی تعریف کرتے کرتے ایک کتاب اور لکھ دیتے ہیں۔ انصاف یہ ہے کہ کتاب اور انسان میں ایک فرق بیّن ہے۔ کتاب کو پھاڑو تو پھٹ جاتی ہے، جلاؤ تو جل جاتی ہے، نکتہ چینی کرو تو بے بنیاد بھی ثابت ہو جاتی ہے۔

اس کے برعکس انسان کو جتنا چھیڑو، جس قدر ستاؤ، جہاں تک مٹاؤ اُور بڑھتا ہے۔ انسان کو اس کا جذبۂ پرستش مرنے نہیں دیتا۔ کتاب چونکہ جذبۂ پرستش کو لفظی شکنجے میں کھینچتی ہے کبھی زندہ رہ نہیں سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کا سب سے عظیم الشان کام یہ ہے کہ وہ اپنی کتابیں بدلتا رہے۔

بڑے انسان وہ ہیں جو ایسی کتابیں چھوڑ جائیں جنہیں واضح کرنے کے لئے سینکڑوں اور کتابیں لکھی جائیں جن کے معنی اتنے وسیع ہوں کہ مشرق مغرب سب سما جائیں اور جن کی محبت میں گرفتار ہو کر لوگ کٹ کٹ مریں۔ بڑی کتابوں کا نشہ خوفناک طور پر سخت ہوتا ہے۔ ماننے والے متبرک نام لے لے کر چھریاں تیز کرتے ہیں اور گلے کاٹتے ہیں اور رام رام کرتے ہوئے زندہ کا خون چوس لیتے ہیں +

چھوٹے آدمی وہ ہیں جن کی بات مختصر ہو اور اُس کے معنی ایک ہی ہوں، جو چھوٹا قصہ سنیں، اور باور کر لیں۔ چھوٹے آدمی غریب بھی ہوتے ہیں اور کمزور بھی۔ اوس کی اُس ننھی سی بوند کی طرح جو ذرا سی گرمی سے ہوا ہو جائے۔

(۲)

غریب جہاں کہیں بھی ہے اولاد کے جال میں گرفتار ہے۔ گرمی کی کڑکتی دُھوپ میں ہل چلائے یا دیواریں چُنے یا انجنوں میں کوئلے جھونکے یا سردی میں ٹھٹھرے اور کھیتوں کو پانی دے نتیجہ ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے اور وہ یہ کہ امیر آدمی عیش کریں اور یہ باوجود سخت محنت اور تکلیف کے گھر کو ترسے، در کو ترسے۔ پانی ہو تو روٹی نہیں ہوتی اور جو بچوں کے لئے پیٹ بھر کر روٹی میسر ہو جائے تو کپڑا نظر نہیں آتا۔

جب اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کے بنائے ہوئے گھر میں کوئی اور رہتا ہے اور یہ آسمان کو اپنے اوپر تان کر سوتا ہے، جب اُس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کے بوئے ہوئے گیہوں

امیروں کی دکانوں میں نفع کے لئے جمع ہوتے ہیں اور یہ باجرے کو ترستا ہے ۔ جب اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کی اگائی ہوئی کپاس اس کی ننگی پیٹھ کو ململی دستار پوش سروں کے سامنے جھکاتی ہے تو غریب کی قسمت ایک بڑی کتاب کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور قسمت میں اور غریب میں یہ مکالمہ ہوتا ہے :-

(۳)

قسمت ۔ تُو نے صدقہ نہیں دیا اِس لئے تیرے بچے بیمار ہیں !

غریب ۔ حضور میرا قصور

قسمت ۔ تُو نے نیاز نہیں دی اس لئے تو تنگ دست ہے !

غریب ۔ حضور میرا قصور

قسمت ۔ تُو عبادت سے غافل ہے اور قبر میں تجھ سے کوئی جواب بن نہ پڑے گا ! یہاں تو نامراد ہے ہی آگے بھی تیرے لئے شاید ہی کچھ ہو !

غریب ۔ حضور میرا قصور

قسمت ۔ تُو اپنے مذہب کے لئے ایثار کے لئے تیار نہیں ۔

غریب ۔ حضور میرا قصور

قسمت ۔ تُو جاہل ہے ۔

غریب ۔ حضور میرا قصور

قسمت ۔ تُو اپنے وطن کے لئے جان اور عزت دونوں کیوں پیش نہیں کرتا ؟

غریب ۔ حضور میرا قصور

قسمت ۔ تیرے سب عذر غلط ۔ تو کاہل ہے ، تو نافرمان ہے ، تو ذلیل ہے ۔

غریب ۔ حضور میرا قصور

(۴)

غریب رات کو ایسی بُری طرح سوتا ہے کہ قسمت ہر روز اس سے یہ مکالمہ کرتی ہے اور ہر صبح اُسے گزرے ہوئے دن کی ملامت بھول جاتی ہے ۔ غریب کی یہ غفلت حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو اُسے بیدار کرنے کے لئے وہی اُس کی پُرانی قسمت وبا، قحط اور زلزلہ سے اس کی خبر لیتی ہے ۔ غریب "حضور میرا قصور" کہہ کر اس تازیانے کو بھی بھول جاتا ہے ۔ جو چیزیں اسے نہیں بھولتیں وہ صرف دو ہیں ۔ ایک محنت کرنا اور دوسرے دُکھ سہنا ۔ قسمت صدیوں سے اس طرح گرجتی چلی آئی ہے اور ہزاروں آنے والی صدیاں اسی طرح عبث ڈرایا کرے گی مگر غریب نہ بدلے گا ۔ سخت جان غریب کیوں قسمت کا اس طرح مقابلہ کرتا ہے؛

(۵)

وہ ساحرہ جس کا نام زندگی ہے ایک چھوٹے سے غریب آدمی سے کہہ دیتی ہے کہ تم کوئی سیدھا سا قصہ لکھ دو ۔ ایسا قصہ جسے امیر نہ پڑھ سکیں اور غریب نہ بھولیں ۔ چھوٹا آدمی تعمیل ارشاد میں چند اُلٹے سیدھے لفظ یوں جوڑ دیتا ہے :۔

بادشاہ دربار میں بیٹھا تھا کہ دو فریادی شور کرتے ہوئے آئے ۔ ایک فریادی اسی شہر کا مشہور رئیس تھا ۔ وہ کہتا تھا کہ بادشاہ سلامت اس آدمی نے میری چوری کی ہے ۔ دوسرا فریادی ایک بیکس پردیسی تھا جو روتا اور چلّاتا تھا کہ چوری کی تہمت بالکل جھوٹ ہے بلکہ اس امیر آدمی نے کام کرایا ہے اور اُجرت نہیں دی ۔

بادشاہ نے جب گواہ مانگے تو دونوں نے عرض کیا کہ " بادشاہ سلامت ! ہمارا گواہ کوئی نہیں "۔ اس پر بادشاہ نے بہت خفا ہو کر حکم دیا کہ غلام ان دونوں فریادیوں کو دھکے دے کر نکال دیں مگر جب

ان دونوں نے بہت شور کیا کہ ہمارا انصاف نہیں ہوا تو شاہزادی نے بادشاہ سے درخواست کی کہ آپ مقدمہ سننے کی اجازت دی جائے۔ بادشاہ کو چونکہ اپنی شاہزادی سے بے انتہا محبت تھی درخواست ماننی ہی پڑی اور پیار سے کہا" بیٹا جب اس مقدمہ کا فیصلہ کرو تو ہمیں بھی اطلاع دینا" شاہزادی نے آداب بجا لاکر عرض کیا کہ حضور اس مقدمے کا فیصلہ کل ہی ہو جائے گا۔ یہ سُن کر بادشاہ سلامت تو اپنے دربار کے کام میں لگ گئے اور شہزادی نے اپنے وزیر کو طلب کر کے حکم دیا کہ شہر کے کوتوال کو بلواؤ اور دونوں فریادیوں کو ہمارے روبرو پیش کرو۔ وزیر نے فوراً کوتوال کو بلوایا اور دونوں فریادیوں کو شاہزادی کے حضور میں پیش کیا۔ شاہزادی نے وزیر اور مصاحبوں کو رخصت کر کے حکم دیا کہ سوائے کوتوال کے اور کوئی متنفس عدالت میں نہ رہے جب اس حکم کی تعمیل ہو گئی تو شہزادی اس غریب پردیسی سے یوں مخاطب ہوئی۔

شاہزادی۔ بڈھے پردیسی! تیرے مقدمہ کا کل فیصلہ ہوگا مگر آج رات میں تیری بیٹی ہوں اور تُو میرا باپ ہے۔ مجھے اپنے ساتھ لے چل۔

پردیسی۔ ملکۂ عالم! مجھ غریب کے پاس نہ گھر، نہ پیسہ، نہ روٹی۔ میں آپ کو کہاں لے جاؤں؟

شاہزادی۔ اگر تیرے پاس گھر نہیں تو میں یونہی بازاروں میں یا باہر جنگل میں تیرے پاس رہوں گی، روٹی نہیں تو اگر تُو بھوکا رہے گا تو میں بھی بھوکی رہوں گی۔ جو تیری بیٹی کی قسمت میں ہوگا وہ مجھے ملے گا۔ تجھ پر میرا کوئی گلہ نہ ہوگا۔

پردیسی۔ ملکۂ عالم! اگرچہ مجھ پر سخت ظلم ہوا ہے مگر آپ کو تکلیف نہ دینے کی خاطر میں اپنا مقدمہ چھوڑتا ہوں۔ اس تمام ظلم کی تکلیف سے اگرچہ وہ بھی بہت ہی زیادہ ہے، مجھے آپ کو دربدر پھرانے کی تکلیف زیادہ ہوگی۔

شاہزادی۔ تم مقدمہ چھوڑتے ہو تو تمہاری مرضی مگر ہمارا ارادہ پکا ہے کہ ہم آج رات تمہاری خدمت

بیٹیوں کی طرح کریں اور اس ارادے میں ہم ہرگز تامل نہ کریں گے۔ کوتوال شہر کو ہمارا قطعی حکم ہے کہ اس بات کی کسی کو خبر نہ ہو اور ہم اب بھیس بدل کر تمہارے ساتھ چلنے کو تیار رہیں۔

جب دوسرے فریادی نے شہزادی کا یہ حکم سُنا تو وہ شہزادی کے پاؤں پر گرا اور اُس نے عرض کی کہ جان کی امان ہو تو تمام واقعہ بلاکم وبیش عرض کردوں۔ پھر جو حضور کا مزاج چاہے حکم دیں۔ شاہزادی بولیں کہ اچھا تم اپنا قصّہ کہو۔ امیر نے عرض کیا کہ حضور میری ایک ہی بیٹی ہے جو ہر طرح عقل میں شکل میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ میں سفر میں اس کو ہمراہ لے گیا اور اس آدمی کے ملک میں پہنچا۔ وہاں اس نے اور اس کے لڑکے نے ہماری نوکری کی۔ اور ہم ان دونوں کو ساتھ لے آئے۔ وہ لڑکا اگرچہ غریب ہے مگر اس قدر شریف ہے کہ میری بیٹی کے دل میں اس کی محبت ہوگئی ہے اور میں بھی سچے دل سے خوش ہوں کہ یہ عقد ہو جائے مگر یہ شخص نہیں مانتا۔ آخر میں اسے دربار میں چوری کے الزام پر گھسیٹ لایا۔ اس کا عذر ٹھیک ہے کہ میں نے اس کی اُجرت ادا نہیں کی۔ اس کا بیٹا ایسا سعادت مند ہے کہ باپ کی اجازت کے بغیر وہ نکاح کرنا پسند نہیں کرتا۔ دوسرا عذر اس کا یہ ہے کہ وہ شادی تب کرے گا جب وہ کافی دولت کمالے گا۔

شاہزادی۔ اس وقت کا علاج آسان ہے۔ (غریب پردیسی کو مخاطب کرکے) یہ لو ایک ہزار دینار۔ اس سے تم بیٹے کی شادی رچاؤ اور کل ہم سوچ کر اس کو دربار میں اس کی لیاقت کے مطابق نوکری دے دیں گے۔ جب وہ ایک ہزار دینار بچالے گا تو وہ ہم کو ادا کردے۔ شاہزادی کے اس انصاف سے دونوں فریادی خوشی خوشی رخصت ہوئے۔

غریب آدمی اس کہانی کو اصلی کہانی نہیں سمجھتا۔ وہ اس کے معنی دل ہی دل میں اپنی جہالت کے باعث کچھ اور بنا لیتا ہے۔ غریب کے دل ہی دل میں خیال یہ رہتا ہے کہ گو اس تمام دُنیا جہان کا بادشاہ

خنگی میں آ کر فریاد نہیں سنتا مگر کہیں نہ کہیں اُس کی شہزادی ضرور ہے اور وہ ضرور غریب کو محبت سے اپنا قبلہ و کعبہ بنا کر اُس کی تمام حاجت روائی کر دے گی۔ یہ اُس ساحرہ کا کام ہے جسے زندگی کہتے ہیں بڑی کتابیں رکھی کی رکھی رہ جاتی ہیں۔ وہ کسی چھوٹے سے آدمی سے چھوٹا قصہ ایسا لکھواتی ہے کہ بڑی کتابوں کے پنڈت پادریوں کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔

(٦)

مگر اصل مطلب ابھی بیان نہیں ہوا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ بڑی کتابوں کے حملوں کا تمام زور غریبوں پر ہوتا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ زندگی کا کھیل یہ ہے کہ بڑے آدمیوں کے سنگین کاموں کو چھوٹے آدمیوں سے اُکھڑواتی رہے۔ تاریخ تمام تر یہ ہے کہ بڑے انسانوں کے کلام کو اور کام کو چھوٹے آدمیوں نے برباد کیا اور پتھر اور بوند کی لڑائی میں ہمیشہ بوند کو فتح رہی۔

مگر اصل راز جو اس کی تہ میں ہے وہ یہ ہے۔ بڑے انسانوں کو قدرتی طور پر صرف اپنے آپ سے محبت ہوتی ہے مگر چھوٹے آدمیوں کو اس کے برعکس اپنی جماعت سے محبت ہوتی ہے۔ چھوٹے آدمی کا دلی خیال یہ ہوتا ہے کہ جو اس قدر محنت کرے اُس کا حق ہے کہ وہ بوسیدہ اوہام سے دل بہلا لے۔ راستی اور صداقت دو بھوت ہیں اور اُن کی اَن تھک تلاش صرف بے کاروں کا عیش ہے جو آدمی اَوروں کے لئے گیہوں پیدا کرتا ہے اور گھر بناتا ہے کیا فرض ہے کہ نظام عالم کی نسبت بھی وہ اپنا نظریہ ٹھیک قائم کرے۔ غریب کے لئے دنیا بیل کے سینگ پر استادہ ہو کہ اَن دیکھی زنجیروں سے سورج کے ساتھ جکڑی ہو ایک ہی بات ہے۔ محنت کرنے والی جماعت کو اس قدر فرصت کہاں کہ وہ تلاش حق کی تضیع اوقات سے نہ بچ سکے۔

(۷)

شاہزادی۔ بادشاہ سلامت! آپ غریبوں کی فریاد کیوں نہیں سنتے؟

بادشاہ ۔ بیٹا، تم اس معاملے میں دخل نہ دو۔

شاہزادی ۔ (لاڈ سے) بادشاہ سلامت! مجھے غریب کیوں اچھے لگتے ہیں؟

بادشاہ ۔ کیونکہ تمہارے نزدیک وہ اچھے ہیں۔

شاہزادی ۔ کوئی بات اور بھی تو ہوگی؟

بادشاہ ۔ ہے اور ضرور ہے۔

شاہزادی ۔ ضرور مجھے بتا دیجئے۔

بادشاہ ۔ غریب ہیں دغا نہیں۔ جو اسے کھو مان لیتا ہے۔ غریب ہیں بخل نہیں۔ پیار سے جو کچھ اُس سے مانگو دے دیتا ہے۔ روپیہ، غلہ، کپڑا، اعتقاد جو کچھ غریب سے مانگو وہ بلا عذر پیش کر دیتا ہے ایسے فراخ دل کو کون اچھا نہ کہے؟

شاہزادی ۔ پھر بھی آپ اس کی فریاد نہیں سنتے؟

بادشاہ ۔ انسانی دُنیا میں سب سے بڑے ڈاکو کا نام قابلیت ہے۔ کیا تم پسند کروگی کہ بھولے بھالے غریب کو قابلیت کا شکار ہونے سے بچالوں اور خود اسے ڈاکو بنادوں؟

شاہزادی ۔ نہیں مگر شکار کیوں ہو؟ شکاری کیوں ہو؟ امن چین، اور باہمی امداد کیوں نہ ہو؟

بادشاہ ۔ کیا جتنے ظلم ہوتے ہیں وہ باہمی امداد کے عذر پر نہیں ہوتے؟

(۸)

امیر ۔ میری بیٹی کی شادی تو تمہارے بیٹے سے ہو جائے گی مگر کیا ہی اچھا ہوتا کہ تم ہمارے کہنے سے ہی اجازت دے دیتے!

غریب ۔ ہر شخص کا نقطۂ خیال الگ ہے۔ آپ کی بیٹی جو اب میری بہو بننے کی سمجھتی ہے کہ محبت ہے تو سب کچھ ہے اور محبت کا فرمان قطعی ہے اور اسے روکنا غلط ہے۔ محبت ہی اس لڑکی کا خدا ہے

وہ چاہتی ہے کہ جو محبت چاہے وہ ہوتا جائے۔ اس کے برعکس تم اختیار اور زور سے کام لینا چاہتے ہو۔ تم قانون کے بندے ہو اور قانون ہی تمہارا خدا ہے۔ مجھے محبت اور قانون دونوں سے کچھ سروکار نہیں۔ بظاہر تمہیں یہ معلوم ہوتا ہوگا کہ میں عجیب احمق ہوں کہ اپنے بیٹے کے لائق حسین اور مال دار بیوی خوشی سے اور جلدی سے نہیں لے لیتا۔ تم دل میں خیال کرتے ہوگے کہ دنیا ہی اُلٹی ہوگئی ہے کہ امیر جھکتا ہے مگر غریب اکڑتا ہے۔ دراصل یہ بات نہیں۔ میرا انکار اس لئے تھا کہ میں تائید غیبی کے اشارے کی تلاش میں تھا۔ زندگی میں محبت ہو کہ نہ ہو انصاف ہو کہ نہ ہو کچھ پروا نہیں مگر کبھی نہ کبھی انسان پر یہ حقیقت واضح ہونی چاہئے کہ تائید غیبی ایک اصلی اور حقیقی شئے ہے۔ انسان کی تکمیل یہی ہے کہ وہ نامکمل رہے۔ جو خود بخود چل نکلا وہ خاک نہ چلا۔ بہتر یہ ہے کہ اس آرزو میں کہ کبھی نہ کبھی کوئی ہاتھ پکڑ ہی لیگا انسان بھٹکتا پھرے۔ مجھے تمہارے نام کا علم ہے۔ تم قانون ہو، سائنس ہو۔ تمہیں میرا نام معلوم نہیں۔ میں مذہب نہیں ہوں مذہب کی آرزو ہوں۔

(۹)

آج کل اس قسم کے قصے کام نہیں آتے۔ پڑھے لکھے دماغ اپنے آپ کو بڑی کتابوں سے یا پیاری پیاری چھوٹی کہانیوں سے آلودہ ہی نہیں ہونے دیتے۔ دنیا کی رہنما صرف ایک چیز ہے۔ مزدور جماعت پر جیب جس میں زبردست ہاتھ اپنے آپ کو گرم رکھتے ہیں۔ انسان کی قسمت کی تازہ ترین ترجمانی واقعی یہی ہے کہ قبر صفر ہے اور بنک خدائی مرکز۔ مگر مجھ ازلی باغی کو یہ تفسیر بھی نہیں بھاتی۔ میں چاہتا ہوں کہ چھوٹے آدمیوں کے لئے کوئی چھوٹی سی کتاب ہو جس سے بڑی دُنیا اور بڑی کتابیں سب دب جائیں اور وہ یوں شروع ہو۔

تعمیلِ ارشاد میں

کیا تم نے یہ نہ کہا تھا کہ اوروں کے لئے نہ لکھئے ہمارے لئے نہ لکھئے۔ میرے آسمان میں ایک ہی تارا ہے۔ میری سخت اور خاموش تنہائی میں ایک ہی لے ہے۔ تم ہو، تمہارا نام ہے۔ اس روشنی میں، اس راگ سے مخمور ہوں۔ اس نشہ میں ہر قسم کی ذمہ داری سے آزاد ہوں۔ تمہارے اور میرے درمیان وہ فاصلہ جو لفظوں سے پیدا ہوتا ہے کم ہو رہا ہے۔

(۱۰)

اور یوں بھی ہو کہ یہ چھوٹی سی کتاب شروع ہو مگر ختم کبھی نہ ہو۔ ہر ایک اسے خود اپنے لئے لکھتا ہی چلا جائے۔ چھوٹی کتابوں کی اس بڑی بارانِ رحمت سے شاید بڑی کتابوں کا پیدا کردہ دشتِ زہر لہلہا اُٹھے۔ پھر تو شاید غریب بھی جینے لگیں۔

مگر یہ ہو یا نہ ہو چھوٹے آدمیوں کی غلطیوں پر بڑی کتابوں کی ہزار صحت قربان ہے۔

فلک پیما کے خطوط

مینتوا

۲۹ستمبر ۔ ۷بجے شام

اِس وقت لاہور میں ساڑھے آٹھ بجے ہوں گے کیونکہ تین دن سے برابر گھڑی دوپہر کے وقت تیس منٹ پیچھے کردی جاتی ہے۔ پرسوں بمبئی سے چلتے وقت سمندر سے خالف دل ودماغ عجیب قسم کے تلاطم میں مبتلا تھے۔ ہر وقت یہی سوچتے تھے کہ اوپر خدا نیچے پانی دیکھئے قسمت کیا گُل کھلاتی ہے۔ مگر اس تلاطم کو سمندر نے ایک خوبصورت تبسم سے موہ لیا۔ دلوں میں ہل چل تھی پانی میں سکون تھا۔ آج صبح جو اُٹھے تو یوں معلوم ہُوا کہ گویا ہزاروں فرشتوں نے رات ہی رات میں سمندر کو استری کردیا ہے۔ خُدا جانے کیا طلسم ہُوا کہ سمندر جو بے انتہا بوڑھا ہے اور جس کے چہرے پر ضعفِ پیری سے لاکھوں کروڑوں جھرّیاں ہیں رات ہی رات میں ایک نکھرا ہُوا ساتالاب بن گیا۔ فرشتوں کو شباب تازہ کرنے کا کوئی لاجواب لٹکا آتا ہے۔ جو فرشتے سمندر کو کسی فلم سٹار کی طرح خندہاں شاداں کرسکتے ہیں کیا وہ میرے دل کی حسرتوں کو مسرتوں سے نہ بدلیں گے؟ ضرور بدلیں گے! یہ ایشیائی دماغ چند دن تک یورپ کی سرزمین میں پہنچ کر ضرور، ضرور . . . .

بدل دے اَور دل اس دل کے بدلے
الٰہی تُو تو ربّ العالمیں ہے

مگر اس وقت سوال میری ہستی کا نہیں۔ میں کس گنتی میں ہوں؟ آج صبح چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو ان

آنکھوں سے اُڑتے دیکھا پانی کے جس حصے سے جست کرکے یہ طائر مچھلیاں پرواز کرتیں وہاں پانی پر ایسا خوبصورت سا جال بن جاتا کہ بیان سے باہر ہے۔ گویا پانی اپنی روح کو سطحِ آب پر رکھ کر ان سے یہ کہتا تھا کہ جانِ من کہاں جاتی ہو؟ مجھے چھوڑتی ہو کیا غضب کرتی ہو؟۔ اور یہ مقناطیسی جال پھر گویا ہر ماہیِ بے آب کو کھینچ لیتا۔ مگر ماہیِ بے آب کی ترکیب کس قدر بھدی ہے جن مچھلیوں کے لئے ہوا اور پانی ایک ہوں جن کی زندگی محض رقص ہو اُنہیں ماہیِ بے آب کی بوسیدہ تشبیہ سے یاد کرنا حقیقت کا خون کرنا ہے۔ کاش ایشیا سمندر کے تلے ہوتا! پھر تو شاید اس میں کہیں نہ کہیں کوئی شاداں خنداں رقصاں ہستی ہوتی!! ایک موقع پر حضرت اقبال نے مجھے عُرفی کا یہ شعر سُنایا تھا۔

عرفی کا شعر اور اقبال کی زبانی!

چناں رقصید عرفی بر درِ بُت خانہ کز حسرت
برہمن گفت ایں کافر چہ اُستادانہ می رقصد

اے طائر مچھلیو! یہ تم نہیں ہو میرا کافر دل ہے جو برہمنِ ازل کے سامنے رقصاں ہے۔ خود خدا کو مجھ پر رشک ہے۔ وہ ذمہ دارِ ازلی ہے۔ مجھ غیر ذمہ دار سے اُسے کیوں محبت نہ ہو؟ وہ اپنی ذمہ داری سے اُکتا یا ہو کہ نہ اُکتایا ہو میری غیر ذمہ دارہستی اُس کے لئے کس قدر مرغوب ہے!

اے میرے خدا! جس حد تک میں مستِ حسن ہوں۔ یعنی جس حد تک میں غیر ذمہ دار ہوں اسی حد تک میں تمہارا ہوں۔ میں وہ مچھلی ہوں جو اُڑ کر غرق ہو اور غرق ہو کر اُڑے۔

عزقابِ ازل

یکم اکتوبر ٹھیک آٹھ بجے شام (عدن کا وقت)

لاہوری لوگ (اگر ہوا ٹھنڈی ہوئی) تو شکر کرتے ہوں گے کہ بس اب گرمی گئی۔ اُنہیں کیا پتہ کہ

دنیا میں عدن بھی ہے جہاں سے نہ گرمی جاتی ہے نہ خباثت!۔ چونکہ بندرگاہ ہے اس لئے اخلاق میں بھی ایک قسم کا بوزنہ پن ہے۔ جسے دیکھو اسی فکر میں ہے کہ کچھ نوچ لے کچھ چھین لے۔ یہاں کسی زمانہ میں آتش فشاں پہاڑ تھا جب اس نے آگ برسانی ختم کی تو چند عمیق سے گڑھے رہ گئے۔ خدا کی شان کہ جن گڑھوں سے کبھی آگ برستی تھی اب وہ پانی جمع کرنے کے کام آتے ہیں!۔

انسان بھی کیا بلا ہے؛۔ فطرت بلبل ہے انسان گل ہے۔

بلبل کے کار دبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

ان پانی کے تالابوں سے گویا انسان ہنس ہنس کر فطرت سے یہ کہہ رہا ہے کہ جس جگہ سے تم آتش فشانی کرتی تھیں میں وہاں باران رحمت کو سمیٹ کر رکھتا ہوں، باغ لگاتا ہوں پھول اُگاتا ہوں۔

ہم پانچوں میں سے کم سن بے باکی نے ایک سُرخ بھبوکا سا پھول اس باغ سے چُنا اور اپنے سیاہ بالوں کی تاریک رات میں ایک گلابی سی قندیل لٹکالی۔

یہ پھول اسی سرزمین میں اُگا تھا جہاں سے کبھی آتش فشانی ہوتی تھی۔ حق بہ حقدار رسید۔ کیونکہ یہ کم سن شوخی بجائے خود صرف آتش فشاں نہیں بلکہ برق طپاں ہے۔ جو آگ اس پہاڑ سے بچ رہی تھی وہ ایک گلنار زریں رخسار کی نذر ہوئی۔ عدن کی ہستی گویا کام آگئی۔ اب میرے خیال میں عدن میں نہ گرمی ہے نہ خباثت۔ یہ البتہ ضرور ہے کہ عدن میں چاند اور زہرہ پھر کبھی چار شاعر آنکھوں کے لئے نہ چمکیں گے۔

فلک پیما

---

۹ راکتوبر ساڑھے سات بجے شام

جو لوگ مارسیلز میں اُترنے والے ہیں اُن کے لئے یہ جہاز کی آخری رات ہے۔ اس کمرے

سے باہر سمندر کے ساتھ چاند اٹکھیلیاں کر رہا ہے اور کیوں نہ کرے ؛ چودھویں کا چاند ہے۔ باہر اصلی چاند اور اصلی سمندر اور اس کمرے میں تصویر ہے جس کے نیچے یہ لفظ منقوش ہیں :-

The moon enchants the watery world below

اصل بہتر ہے کہ نقل ؛ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کی ساختہ تصویر کو ترجیح دی جائے۔ ایک ماہ جبیں البیلے پن سے چاند کو دیکھ رہی ہے۔ چاند کی کرنیں سمندر کی لہروں سے ہم آغوش ہیں۔ مصور نے بادلوں کو بھی ایک طرف آراستہ کیا ہے۔ پہاڑیاں بھی ہیں۔ پہاڑیوں کی لالہ زاریاں بھی ہیں۔ اسے دیکھوں کہ باہر چاند کو ؟ موقع ملتا ہے تو دونوں کو دیکھ لیتا ہوں۔ اور پھر اسی میز پر آ بیٹھتا ہوں۔ ابھی ایک آدھ گھنٹے میں جہاز جزیرۂ کارسیکا کے جنوب سے گزرے گا۔ وہی کارسیکا جسے نپولین کو جنم دینے کا فخر حاصل ہوا۔

میرے خیالات کہاں جا رہے ہیں ؛ کہاں چاند کہاں وہ مریخ کا چاہیتا سپوت نپولین ؛ میں جو ہندوستان کی قسمت کے فیصلے میں کچھ خفیف سا حصہ لینے جا رہا ہوں مجھے نپولین کے جنم بھوم سے کیا دلچسپی ؛

ہندوستان ! ہندوستان !! کیا یہ کسی ملک کا نام ہے ؛ کہاں سنا تھا ؛ کب سنا تھا ؛ آج کل وہاں کون لوگ آباد ہیں ؛ کیا وہی لوگ اب بھی برسر اقتدار ہیں جن کی انتہائی خواہش یہ ہے کہ ملک دوزخ جائے کہ بہشت اُن کے حلوے مانڈے میں فرق نہ آنے پائے ؛ کیا وہ پنڈتوں اور مولاناؤں کا دنگل اپنی پہلی سی آب و تاب میں ہے یا اب وہاں یہ دھن ہے کہ مسجدوں مندروں کو سکولوں سے بدل دو ؛ میرے دائیں بائیں ہنسی مذاق چہل پہل کی صدائیں ہیں۔ اس موسیقی کمرے میں ایک کا فرادا کی خوشی کے لئے راگ بھی چل رہا ہے مگر میرا دل ہے کہ بار بار ان میلے کچیلے گلی کوچوں میں اُلجھتا ہے جہاں گاندھی ٹوپی والے سیدھی سی بات کو الٹی طرح بیان کرتے ہیں۔ ہندوستان کی ترقی نہیں چاہتے۔ انگلستان

کے تنزل کے درپے ہیں۔ کسی کی بُرائی سے ہمارا کیا بھلا ہوگا؟

اے چاند! اے سمندر!! اے کارسیکا کے زندۂ جاوید نپولین اعظم!!! کیا وہ ملک جس کی خدمت کی آرزو میرے دل کو Stromboli کی طرح آتش فشاں بنا رہی ہے کبھی چمکے گا؟ ہاں ضرور چمکے گا صرف پنڈتوں اور مولاناؤں کے سدھارنے کی دیر ہے۔

جس طرح یہ جہاز چل رہا ہے اور منزلِ مقصود کو لپک لپک کر اپنی طرف کھینچ رہا ہے جس طرح باوجود اس کی تیز رفتاری کے اس میں راگ بھی ہے، رقص بھی ہے اور کام بھی، جس طرح اس کے انجن کمرے میں آگ ہے اور اس کے کھانے کے کمرے میں قہقہے، اسی طرح کاش کہ ہندوستان کی تمام کوششیں مختلف مگر متفقہ طریق سے اپنی رنگینی ظاہر کریں۔ جو یہ نہ ہوا تو یہ چاند اور سمندر میرے کس کام؟

کرسیاں ایک دوسرے کی طرف کھنچی جا رہی ہیں۔ پوچھا جا رہا ہے کہ تم کیا پیو گے۔ ان سب کو کیا معلوم کہ ان سے ایک گز کے فاصلہ پر ایک دل ہے جو یہاں سے چار ہزار میل مشرق کے لئے تڑپ رہا ہے۔

مشینوں کی مَوت

ایک دو روز پہلے خفیف سا چرچا تھا کہ سارے ہندوستان میں بجلی کے کارخانے خراب ہو رہے ہیں برقی طاقت پوری طرح کام نہیں کرتی۔ آخر جمعہ کو یہ بات اخباروں میں بھی چھپ گئی کہ ملک بھر میں کوئی نرالا برقی تلاطم ہے کہ برقی رَو پیدا ہوتی ہے مگر کام نہیں کرتی۔ ہفتہ کے دن کسی شخص کو کوئی تار کہیں سے نہ آیا۔ سرکاری بے تار کے برقی پیغام البتہ موصول ہو رہے تھے مگر ان کا راز کسی پر نہ کھلا۔ اسی دن بہشت سے ہوائی جہاز کسی غیر معلوم مقام کی طرف روانہ ہو گئے اور ریلوں میں بہت سی انگریزی فوجیں بھی کسی طرف نکل گئیں۔

اتوار کو لوگوں نے کچھ خیال نہ کیا گو دِلکتہ جیسے بڑے شہر میں تاروں کا نہ آنا سخت اضطراب انگیز ضرور تھا۔ صبح پیر کو ایک بے تار برقی کا پیغام آیا کہ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ دو ایک روز تک سارے ملک کی مشینیں خراب ہو جائیں گی اور اس پیغام کو آخری پیغام سمجھنا چاہیئے۔ دِلکتے میں پیر کا دن عجب شورش میں گزرا جن دفاتر دکانوں اور کارخانوں میں انگریز افسر ہوتے تھے وہاں کوئی انگریز نہ تھا۔ کلرک، چپراسی، مزدور سب بلا کام کئے واپس آ گئے۔ اس کے بعد کی ڈائری حسب ذیل ہے:۔

پیر (پانچ بجے شام)

سارے شہر میں عجب شان دار جلسے ہوئے ہیں۔ بھارت ماتا کی از سرِ نَو تابندگی کس قدر شان دار ہے۔

سری جت مسٹر چندر داس، پنڈت چھتری بہار اشٹر، راجہ نرمل بھگت نے وہ تقریریں کیں کہ

ساری عمر میں ان لوگوں نے پبلک کے دل میں اپنی اس قدر محبت پیدا نہ کی ہو گی جو آج کی تقریروں سے کی۔ دواس صاحب نے کہا کہ پرماتما کرے کہ یہ جھوٹ کہ مشینیں بے کار ہو جائیں گی سچ ہو جائے۔ کیا سری حضور رامچندر جی موٹروں میں سوار ہوتے تھے؟ ہرگز نہیں۔ ان کی روحانی شکتی البتہ ضرور اس پایہ کی تھی کہ وہ جہاں چاہتے بغیر مشینوں کی مدد کے جا سکتے مگر انہوں نے اپنے پیارے پوتر ملک کے لئے مشینوں کا رائج ہونا پسند نہ کیا۔ جو لوگ ہندوستان اور لنکا کے درمیان پُل بنا سکتے تھے کیا اُن کے لئے ریلیں اور موٹریں ناممکن تھیں؟ ہرگز نہیں۔ ہمارے مقدس بزرگ ہمیشہ مادی ترقی کو حقارت سے دیکھتے رہے ہیں اور کیوں نہ دیکھتے؟ کہاں ہیں آج وہ مشینوں کے شیدائی اور اُن کی لاٹھی باز پولیس؟ ہمارے لئے وہ دن مبارک ہو گا کہ مشینیں بھی جائیں اور وہ بھی جائیں۔ اس تقریر پر پبلک کی طرف سے برابر پندرہ منٹ خوشی کے نعرے لگتے رہے اور تین دفعہ بندے ماترم کا گیت گایا گیا۔ اس کے بعد پنڈت چھتری صاحب کی تقریر شروع ہوئی۔ پبلک کا خیال تھا کہ دواس صاحب کی تقریر کے بعد چھتری صاحب کی تقریر کیا لطف دے گی مگر انہوں نے ایک نیا پہلو اختیار کیا۔ فرمانے لگے کہ میرا وقت، میرا دھرم بھارت ماتا کے غریب سپوتوں کی خدمت کے لئے وقف ہے۔ غریب آدمیوں کو پہلے کون سے تار آتے تھے؟ اب نہ آئیں گے تو کیا ہو گا؟ غریب آدمی پہلے کہاں موٹروں میں بیٹھتے تھے؟ ان کے گھروں کو ان سے بجلی کے لیمپ جلتے تھے؟ میں اُن کا ہوں، وہ میرے ہیں۔ ہماری بلا سے اگر بجلی کے کارخانے بند ہیں تو ہونے دو۔ بھارت ماتا میں کس چیز کا کال ہے؟ ہمارے ہاتھ زمین کھودنے کے، ہماری ننگی پیٹھیں بوجھ ڈھونے کی عادی ہیں۔ فکر وہ کریں جن کا کچھ جاتا ہو۔ بھارت ماتا کے لئے وہ دن مبارک ہے کہ غریب اور امیر میں قدرتی مساوات ہو۔ وہ مساوات جس کے لئے ہمارے رشی کوشش کرتے تھے۔ ہمارے ملک میں گوتم نے بادشاہی چھوڑ دی۔ کیا ہمارا ملک مشینیں نہیں چھوڑ سکتا؟ میری رائے یہ ہے کہ مشینیں چلیں کی نوبت چلاؤ۔ اس تقریر پر پورے دس منٹ بڑے زور شور کی واہ وا ہوئی اور تین دفعہ بھارت ماتا کا گیت

گا یا گیا۔ ان کے بعد نرمل بھگت نے تو عجیب سماں پیدا کیا۔ فرمانے لگے کہ جنگِ عظیم کے بعد سے امریکہ اور یورپ دونوں متفق تھے کہ مشینوں کی پیدا کردہ تہذیب مہلک ہے۔ مشینوں نے انسانوں کو انسان سے بدل کر بے جان پُرزے کر دیا تھا۔ موچی بڑھئی لہار کو جو اپنے ہُنر کا لطف پہلے تھا وہ مشینوں نے مفقود کر دیا۔ مشینوں نے ٹھیکے دار پیدا کئے مگر ہنرمند دستکار پیدا نہ کئے۔ یہ پرماتما کی خاص رحمت ہے کہ اب ہر شخص کو اپنے کام میں طبعی جدت کے اظہار کا موقع ملے گا۔

ان تقریروں کے ختم ہونے کے بعد شہر میں جا بجا چھوٹے جلسے ہوئے اور اس شام تک کلکتہ اس قدر خوش تھا کہ انسانی تاریخ میں شاید ہی کبھی کوئی شہر ایسا خوش ہُوا ہو۔

پیر (نو بجے رات) کوئی آدمی خبر لایا ہے کہ ریلیں سب بند ہو گئی ہیں۔ اس نئی خبر سے شہر میں تلاطم ہے۔

پیر (دس بجے رات) گھوڑے گاڑیوں کے پہیئے نہیں چلتے۔ عوام میں پریشانی زیادہ ہے۔ پولیس جان کے خوف سے کہیں چھپ گئی ہے۔

پیر (گیارہ بجے رات) ابھی ابھی مشہور ہُوا ہے کہ پستولوں میں گولیاں نہیں چلتیں۔ کئی آدمی میرے سامنے پستول دیوار پر چلا چکے ہیں۔ آواز آتی ہے مگر گولی میں زور نہیں۔ سارا شہر جاگ رہا ہے مگر کوئی شخص تقریر کرنے یا سننے کے لئے تیار نہیں۔ لوگ ڈر کے مارے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے بازاروں سے خوف آتا ہے گھر جا کر سوتا ہوں۔

منگل (صبح ۷ بجے) تمام رات دروازے بند کئے پڑا رہا مگر نیند نہ آئی۔ اب باہر نکلا ہوں تو سُنتا ہوں کہ شہر میں کہرام ہے۔ آٹا پیسنے کی مشینیں بند ہیں۔ آدھا شہر چکیوں کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

منگل (صبح ساڑھے سات بجے) چکی کا پاٹ نہیں پھرتا۔ چرخہ نہیں چلتا۔ شہر میں لوگ سخت خوف زدہ ہیں۔

منگل (نو بجے صبح)۔ آٹھ دس بنئے قتل ہو چکے ہیں۔ سب بنئے گھروں میں چھپ گئے ہیں اور روپیہ اور نوٹ انہوں نے چھپا دیئے ہیں۔ اصل بات یہ ہوئی کہ صبح ہی صبح چند ہوشیار بنئے نوٹ لے کر گھر گھر پھرے اور دس کے نوٹ کے بدلے نو نو روپے لیتے رہے۔ جب غریب آدمیوں کو یہ پتہ چلا کہ بنئے لوگ اس لئے یہ چال کھیلے ہیں کہ ٹکسال بند ہو گئی ہو گی اور روپے اب نہ بنیں گے تو وہ نوٹ واپس لے کر گئے مگر بنیوں نے روپیہ واپس دینے سے انکار کیا۔ اس پر تکرار ہوئی اور بات بڑھتے بڑھتے لڑائی اور بلوہ ہو گیا۔ اس وقت یہ بھی مشہور ہو گیا کہ گاؤں میں بھی بنیوں نے یہی کیا ہے اور وہاں بھی کاشتکار قتل مقاتلے پر اتر آئے ہیں۔

منگل (بارہ بجے دوپہر)۔ شہر میں معززین نے ایک حکومت کمیٹی قائم کی ہے۔ تمام دیاسلائیوں کے بکس اس کمیٹی کے حکم سے جمع کئے جا رہے ہیں۔ جن لوگوں کو چقماق سے آگ بنانے کا علم ہے ان کی تلاش ہو رہی ہے۔ سارے شہر میں سخت خوف ہے کہ اگر دیاسلائیاں ختم ہو گئیں تو اس دی کے موسم میں غضب ہو جائے گا۔

منگل (دو بجے بعد دوپہر)۔ آدھا شہر بھوکا ہے۔ لوگ بازاروں میں روٹی فروخت نہیں کرتے۔ اور دکانیں سب بند ہیں۔ حکومت کمیٹی نے اعلان کیا ہے کہ کل تک سب کے کھانے کا انتظام کمیٹی کی طرف سے ہو گا۔ چوبیس گھنٹے میں صرف ایک چھٹانک بھنے گیہوں اور ایک چھٹانک چنے ملیں گے۔

منگل (۴ بجے بعد دوپہر)۔ ملحقہ بڑے شہروں اور دیہات سے سخت وحشتناک خبریں آئی ہیں۔ شہر کے دروازوں پر پہرے بٹھائے گئے ہیں۔ ہر شخص لاٹھی لئے پھر رہا ہے۔

منگل (پانچ بجے شام)۔ غضب ہو گیا۔ پانی کے نل تو بند تھے ہی اب کنوؤں پر چرخیاں نہیں چلتیں۔ ڈول سے پانی کھینچنا پڑتا ہے۔ حکومت کی طرف سے اعلان ہوا کہ چوبیس گھنٹے میں ہر شخص

صرف ایک ڈول پانی نکالے۔ مختلف کنوئیں مختلف محلوں پر تقسیم کیے گئے ہیں۔ پانی پر بہت سی لڑائیاں ہو چکی ہیں۔

منگل (چھ بجے شام)۔ بازاروں میں روشنی نہیں۔ لالٹینوں میں تیل نہیں جلتا۔ بتی اونچی نہیں ہوتی۔ شہر کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ کچھ بھوکے آدمی ــــــ کے گھر میں گھس گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک پورا حصہ مکان کا غلے اور دیا سلائیوں سے بھرا ہے۔ اس پر لوگوں کو بہت غصہ آیا اور وہ سب مال نکال کر لے گئے ــــــ کو حکومت کمیٹی سے الگ کیا گیا ہے۔ ہر شخص سخت خائف ہے۔

منگل (۷ بجے شام)۔ ہسپتالوں سے تمام کمپونڈر اور ڈاکٹر بھاگ گئے۔ وہاں کھانے اور روشنی کا کچھ انتظام نہیں۔

بدھ (صبح سات بجے)۔ رات بے انتہا نقب زنی کی وارداتیں ہوئی ہیں۔ بہت سے بنک لٹے۔ بہت سے دفتر۔ کئی جوہریوں کی دکانیں۔ حکومت کمیٹی نے چند آدمیوں کو جو موقع پر پکڑے گئے تھے بازار میں اُلٹا لٹکا دیا ہے کہ لوگ خوف کے مارے چوریاں بند کر دیں۔

بدھ (نو بجے صبح)۔ سخت وحشت ناک خبریں آ رہی ہیں۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ دیہاتی لوگ شہر کو لوٹنے آ رہے ہیں۔ جہلا میں یہ مشہور ہے کہ کسی فقیر کی بد دعا سے یہ قہر نازل ہوا ہے۔ جن لوگوں نے کہا تھا کہ مشینوں کا بند ہونا بھارت ماتا کے لئے مبارک ہوگا وہ خوف کے مارے چھپ گئے۔ میرے پاس والے گھر میں بچہ رو رہا ہے کہ اماں میرا گیند نہیں لڑھکتا۔ ایک نوجوان سائنس دان کو لوگوں نے بازار میں بہت مارا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اور کچھ بھی نہیں ہوا صرف یہ ہوا ہے کہ کسی برقی تلاطم کی وجہ سے کرۂ زمین پر چکر کی حرکت بند ہو گئی ہے۔ نہ گاڑی کا پہیہ، نہ کسی مشین کا گول پرزہ، نہ گیند کوئی چیز چکر نہیں لگا سکتی۔ ابھی بیچارے نے بات بھی ختم نہ کی تھی کہ چند شہریوں نے اسے پکڑ کر کہا کہ "کمبخت کہیں کا، خدا کے کاموں میں دخل دیتا ہے۔ لا تجھے تو چکر دیں۔" یہ کہہ کر ان بدمعاشوں نے اسے

پیٹتے پیٹتے بے دم کر دیا۔

بدھ (پانچ بجے شام)۔ سارے شہر کی عورتیں اور مرد جمع ہو کر اپنے اپنے دھرم کے مطابق دُعا مانگنے گئے ہیں کہ یہ قہر دُور ہو۔

بدھ (سات بجے شام)۔ دعا کے جلسے ختم نہ ہوئے تھے کہ ایک مذہب والوں نے دوسرے مذہب والوں کی کسی طرح توہین کر دی۔ شہر میں اس وقت خانہ جنگی زور پر ہے۔ کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہیں۔

بدھ (رات دس بجے)۔ دیہاتی لوگ شہر میں آ گھُسے مگر اس سے خانہ جنگی ختم ہو گئی ہے دیہاتی لوگوں نے بازاروں میں پہرے بٹھا دیئے ہیں۔ سب اپنے اپنے گھر میں خوف سے بند بیٹھے ہیں۔ اکثر بھوکے پیاسے ہیں۔ باہر سے دُودھ جو آتا تھا وہ کل سے نہیں آیا۔ ہزاروں بچے بلبلا رہے ہیں۔ شہر کی جو چند گائیں ہیں ان کا دودھ ایک حصہ دودھ آٹھ حصے پانی ملا کر صرف ایک سال سے چھوٹے بچوں کے لئے فروخت ہو رہا ہے۔ میرے ہمسائے میں ایک ماں کی ایک ہی بچّی ہے جو بیمار رہے ہے۔ صرف ڈیڑھ سال کی ہے۔ اُسے کل سے دودھ نہیں ملا۔ وہ سخت بُری طرح رو رہی ہے۔ ماں رو رو کر دعا کر رہی ہے کہ پرماتما اس بچّی کے اچھا ہونے تک مجھے دودھ عطا کر دے۔ کہہ رہی ہے، "پرماتما! اور کچھ نہیں مانگتی، مجھے اس بچّی کی گائے بنا دے۔ اس معصوم کو بھوکا پیاسا نہ مرنے دے۔"

اتوار (بعد دوپہر)۔ جمعرات اور جمعہ اور ہفتہ کے حالات قابلِ تحریر نہیں۔ میں زندہ تھا مگر بھوکا اور پیاسا نیم پاگل تھا۔ خوف کے مارے اس سردی میں ایک پُرانے تہ خانے میں چھپا رہا۔ شہر کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔

آج صبح اس تہ خانے سے نیم جان نیم پاگل پیاس سے عاجز ہو کر باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بازار میں انگریزی فوج کھڑی ہے اور یہ منادی ہو رہی ہے کہ

(سب ٹھیک ہے۔ کوئی خوف نہ کرو)

پیر دس بجے صبح اکل بعد دوپہر پانی پیا تو بے ہوش ہوگیا۔ آج گذشتہ ہفتے کی تمام مصائب کی وجہ معلوم ہوئی۔ مریخ ستارے کے سائنس دان اس زمین سے گفتگو کرنا چاہتے تھے اور انہوں نے وہ برقی رَو اپنے وطن سے ہمارے کرۂ ارض کی طرف بھیجی جس سے ہر قسم کے چکر کی حرکت بند ہوجائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر وہ اس قسم کی برقی رو نہ بھیجتے تو وہ رَو کبھی زمین تک نہ پہنچتی اوّل تو وہ فضا میں منتشر ہوجاتی اور جو یہاں پہنچتی تو وہ زمین اور زمین کی مشینوں کی حرکت سے کافی کارآمد نہ ہوتی۔ یورپین سائنس دانوں کو چونکہ اس کا خیال تھا انہوں نے اپنی فوج اور حکومت کو مطلع کر دیا اور یہ لوگ اتنے دن اپنے جہازوں میں سمندر پر رہے۔ مریخ کی برقی رَو کا اثر سمندر پر بہت کم تھا+

زبان

زبان ! زبان !! زبان !!! ایک تو مُنہ کے اندر مزے لوٹنے اور بولنے والی سُرخ و شوخ نکیلی سی معشوقہ ہے چلبلی ہے، مُڑتی ہے، لڑکھڑاتی ہے، لپٹتی ہے، جھجکتی ہے۔ باوجود مضبوطی سے جڑے ہونے کے بعض لوگوں کی کُھل بھی جاتی ہے

ایک وہ ہے جس کی نسبت داغ مرحوم فرما گئے ؏

کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے

اُردو، فارسی، عربی، سنسکرت، یونانی، لاطینی وغیرہ وغیرہ دنیا میں سینکڑوں زبانیں ہیں۔ پیدا ہوتی ہیں، ترقی کرتی ہیں، قومی عروج و تنزل کا مرقع بنتی ہیں، انسانی فہم و فراست کے خزانوں سے مالا مال ہو کر ترجمانوں کی محتاج ہو جاتی ہیں۔

تصویر بولتی نہیں مگر تصویروں کی بھی ایک زبان ہے۔ باغوں میں بھی گلفشانیاں ہوتی رہتی ہیں اور اِس زبانِ رنگ و بُو کی شان اُس ہوائی تصادم کے تواتر سے جس پر تقریروں کی زندگی کا مدار ہے قطعی الگ ہے۔ انسانی افعال کی زبان بالکل ہی علیحدہ ہے۔ اگر ایک بھولی خورد سال لڑکی ماں سے ضد کر کے پھولوں کا ہار چھین لے تو اس میں اور کسی چوک میں پھولوں کے ہاروں کی چھین جھپٹ میں جہاں تک معنی کا تعلق ہے آسمان زمین کا فرق ہے۔

کہیں یہ نہ ہو کہ یہ ساری کی ساری کائنات اور اس کے لاکھوں کروڑوں سورج چاند اور تارے ایک عظیم الشان زبان نہ ہوں؟ اسے کون بولتا ہے، کون سنتا ہے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟ کیا یہ زبان ایک خوبصورت زبان ہے؟

الفاظ اور رنگ

میرا ایک دوست ہے جسے لفظوں سے عشق ہے۔ اگر کسی فقرے میں کسی مصرع میں اُسے الفاظ خوبصورتی سے نگینوں کی طرح جڑے ہوئے، موتیوں کی طرح پروئے ہوئے، ہیروں کی طرح چمکتے ہوئے مل جائیں اور اگر یہ فقرہ یا مصرع کسی نازک ادا مضمون کے پیارے سے گلے سے یوں لپٹا ہو جیسے بعض بلوریں گردنوں میں چندن ہار تو اُس میرے دوست کو گویا دنیا بھر کی دولت مل جاتی ہے۔ کہا کرتا ہے "تمہیں کیا معلوم، دوزخ صرف ایک ہے اور وہ ہے لفظوں کا بیہودہ استعمال۔" اور اگر میں اُسے روک نہ دوں تو اس کا یہ عشق خوب کھل کھیلتا ہے۔ ایک دن کہنے لگا کہ "اولادِ آدم لفظوں کی ریل گاڑی ہے۔ لفظوں کو سفر درپیش ہے ایک گاڑی سے اُتر کر دوسری گاڑی میں بیٹھتے ہیں۔ گاڑی سمجھتی ہے کہ مسافر میرے ہیں۔" میرے سوال پر کہ لفظ کرایہ کیا دیتے ہیں ہنس پڑا۔

میں۔ "ہنسی کی کیا بات ہے؟"

دوست۔ "حضرت! یہ سپیشل ٹرین بنتی ہی اسی لئے ہے کہ بلا کرایہ شہنشاہی نوکری کا فخر اسے حاصل ہو۔ لفظ انسانوں کے لئے نہیں بنے۔ انسان لفظوں کے لئے بنائے گئے ہیں۔ پہلے لفظ پیچھے انسان۔"

چونکہ میرے دوست کو بحث سے سخت نفرت ہے میں بات ٹال کر اسے اپنے نئے ایمان سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ جس طرح وہ لفظوں کا شیدائی ہے میں رنگ کی رنگینیوں کا دلدادہ ہوں۔ میرا ایمان یہ ہے کہ قوسِ قزح کے گھونگٹ میں نورِ مطلق ہے۔ میرے لئے یہ تصور ناممکن ہے کہ وہ نورِ مطلق جس کا بازاری اسم خدا ہے رنگ جیسی دلفریب چیز کو چھوڑ کر لفظوں جیسی ہوائی گٹھڑیوں کا استعمال کرے۔ لفظ آخر کیا ہیں؟

چند آوازوں کا مجموعہ! آوازیں کیا ہیں؟ بچاری آزاد ہوا کے دھماکوں کی گرہ در گرہ بندش! اگر دو آوازوں کے درمیان خاموشی کا پل نہ ہو تو مطلب کا چھکڑا کبھی پار نہ پہنچے۔ "الف" سے "ب" تک اگر کوئی سوچے تو ہزاروں میل لمبا خاموشی کا غار ہے۔ یہ طے نہ ہو تو انسان "آ۔آ۔آ۔آ۔آ . . . . ." کرتا رہ جائے۔ یہ کہیں طے ہو تو "اب" بنتا ہے۔ اگر اسی طرح انسان ہوا کو گرہ لگاتا جائے یعنی آوازوں کو خاموشیوں کی پڑیا میں لپیٹ لپیٹ کر الگ الگ دھرتا جائے تو تب جا کر کہیں فقرہ اور پھر مضمون بنتا ہے۔ بھلا خدا کو کیا ضرورت ہے کہ وہ اس قسم کی کچی گولیوں سے کھیلے؛ لفظ قطعی محدود ہیں اور اسی لئے خدائی استعمال کے قطعی ناقابل۔ لفظوں کے بالمقابل رنگ غیر محدود ہیں، نامتناہی ہیں اور ایک رنگ کو دوسرے رنگ سے ملنے کے لئے کسی نامحرم کی امداد کی ضرورت نہیں۔ لفظ لنگڑے ہیں۔ خاموشی کی لاٹھی کے سہارے چلتے ہیں۔ رنگ برق پا ہیں۔ یہ آیا وہ گیا۔ سب جگہ ہیں، ہر وقت ہیں اور اڑنے پر بھی نیا رنگ لاتے ہیں۔ لفظ مرتے رہتے ہیں۔ رنگ پھیلتے رہتے ہیں۔

مگر میرے دوست کو میرے نئے ایمان میں کچھ دلچسپی پیدا نہ ہوئی وہ لفظوں پر اڑا رہا اور کہتا رہا:—

"کائنات انشا ہے جس کا مضمون خدا ہے"

فلک پیمائیاں

عاشق کی دعا :۔

اے خدا! میرا دل چکنا چور کر دے کیونکہ میرے سارے دل سے میرے دل کے چند ٹکڑے بہتر ہیں کسی ٹکڑے میں تُو ہے کسی ٹکڑے میں وہ ہے۔

اے خدا! ان گنتی کے چند ٹکڑوں میں تُو خود بھی رہتا ہے اور اوروں کو بھی بھیجتا ہے۔ اے خدا! تُو خود بھی برحق ہے، تیرے رسول بھی برحق ہیں۔ اے خدا! تیرا حکم تو یہ ہے کہ تیرے رسولوں میں فرق نہ کروں مگر میں تیرے اس حکم کی تعمیل ذرا مبالغے سے کرتا ہوں یعنی اس طرح کہ خود تجھ میں اور تیرے بھیجے ہوؤں میں بھی فرق نہیں کرتا۔ میرے دل کے اندر تُو نہ ہو وہ ہو ایک ہی بات ہے۔

(محبت کی کھلی ہوا میں جن کا دم گھٹتا ہے وہ یہ سطریں نہ پڑھیں)

اے خدا! میری بغاوت کو ہی میری عبادت سمجھ لے۔ تیرے لئے میرے پاس سوائے گستاخی کے اور کوئی تحفہ نہیں۔ اے خدا! عبادت کی شوخی مجھ سے نہیں ہوتی۔

اقوال :۔

اخلاقی ترقی کا لُب لباب یہ ہے کہ انسان پرانی بُری عادتوں کو نئی بُری عادتوں سے بدلتا رہے مگر بنی نوع انسان نے اپنی پانچ دس ہزار سال کی تاریخی زندگی میں بُری عادتوں کو اس فضول خرچی سے استعمال کیا ہے کہ شیدائیانِ رسوائی کو تلاش سے بھی نئی بُری عادت دستیاب نہیں ہوتی اور اب یہ

حالت ہے کہ عیوب کے لئے بھی زمانہ ماضی کی خوشہ چینی سے مفر نہیں۔ اللہ کی دُنیا میں اللہ کے بندے سب کچھ آزما چکے۔

اِس زمانے میں تو روشنی بل کھا کر چلتی ہے۔ انسان کیا سیدھا چلے گا؛ خود لوز میں خم ہے جو سیدھا چلا اور ہمت سے چلا سو مرا۔ قانونِ حیات سُست روی ہے۔ جو کام کرو ایسی طرح کرو کہ کسی نہ کسی طرح دیر لگے۔ مرو بھی دیر سے۔

اگر تم ہر طرح سے مکمل ہونا چاہتے ہو تو ابتدا سے شروع کرو یعنی اچھے ماں باپ بہن بھائی نیک ہمسائے، دیانتدار محنتی حاکم صحت دولت سب کا دُنیا میں داخل ہونے سے پہلے انتظام کرو اور پھر شاید ممکن ہو کہ شادی سے پہلے پہلے تم کسی کسی وقت تھوڑا سا خوش رہ سکو۔

دِلی خوشی

میرا دوست مجھ سے پوچھتا ہے

"تمہاری 'دلی خوشی' کا آج کیا عالم ہے ؟"

مجھ سے "دلی خوشی" کے عالم کا کیا حال پوچھنا ! میں وہ شہنشاہ ہوں جو خود اپنا باج گزار ہو۔ ع

دِل کے آئینہ میں ہے تصویرِ یار

اور کیا لکھوں :

یہ قطعی صحیح ہے کہ جو اپنی دنیا خود بن گیا اور اپنے کو کسی ایک چہرے کی یاد سے کسی دو آنکھوں کے خواب سے بے حساب خراج دینے لگ گیا وہ اتنے خزانوں کا مالک بن جاتا ہے کہ نہ شفق کی رنگ آمیزیاں، نہ تاروں کی کرنیں اسے کوئی بھی خرید نہیں سکتا۔ مگر یہ بھی قطعی صحیح ہے کہ نقل کو اصل پر فروغ ہے + فلسفے کی دکانوں میں، مذہب کے بُت خانوں میں، تصوف کے میخانوں میں ہزاروں نقلی خوشیاں چمک دمک میں چندے آفتاب چندے ماہتاب ارزاں ہیں۔ جنسیات کی زائیدہ، واقعات سے وابستہ سینکڑوں قسم کی بنت الوقت خوشیاں ہیں۔ اولاد کی، مال کی، جاہ کی، حب الوطنی کی اور کامیاب نفرت کی حکومت اور بہشت ان کے سبز باغ ہیں مگر مجھے نہ ان سے تنفر ہے نہ سروکار۔ میرے دِل کی دُنیا کسی اور دنیا سے ہرگز نہیں اُلجھتی۔ یہ افسردہ کر دینے والی اُمید، یہ مُردہ کر دینے والی اُمید کہ خارجی دنیا کو شاید میری ضرورت ہو دل سے نکال چکا ہوں۔ میں ہوا کا وہ ہلکا سا جھونکا ہوں جو چل چکا۔ مجھ سے پہلے یا بعد کی آندھیاں میری زندگی کے لئے قطعی غیر مؤثر ہیں۔ میں یہاں ہوں ہی نہیں۔ مجھے نہ کچھ کرنا ہے نہ کچھ ہونا ہے۔ میں وہ حساب کتاب ہوں جو قطعی بیباق ہو چکا۔ روزِ ازل سے پہلے بیباق ہو چکا + کیونکہ اس میں "نجات" کا جُوا کھیلنے کے متعلق کوئی رقم نہ تھی۔

رُوحانی باریکیاں

۶-مئی ۱۹۳۱ء کے اخبار پاونیر (از الہ آباد) میں تذکرہ ہے کہ ایک پروفیسر صاحب نے طلبہ کے استفادے کے لئے ایک ببر شیر کو جماعت کے سامنے موجود رکھنے کا انتظام کیا۔ چنانچہ ایک چست چالاک بے باک امریکن خاتون (شیروں کو سدھانے والی) شیر صاحب کو زنجیر سے اٹکائے ہوئے جماعت میں آموجود ہوئی۔ تقدیر کے کھیل میں یہ بھی لکھا تھا کہ زنجیر ٹوٹ جائے اور پیشتر اس کے کہ وہ جفا پیشہ شیروں کی معلّمہ اُسے قابو میں کرے شیر صاحب ایک طالب علم کو کچا چبا جائیں۔ یہاں تک تو واقعات کا تعلق ہے اور واقعات کے متعلق ہم صرف یہی لکھنا چاہتے ہیں کہ اگر قلم ہمارے ہاتھ میں ہوتا تو ہم قطعی یہ لکھتے کہ کانگرس کے لکچروں سے متاثر ہو کر ایک کم سن دوشیزہ نے شیر کو کچا چبا لیا۔ مگر اخبار والوں سے کون لڑا کرے البتہ اس واقعے کا (یعنی جیسا کہ اخبار پاونیر نے اسے لکھا ہے) ایک نہایت مذموم اخلاقی پہلو ضرور قابلِ بحث ہے۔

جو شیر کہ قید ہو کر زندہ رہ سکتا ہے، نہ صرف زندہ رہ سکتا ہے بلکہ ایک عورت ذات کے کہنے پر اپنے غلامانہ کرتب دکھا سکتا ہے وہ اگر یہ غلطی کرے کہ پروفیسر کو نہ کھائے اور طالب علم کو چبائے تو معاملہ چنداں قابلِ اعتراض نہیں۔ قیدی شیر میں اتنی عقل کہاں کہ پروفیسر اور تلامذہ میں امتیاز کر سکے اور ممکن ہے کہ پروفیسر گنجا ہو اور شیر کو موئے انڈوں سے نفرت ہو۔ قابلِ اعتراض امر یہ ہے کہ ایک آزاد ملک میں (واقعہ سنسناٹی امریکا کا ہے) ایسے طالب علم موجود ہیں جو سبق الاشیاء کے درس میں یہ برداشت کر سکتے ہیں کہ ایک قیدی شیر اُن کے سامنے لایا جائے۔ کیوں اس جماعت میں شیر کے آتے

ہی ایک مستانہ نعرہ بلند نہیں کیا گیا کہ "زنجیر مردہ باد؛ ؛" پھر اگر زنجیر ٹوٹتی تو کس قدر اپنی روحانی شکتی پر ان طالب علموں کو ناز ہوتا! فوری ایجاب دعا سے کس قدر اُن کا ایمان مستحکم ہوتا! مگر ایک Atom پرست تہذیب ایسے طالب علم پیدا کرنے کے نا اہل ہے۔ یہ فخر صرف ہندوستان ہی کو حاصل ہے کہ روحانی موجودات کی قطعی احدیت کا زندہ ثبوت یہاں ہر وقت موجود ہے۔ نہ صرف یہ ہے کہ شیر، بھیڑیئے، سانپ سب آزاد ہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ جو آج انسان ہے وہ ممکن ہے کہ کل سانپ ہو اور پرسوں بچھو۔ جاندار ہستیوں میں اشکال کا ردوبدل (تناسخ) یہاں جزوِ ایمان ہے۔ معمولی آدمیوں کی روح موت کے بعد قالب بدلتی ہے مگر بڑے بڑے آدمیوں کے قالب روزانہ روح بدلتے رہتے ہیں۔ دہلی میں صلح کرتے ہیں تو کراچی میں جنگ کا چولا بدلتے ہیں اور لندن میں نفع کے سودے کا بیوپار بھی جاری رکھتے ہیں۔ امریکا والے ان روحانی باریکیوں کو کیا سمجھیں گے؛

رازِ حیات

انسان پیدا ہوکر، جوان ہوکر، بوڑھے ہوکر، سب کچھ ہوکر یا کچھ نہ ہوکر آخر کار ضرور مر جاتے ہیں قطعی مرجاتے ہیں۔ کبھی نہ کبھی وہ وقت بھی آئے گا کہ دُنیا ہوگی مگر انسان نہ ہوں گے۔ نہ صرف ہم جیسے بے کار انسان نہ ہوں گے بلکہ کسی قسم کی کوئی ایسی ہستی جو سوچ سکے، بول سکے، دیکھ سکے، گا سکے، لڑ سکے، کہیں بھی نہ ہوگی۔ یہ دنیا ہوگی اور اس کے خوبصورت پتھر، خوبصورت روشنیاں، تاریکیاں اور شاید رنگ۔ جاندار ہستیاں مریں گی تو غالباً پانی بھی مفقود ہوگا کیونکہ جب تک پانی ہے زندگی ضرور رہے گی۔

دنیا اُس وقت ضرور حسین ہوگی مگر حسُن پرست کوئی نہ ہوگا۔ دُنیا کی نجات ہو جائے گی۔

نجات کتنی مہنگی ہے؛ پانی نہ ہو، دریا نہ ہوں، قطبین پر برف نہ ہو، ہمالیہ پہ درخت نہ ہوں، شالامار نہ ہو، پھول نہ ہوں، شملہ میں سارٹھیاں نہ پھڑکیں۔

باوجود اس قدر گراں ہونے کے نجات کس قدر ذلیل چیز ہے! خود دنیا کو پتا نہ ہوگا کہ اُسے نجات ہوئی کہ نہ ہوئی۔ مگر یہ یقینی ہے کہ نجات دنیا کی قسمت میں لکھی ہے۔ اس سے مفر ناممکن ہے۔

کہیں رازِ حیات یہی نہ ہو کہ جہاں تک ممکن ہو سکے نجات سے بچو! ہم جو آب ساختہ ہیں کیوں اس سیدھی سی بات کو نہیں سمجھتے؟

ایک سوال

یورپ، امریکہ کے بڑے شہروں میں جابجا ایسی مشینیں رکھی ہیں کہ دن رات جس وقت چاہو دام ڈالو چیز لو۔ سگرٹ، چاکولیٹ، ڈاک کے ٹکٹ، دیاسلائیاں، مٹھائیاں، اپنا وزن، ریل کا ٹکٹ وغیرہ وغیرہ کسی قسم کے دھوکے کی گنجائش نہیں، دام کھرے ہوں تو چیز موجود ہے ورنہ نقد واپس۔ بعض منچلے کھوٹے شلنگ سے اچھے سگرٹ لینا چاہتے ہیں مگر مشین بلاتامل کھوٹے شلنگ کو ٹھوک دیتی ہے۔

انسان کی یہ تدبیر کہ اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے کوئی نئی بات نہیں۔ تمام تاریخ شاہد ہے کہ مذاہب اس تدبیر کے سب سے بڑے حامی رہے ہیں اور ہیں۔ مذاہب کے نزدیک کائنات (universe) ایک قسم کی Penny-in-the Slot مشین ہے اور مذاہب کا دعوےٰ ہے کہ ایک طرف کھرا عقیدہ ڈالو دوسری طرف اصلی نجات لے لو۔ یہ امر محض فروعی ہے کہ مختلف مذاہب میں مختلف روحانی سکے جاری ہیں اور ہر مذہب مُصر ہے کہ اصلی روحانی سکے کی ٹکسال صرف اُس کے قبضے میں ہے اور دیگر مذاہب کے پیشوا بیش وکم جعلی سکہ چلاتے ہیں۔ اسی طرح تمام تاریخ شاہد ہے کہ اس دنیا میں انسانوں پر حکومت کرنے کے لئے، اُن سے اپنی خدمت کرانے کے لئے کائنات کی مشین سے یوں کام لیا جاسکتا ہے کہ ایک طرف سے ظلم، جبر، دھوکا، بحری قزّاقی، پر دغا عہد وپیمان ڈالو اور دوسری طرف تجارت، سلطنت، شاہنشاہی لے لو۔

مطلب کسی پر اعتراض کرنے کا یا کسی کو بُرا بنانے کا ہرگز نہیں۔ مطلب صرف یہ ہے کہ یہ خیال کہ کائنات ایک سریع الحرکت، نہ دھوکا کھانے والی اور کھوٹے کھرے کو فوراً پرکھنے والی مشین ہے، عام ہے۔

میری آج کل کی دُنیا میں اس خیال کی سب سے بڑی حامی ہستیاں دو ہیں جو حسنِ اتفاق سے یہ دونوں ماں بیٹی ہیں۔ ماں جاہل ہے، بیٹی جاہلِ مطلق ہے مگر دونوں اپنے اپنے عقیدے کی پیغمبر ہیں۔ ماں کا اسلام یہ ہے کہ ایک طرف سے خدمت اور صداقت ڈالو اور ڈالتے چلے جاؤ تو دوسری طرف سے ضرور ابدی مسرت حاصل ہوگی گو خدمت اور صداقت کو بار بار اور پیہم مہیا کرنے میں رنج کا سامان ضرور ہوگا مگر پاک کار کے خیال سے یہ رنج اور دُکھ کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ بیٹی کا خیال یہ ہے کہ انسان کائنات کی مشین میں ایک طرف سے شاعری کا عطر نچوڑ کر لہو کی بوندوں سے رنگین کرکے ڈالیں تو دوسری طرف ضرور شوقِ آتشیں کا ڈراما نظر آئے گا۔ ممکن ہے کہ دونوں کا خیال سچ ہو، ممکن ہے کہ مذہب اور حکومت والے بھی سچے ہوں مگر راقم سطور کو جو دقت ہمیشہ رہتی ہے اور جس دقت کے باعث وہ کبھی اس مشین کو استعمال نہیں کرتا یہ ہے:۔

اگر کسی شخص کو جس قسم کی ابدی مسرت یہ مشین مہیا کرتی ہے پسند نہ ہو تو کیا یہ مشین از روئے انصاف اُلٹا چلنا شروع کر دے گی اور صداقت وخدمت واپس کر دے گی یعنی صداقت اور خدمت کے وہی مواقع، وہی جوشِ شباب، وہی ابتدائی خود فریبی کے دلکش اور دلکشا منظر؟ اگر یہ مشین ایسا کرنے سے عاجز ہے تو انسان اس مشین کے ساتھ کیوں اس قسم کا گھراجڑا کھیلے؟۔

جواب دیں دونوں پیغمبر!

(۱)

انسان کا یہاں آنا برا، آکر یہاں سے جانا بھی برا، اور اس آنے جانے کے بہانے تو بہت ہی برے

(۲)

بعض کہتے ہیں کہ روح غیر فانی ہے۔ کائنات نہ ہوئی دھوبی کا گھاٹ ہوئی جہاں کثیف روحیں دھلتی رہتی ہیں۔

(۳)

کاش دنیا اس دھوبی نظریہ کو رخصت کر چکے! کاش کہ دھوبی کا بیل تمام روحوں کو کچا چبا جائے پھر تو نہ روح ہو نہ دھوبی کے بیل کی فکر!

(۴)

عدم سے آنے والے عدم کو جانا پسند نہیں کرتے۔ عربی کی ایک ضرب المثل ہے کہ تمام چیزیں اپنی اصل کی طرف رجوع کرتی ہیں۔ انسان، باغی انسان، عدم زائیدہ انسان عدم سے بھاگ کر ابد میں گھسنا چاہتا ہے۔ اسے اپنی اصل سے نفرت ہے، اور اسی حد تک یہ گمراہ ہے۔ صرف ان کی آنکھیں کھلی ہیں جن کا غالب کے ساتھ ایمان ہے

ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

یعنی ہم اب بھی عدم ہی میں ہیں اور ہمارا ہونا نہ ہونے کے برابر ہے ۔ یہ شعر اس مشہور شعر سے

نہ تھا کچھ ، تو خدا تھا ، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

جس کی تشریح پیش کرنے کا موقع مجھے سیال کوٹ میں آج سے سولہ سال پہلے غالب کی برسی کی تقریب پر ایک جلسے میں ملا تھا ، بہت بالاتر ہے ۔ " نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا " والے شعر میں پیر و مرشد خود فریب ہستی کھا گئے اور لگے ڈوبنے ۔

(۵)

کسی زمانے میں عدم بے باک طریقے سے کثیر الاولاد تھا ۔ لاکھوں کروڑوں دیوتا دیویاں پیدا کرتا چلا جاتا تھا ۔ رحم عدم کا وہ حصہ جہاں سے دیویاں دیوتا پیدا ہوتے تھے اب قریباً بانجھ ہو چلا ہے ۔ بلکہ ایک فلسفہ کے رُو سے تو خود عدم ہی مفقود ہے مگر یہ فلسفہ ضرور غلط ہے ۔ عدم ہی وہ عمرو عیار کی زنبیل ہے جس میں غلط فلسفے چھُپ سکتے ہیں ۔

(۶)

پیغمبر ، فلاسفر ، صوفی ، مقنن آتے جاتے رہتے ہیں ، سمجھاتے بھی ہیں ، نمونہ بن کر بھی دکھلاتے ہیں ، ڈراتے بھی ہیں ، بہشتوں کی رشوت بھی پیش کرتے ہیں مگر انسان وہی کرتے ہیں جو غلط ہو ۔ عدم میں غلطی بھی صحت ہے ۔

دائمی شباب

پنجابی میں ایک نہایت پُرمعنی ضرب المثل ہے جس کا قریب ترین مفہوم یہ ہے

وقت کی نماز اور بے وقت کی ٹکریں

عام مطلب تو یہی ہے کہ کوئی خاص مجبوری نہ ہو تو نماز کو بے وقت ادا کرنا گویا یونہی سر پھوڑنا ہے مگر اس معمولی سی بات کی تہہ میں جو راز ہے یہ ہے کہ اگر کوئی وقت پر نماز ادا کرے گا تو قدرۃً کسی مسجد میں **باجماعت** نماز ادا کرے گا گویا اصلی نماز میں خدا کی عبادت اس قدر مقصود نہیں جس قدر کہ مسلمانوں کا جمع ہونا اور مل کر کچھ کرنا۔ نماز عشق ہے مگر خدا کا نہیں، ہرگز نہیں، مسلمانوں سے عشق کا نام نماز ہے۔ خدا محض بہانہ ہے۔ کوئی اسے یوں سمجھ لے کہ جو شخص بُرے مسلمان کو بھی بُرا کہے وہ نمازی نہیں، صرف سر پھوڑنے کا عادی ہے۔

کہاں میں کہاں یہ وعظ کی دُھن مگر مشکل یہ آ پڑی ہے کہ جو مطلب ادا کرنا چاہتا ہوں وہ وعظ ہی کے رنگ میں ادا ہو سکتا ہے۔ جس طرح نماز کا یہ کمال ہے کہ نماز عشق بن جائے چاہے وہ خدا ہی کا عشق ہو اور مسلمانوں سے عشق کے پایۂ کمال کو نہ پہنچے اسی طرح عشق کا کمال یہ ہے کہ وہ نماز بن جائے جس مرد میں اتنا ہوش باقی ہے کہ اپنی معشوقہ کا کوئی عیب اسے نظر آتا ہے وہ مرد عشق سے بے بہرہ ہے۔ خام عشق عشق ہی نہیں محض سر پھوڑنا ہے۔

وقت جو کہ زندگی کا تانا بانا ہے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ عشق کرو تو شباب میں کرو کیونکہ شباب کے بعد یہ تانا بانا رنگ نہیں پکڑتا۔ کہاں پھوسلے رنگ کی خاکستری زندگی اور کہاں وہ ارغوانی شادمانی جو شباب

ہیں عشق کی کامرانیوں کا انعام ہے۔

شباب کا عشق، بڑھاپے کی لہریں

یہ عبارت یہاں تک لکھی جا چکی تھی کہ اُس قصّے کا خیال آ گیا جس میں ایک سائنس دان شیشے کا ایک ایسا گھنٹا ٹوپ ایجاد کرتا ہے کہ مرتے وقت اگر اس بلوریں گھنٹا ٹوپ کو مرنے والے کے اوپر جما دیا جائے تو روح یا وہ روحانی طاقت جس سے انسان زندہ ہے خود بخود بلوریں گھنٹا ٹوپ کے اوپر کے حصّہ میں سما کر جو بجلی کے لیمپوں کی طرح کانچ کا بلب ہے، آپ ہی بند ہو جاتی ہے یوں تو نظر کچھ نہیں آتا مگر ایک خاص قسم کی ایکس ریز سے اس بلب کو جو دیکھا جائے تو یہ روح یا طاقت نہایت خوشنما رنگوں کا مجموعہ ہے اور اس طاقت کی رنگینیوں کی سحر کاریاں کسی حد تک خارج از قیاس ہیں۔ اس ستم ایجاد سائنس دان نے یہاں تک کیا کہ دو روحوں کو ایک ہی بلب میں بند کر کے بھی دیکھا۔ متضاد روحیں تو ایک دوسری کے ساتھ ملتے ہی گویا جل بھُن کر خاک ہو گئیں مگر مانوس روحیں اور بھی زیادہ چمکیں۔ جن روحوں میں کچھ قدرتی اُنس تھا وہ تو ایک دوسری سے مل کر اس طرح شعلہ زن ہوئیں کہ ہیرے موتی پانی پانی ہوں لعل و زمرد پیلے پڑیں۔ اس سائنس دان کا مطلب کوئی تماشا قائم کرنا تو نہ تھا صرف یہ دکھانا تھا کہ وہ جادو جس کا نام انسان ہے مرنے پر تلف نہیں ہوتا۔ رہتا ہے اور ایسا رہتا ہے کہ اگر نا اہل سے پالا نہ پڑے تو پہلے سے بہت زیادہ آب و تاب کے ساتھ۔

یہ قصّہ یوں ہی درمیان آ گیا۔ روحیں اگر رنگین شعلے ہیں تو شباب میں عشق کی برقی رَو انہیں اور بھی زیادہ نمایاں کر سکتی ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ شباب صرف وہ فساد ہے جو محض جسمانی جوانی کا ایک خاصہ ہے یا اس شباب کا کوئی الگ معیار ہے۔

وقت جو کہ زندگی کا تانا بانا ہے کبھی اپنی بلند آواز کو کسی ایسی چیز کے لئے ضائع نہ کرتا جو ہر ذی روح میں قدرتی طور پر ضائع ہوتی ہے۔ جوانی واقعی ضائع ہوتی رہتی ہے اور اسے ضائع ہونا چاہیئے۔

"جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی"

جوانی جا کے نہیں آتی جس شباب کا یہاں ذکر آتا ہے اس کا آنا مشکل ہے مگر آجائے تو پھر کبھی نہیں جاتا جنہیں یہ شباب حاصل نہیں وہ اسے اُس خدا سے طلب کریں جو

دائمی شباب

ہے اور جو اسی لئے ہمہ تن عشق ہے اور جسے اسی لئے کبھی سزا اور جزا کی فرصت ہی نہ ہوگی۔

اس نازک انوکھے مسئلے کو کون سمجھے گا؟ لوگوں میں یہ غلط العام مروج ہے کہ انسان بچہ پیدا ہوتا ہے پھر جوان ہوتا ہے، پھر بوڑھا ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان بے انتہا بوڑھا پیدا ہوتا ہے۔ ماں کے پیٹ کے اندر ہی پہلے چار پانچ مہینے میں اس بیچارے پر ہزارہا قرن گزر جاتے ہیں شکل مچھلی سے بدلتے بدلتے کتے کی طرح بن کر پھر انسانی ڈھانچہ اختیار کرتی ہے۔ کیا صانع ازل ہر "معزور شکاری بوند" پر اس قدر محنت محض اس لئے صرف کرتا ہے کہ شباب کے بعد بڑھاپا ہو؟ لاحول ولا قوۃ۔ ممکن ہے کہ یہ اُن کے لئے سچ ہو جو صرف جسم کے لئے زندہ ہیں گو مجھے اس میں بھی شک ہے۔

وقت جو کہ زندگی کا تانا بانا ہے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ انسان باقی ذی رُوح چیزوں سے مختلف ہے۔ بادل کی جڑ سمندر میں ہے۔ پھول کی جڑ زمین میں ہے۔ یہ سب چیزیں باہر کی طرف پھولتی پھلتی ہیں مگر انسان کی جڑ ساری دُنیا ہے۔ انسان وہ پھول ہے جو اندر کی طرف کھلتا ہے۔ اس پھول کی خوشبو عشق ہے مگر یہ خوشبو صرف اسی شباب میں ظاہر ہوتی ہے جس کو دوام ہے۔

اقوال

انسان کا پہلا اور آخری تنزل یہ تھا کہ بتوں کو پوجنے کے قابل نہ رہا۔ منہ پھٹ پیغمبر اقبال کیا پتے کی بات کہہ گیا ع

تراشیدم، پرستیدم، شکستم

مگر بتوں کو توڑنے والا خود کب ٹوٹے گا؟ عمارتوں کے کھنڈر کچھ بھی نہیں، وہ کھنڈر جنہیں دیکھنے سے اصلی عبرت ہوگی انسان کے کھنڈر ہوں گے۔ انہیں کون دیکھے گا ...... خدا

یہ جو ٹکے سیر کفر برسرِ راہ آج کل بکتا ہے محض دیسی گلا سڑا ایمان ہے۔ اصل ولایتی کفر یہاں آتا ہی نہیں یہاں کے ایک کافر نے یہ لکھ ڈالا کہ محض پرانے بیر کی وجہ سے خدا شیطان کی مدد نہیں کرتا ورنہ یہ دنیا کہیں سے کہیں ترقی کر جاتی۔ کس قدر کچا کافر تھا کہ اس کے نزدیک گویا اب تک یورپ اور امریکا خدا کی مدد کے محتاج ہیں۔ پکا کافر ہونا کس قدر مشکل ہے۔

تہذیب کا تازیانہ انسان سے کیا کیا نہ قبلوا دے گا! یہ تو مدت ہوئی کہ انسان انگوٹھا لگا کر تحریر دے چکا کہ مذاہب اور مذاہب کے اوہام سب باطل۔ تہذیب کی مار پیٹ سے مجبور انسان نے پہلے تو خدا کو بت خانوں سے نکال کر آسمان پر بٹھایا پھر آسمان سے اُتار کر خود اپنے ذہن کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ہستئ مطلق کہہ کر اسے مقید کیا اب انسان خود اس تہ در تہ ذہنی زندان سے بھی منکر ہے۔

کائنات نے انسان کے پیچھے کس غرض سے یہ پولیس لگا رکھی ہے؟ کس جرم کے بدلے؟ کبھی جو یونہی گردن موڑ کر ان سال و ماہ کو دیکھ لیتا ہوں جو اب پس پشت ہیں تو جلدی سے منہ پھیر لیتا ہوں اُس تمام دھندلکے میں اگر کچھ اُجالا ہے تو دو چار ابلہانہ امنگوں کا۔

کیا اب بھی وہی غلطیاں کرتا جاؤں؟ کیا انسان غلطیاں کرتے کرتے صراط المستقیم کی طرف بھٹک نکلتا ہے؟ یا کیا یہ بات ہے کہ جنہیں ہم نادانیاں سمجھتے ہیں وہی اصل زندگی ہیں۔ کون بتائے اور کون سمجھے؟

اے پری تو آجا۔ سہانا دن ہے، دل آرزومند ہے اور تو باوفا ہے۔ آجا، جلدی آجا۔ کیا تیرا نام لے کر تجھے پکاروں؟ کیا میں کبھی زاہدِ ظاہر پرست ہوں کہ دن میں پانچ دفعہ چیخ چیخ کر اس خدا کو پکاروں جو شہ رگ سے بھی قریب تر ہے؛ ہرگز نہیں۔ اور سب کچھ کروں گا تیرا نام نہ لوں گا۔ میرا مذہب یاد ہے پکار نہیں۔

پرانے یونان میں ایک نوجوان محبت کی دیوی زُہرہ (VENUS) کے وعدے پر کئی دن ایک جنگل میں جاتا رہا۔ زہرہ اُسے نظر نہ آئی۔ آخر وہ نوجوان اپنے آپ سے یوں ہمکلام ہوا۔

"دیویاں تو ہم انسانوں کی طرح عہد شکن نہیں ہوتیں۔ زُہرہ کیوں نہیں آتی؛ کیا میں جنگل میں چڑیوں کے چہچہے سننے کے لئے آتا ہوں؛ یا اس لئے کہ سیماب رنگ جھیل میں بطخوں کی اٹھکیلیاں دیکھوں؛ ہرگز نہیں مایوسی انسان کی قسمت سہی مگر زہرہ کو آنا چاہئے۔" اپنے آپ سے یہ باتیں کرتے ہوئے نوجوان جنگل سے چل نکلنے کو تھا کہ جھیل کے طوفان میں سے دو پیکر نمودار ہوئے۔ نوجوان کلیجہ تھام کر رہ گیا۔ ہمہ تن حیرت تھا کہ کیا محض بے خبری سے ایک فانی انسان عنقریب دو غیر فانی ہستیوں کا ہم جلیس ہونے کو ہے۔ لہروں کو چیرتی ہوئی ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے دو نوجوان لڑکیاں نکلیں۔

نوجوان کا دھڑکتا دل اس خیال سے "نہیں یہ تو انسان ہیں" قابو میں آگیا۔ پہلے جو ڈر کے مارے آنکھیں نیچی کر کے ٹھٹک کر رہ گیا تھا وہ حالت نہ رہی۔ ان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ دونوں لڑکیاں لہروں سے نکل کر درخت کے نیچے ایک دوسری سے گویا قد و قامت کا موازنہ کر رہی تھیں ایک دوسری کو ناپنے لگیں اور جھکیں کہ زمین سے کوئی لمبا سا تنکا اُٹھا لیں اور اسی سے اپنے آپ کو ناپیں۔

اتنے میں اس نوجوان کے پاؤں تلے ایک خشک پتہ پسا اور اس آہٹ پر ان لڑکیوں میں سے وہ جو اپنے آپ کو ناپ رہی تھی کہنے لگی "تم سے کام ہے۔ یہاں آؤ" اور پھر یوں بولیں۔

"ہم دونوں تو آپس میں جھگڑ پڑی ہیں اور ہمارا معاہدہ تھا کہ جو مرد پہلے ملے اُسی سے فیصلہ کرائیں کہ کس کا اُبھار زیادہ حسین ہے مگر کوئی ادھر اُدھر نظر نہ آیا تو ہم خود ایک دوسرے کو ناپنے لگ گئیں۔"

یونان کا یہ پرانا قصّہ لمبا ہے۔ محبت کی دیوی نے اپنی شکل ایک لڑکی کو دے دی۔ گویا ایک رآمد روپ میں اُسی منتظر نوجوان سے آملی۔ یہ نوجوان وہی سنگ تراش تھا جس کا بنایا ہُوا VENUS (زُہرہ) کا مجسّمہ دنیا بھر کی حُسن پرست نگاہوں کا کعبہ ہے۔

اے میری پری۔ میں سنگ تراش نہیں ہوں۔ میرے پاس صرف ہلکا سا لفظوں کا جادو ہے اتنا ہلکا کہ تجھ پر نہیں چلتا۔ اتنا بھاری کہ میں اس کے بوجھ سے ہل نہیں سکتا۔

اے مخملیں آنکھوں والی پری! وہ شعاعیں جن سے دماغ روشن ہوں تیرے ریشمیں سیاہ بالوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ وہ خوشبو جو خوشبو بھی ہے اور شوخ قوسِ قزح بھی تیرے تبسّم سے افشاں ہے۔

یونان کے قصّے کو کیا کروں۔ میں جو پرانے معبود کو نہیں مانتا پُرانے حسن و عشق پر کیسے ایمان لے آؤں تو اپنی طرح کی پہلی ہے۔ نرالی ہے۔

اَور حسین ہیں تو حسُن پرور ہے اَور چنبیلی ہیں تو گلاب ہے۔ پیاری! دُنیا کے زرد پھول میری ارغوانی پرستش کی کیا تاب لائیں گے؛

آ کہ میں تجھے یاد کرتا ہوں۔

شہنشاہِ ہمایوں کے مقبرے میں

اے شاہنشاہ!

تیری کشش مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔ کیا کشش؛ یہ کہ تو اچھا بیٹا تھا۔

اے شاہنشاہ!

دِلّی کے مغل کہ لنڈن کے مُغل، سلطنتیں مٹانے والے کہ سلطنتیں بنانے والے مغل، ساری دنیا کے آنے والے جانے والے مغل اُس چیز سے جو تجھے حاصل ہوئی بے نصیب رہے یعنی یہ کہ ظہیر الدین نے نصیر الدین کی بیماری لے لی اپنی جان دے دی۔ تو بیٹا تھا بھی اس قابل کہ دنیا کے ناموروں میں سے بالاترین نامور بابر نے تیری خاطر بادشاہی کو ٹھکرا دیا۔ بادشاہی چھوڑ کر ایک غمزدہ باپ بن گیا۔

کس قدر وہ بڑا تھا۔ کس قدر تو پیارا تھا۔

اے شاہنشاہ! غمزدہ باپ تین دفعہ بیٹے کی چارپائی کے گرد پھرتا ہے۔ لوگوں کو طوافِ کعبہ سے کچھ نہیں ملتا۔ بابر کی اولاد کو تیری چارپائی کے تصدق ہند سا ملک کھلونا مل گیا۔

اے نصیر الدین! ظہیر الدین باپ نے دعا پہلے نہیں مانگی۔ جان کی ضرورت تھی دعا کا وقت نہ تھا۔ اس نے جان پہلے رکھ دی۔ موت سے تجھے مُول لے لیا۔ ظہیر الدین کو سستا سودا خریدنے کی عادت نہ تھی۔

اے نصیر الدین!

تیرے دم سے زندگی نفع میں رہی موت کو گھاٹا نہ ہُوا۔ باپ بیٹے کی یہ بات چار سَو سال سے

نہ چار ہزار سال سے پرانی نہ ہوگی، بے لُطف نہ ہوگی۔

اے نصیر الدین! ایک تنہائی کا مارا غریب الوطن تیری یاد میں اپنی دنیا سے چار سو سال پیچھے ہٹ گیا ہے۔ آ، اُس غریب سے مل۔" تو جو مرتے مرتے بچا اور ڈوبتے ڈوبتے نظام کو بادشاہی دے گیا"، تو جسے جنگل میں اکبر جیسا بیٹا ملا، تو جسے پردیس میں فوج ملی اور دیس میں یہ مقبرہ، تو کس قدر پیارا تھا۔ اب کہ تجھے نہ دنیا کے دھندے ہیں نہ سلطنت کے جنجال، تو چار سو سال آگے کو قدم بڑھا، آ اور ایک غریب کی رفاقت کر۔

اے نصیر الدین! میں قبر پرست نہیں ہوں۔ خدا پرست ہوتا تو شاید قبروں کو بھی پُوج لیتا۔ تیری قبر پر زائر بن کر نہیں آیا شاعر بن کر نہیں آیا۔ زائر ہوتا تو یہاں سے قریب ایک اولیا کی درگاہ ہے وہاں کچھ مانگتا مگر میں تو وہاں جا کر بھی تیرے پوتے کی پوتی جہاں آرا کی قبر کو تکا کرتا ہوں۔ وہ اپنے باپ کی خدمت گزار تھی۔ تجھ سے جہاں آرا تک دِلّی آگرے کی زندگی میں شانِ سعادت تھی پھر وہ ہُوا جس نے باپ کو قید . . . .

اے نصیر الدین معاف کر دے یہ ذکر مجھے نہ لانا تھا۔ تو اچھا بیٹا تھا اور مجھے اچھا بیٹا بننے کی اُمنگ ہے۔ سن! اس گئے گزرے زمانے میں بھی ہندوستان کے مسلمانوں کے پاس سب کچھ ہے۔ نہیں ہے تو اچھا بیٹا نہیں ہے۔

اے نصیر الدین! تیرے مقبرے پر تفریح کے لئے نہیں آیا۔ چاندنی رات خوشگوار موسم کے لئے نہیں آیا۔ پھول نہیں لایا۔ آندھی ہے چبھنے والی دھوپ ہے مگر تیرے لئے دل کو ساری دنیا کے خیالوں سے خالی کر کے وہ خلوص لایا ہوں جو ظہیر الدین کے دل میں بہت تھا۔ باپ کی خاطر تو بستر مرگ سے اُٹھ بیٹھا تھا۔ باپ کی اسی محبت کی یاد میں میرے دل میں سما جا۔

اے نصیر الدین!

وقت آتا رہتا ہے جاتا رہتا ہے۔ دل نہیں بدلتے، جو دل کہ دل ہیں۔ آ اور زمانے کی قید سے آزاد ہو۔ کیا تیری ماں کبھی تجھے کلیجے سے لگا کر "نصیر" کہہ کر بھینچ لیتی تھی؟۔ کیا وہ اتنی بڑی تھی کہ ماں بننے کو ملکہ بننے پر ترجیح دیتی تھی؛ کہتی رہتی ہو گی "نصیر! میرے نصیر!!"

کہتی رہتی ہو گی

"میرے نصیر! تیرا خدا ناصر"

آسمان کے تارے یوں بنتے ہیں۔

خدا بچہ عطا کرتا ہے۔

ماں دعا دیتی ہے

باپ جان دیتا ہے

. . . .

نصیر! خدا حافظ۔

"پھندستان"

کیا واقعی کوئی دنیا ایسی ہو سکتی ہے کہ بیوی ہے تو میاں پر نثار ہے، لیڈر ہے تو ملک کی بھینٹ ہے۔ بیٹا ہے تو باپ کا فرماں بردار، خدا ہے تو بندے کا غمگسار۔ اگر ہو سکتی ہے تو دنیا کیا ہو گی، اچھی خاصی قتل گاہ ہو گی جہاں ہر کس و ناکس کا صبح و شام کا شغل یہ ہو گا کہ اور کچھ ہو نہ ہو اپنے آپ کو قتل ضرور کر لے۔ عجب نفسا نفسی کی دنیا ہو گی۔ ہر شخص اس ذلیل خود غرضی میں گرفتار ہو گا کہ سوائے اپنے اور سب کے کام آ جائے حالانکہ ع

بہت مشکل ہے مشکل میں کسی کا کام آ جانا

ان خیالات کی اُدھیڑ بُن میں تھا اور سیر کرتے کرتے ایک کھیت کے قریب پہنچ چکا تھا کہ کچھ شور سنائی دیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک مضبوط مگر ننگا جنگلی سا انسان اُچک کر ایکھ کے کھیت میں گھس گیا اور نہایت وحشیانہ طریقے سے ایکھ کو چبانے لگ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کھیت کی مالکہ جو کہ ایک معزز گائے تھی آ نکلی۔ گائے نے آتے ہی اس جنگلی کو دبوچا۔ قریب تھا کہ جنگلی بھاگ نکلے مگر ساتھ کے کھیت سے جو ایک اونٹ کی ملکیت تھا اونٹ صاحب نمودار ہوئے۔ دونوں نے مارتے مارتے پہلے تو اس جنگلی کو ادھ مؤا سا کر دیا اور پھر رسا باندھ اپنی آبادی کی طرف اس جنگلی کو لے چلے۔ محو حیرت میں بھی پیچھے پیچھے ہو لیا کہ اس تمام ماجرے کا انجام تو دیکھوں۔

گاؤں میں وہ جنگلی ایک پنچایت کے روبرو پیش کیا گیا پنچایت ایک کافی بڑی پنچایت تھی۔

گھوڑے، بیل، کُتے، مرغے، سؤر ہر جماعت کے نمائندے اس پنچایت میں شامل تھے۔ پہلے گائے نے اپنا قصہ بیان کیا۔ پھر اونٹ نے شہادت دی اور پھر پنچایت نے ایک دوسرے سے مشورہ شروع کیا۔

سؤر۔ بزرگوں سے سُنا ہے کہ یہ جنگلی کسی زمانے میں اس سرزمین میں بہت ظلم کیا کرتے تھے۔ میری رائے میں اس جنگلی کی سزا موت ہے۔ ہمیں دریافت کرنا چاہیئے کہ کیا اس جنگلی کی لاش کسی کام آسکتی ہے یہ تو مجھے پتہ ہے کہ اس جنگلی کے بد دار گوشت کو غذا کے کام میں لانا قطعی نامناسب ہے۔

گھوڑا۔ نہایت ادب سے پنچایت سے التماس ہے کہ حسب ضابطہ سزا دی جائے۔ ہمارے بزرگ فیصلہ کر چکے ہیں کہ سخت سے سخت جرم کی پاداشں میں بھی ظلم ناجائز ہے۔ ہم اس جنگلی کے بزرگوں کی طرح خونخوار نہیں۔

مُرغا۔ بجا، درست۔ مگر کب تک ہمارے خوبصورت کھیت اِن وحشیوں کی دستبرد سے محفوظ نہ ہوں گے؟

آہو۔ میری رائے یہ ہے کہ اس جنگلی کو پھاڑ کر دیکھا جائے کہ اس کے جسم کے کس حصہ میں نافہ شرارت ہے اگر ہو سکے تو ہمیں عمل جراحی سے اس تمام جماعت کو اس نافہ سے محروم کر دینا چاہیئے۔

بندر۔ جو سزا بزرگوں نے تجویز کی ہے اس میں ردّ و بدل قطعی لازمی ہے۔ بندر قوم قدرے ضعیف ہو رہی ہے کیا وجہ ہے کہ ان جنگلی لوگوں کے دماغ سے بندروں کے دماغ میں پیوند نہ لگایا جائے۔

صدر پنچایت (شیر)۔ ہماری قوم نے اپنے زمانۂ جہالت میں اس جنگلی کے چند بزرگوں کو چکھا تھا۔ میری رائے بطور ماہر یہ ہے کہ اس جنگلی کا ہر قسم کا استعمال غیر مناسب ہے۔ یہ جنگلی فطرت کی مجسم غلطی ہے اس لئے حکم ہے کہ وہی پُرانی سزا اسے دی جائے یعنی نہایت گہرے سمندر میں ہر قسم کی خشکی سے دس میل دُور اس جنگلی کو چھوڑ دیا جائے۔ پنچایت برخاست۔

پنچایت والے اِدھر اُدھر جو چلنے لگے تو محض اتفاق سے میں کتے اور بیل کے پیچھے پیچھے ہولیا

خیال یہ تھا کہ سنوں یہ لوگ کیا باتیں کرتے ہیں۔

کُتا۔ جب اس قسم کے جنگلی کا مقدمہ پیش ہو تو مجھے ضرور رنج ہوتا ہے۔

بیل۔ کیوں؛

کُتا۔ بزرگوں سے سُنا ہے کہ ہمارے ایامِ جاہلیت میں ان جنگلیوں کا کتوں سے سلوک اچھا تھا۔

بیل۔ بالکل غلط۔ محض ان جنگلیوں کی بدولت کتوں اور بیلوں میں بے انتہا مخاصمت تھی۔ تمہیں تاریخ سے مس نہیں ورنہ تمہیں ضرور پتہ ہوتا کہ محض ان جنگلیوں کے ظلم سے مجبور ہو کر شریف ترین کتے بھی ہرن اور گیدڑ کا شکار کرنے لگ گئے تھے۔ یہ جنگلی درندے نہ صرف خود خونخوار تھے بلکہ باقی جانداروں کو بھی ذلیل عادات پر مجبور کرتے تھے۔

کُتا۔ میری لاعلمی واقعی قابلِ رحم ہے مگر اس بات میں تو آپ مجھ سے ضرور متفق ہوں گے کہ ہماری پنچایت میں جب کبھی سؤر تقریر کرتا ہے تو نہایت ہی بے معنی تقریر کرتا ہے۔

بیل۔ ہاں مگر اس کا قصور نہیں۔ اس سؤر کا مورثِ اعلیٰ پھندستان کا رہنے والا تھا۔

لاحول ولا قوۃ۔ مچھلی اچھی نہ بنی ہو تو کس کس قسم کے خواب آتے ہیں۔ پھندستان! پھندستان!! پھندستان!!! شکر ہے ہماری دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں۔

میرا سخت ترین نقاد

کل ایک صاحب جن سے کچھ تکلف بھی ہے اور کافی بے تکلفی بھی ہے میرے کمرے میں آ ڈٹے اور ایسے کہ ٹلنے کا نام نہ لیں۔ دو چار مرتبہ دبی زبان سے کہا بھی کہ تمہارا وقت قیمتی ہوگا مگر وہ کب ماننے والے تھے۔ فرمانے لگے "کام تو روز ہی کرتا ہوں اور تم بھی شاید کرتے ہو مگر یہ موقع غنیمت ہے۔"

اِدھر کی اُدھر کی ہزاروں باتیں کر ڈالیں۔ بیسیوں سگرٹوں کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا اور آخر کار کہنے لگے جس مطلب کے لئے آیا تھا وہ اب بیان کرتا ہوں۔ میرے سوال پر کہ کیا یہی موقع مناسب ہے، فرمانے لگے "قطعی"۔

ناچار کہا کہ "جی ہاں ضرور۔ کیا ارشاد ہے؟"

ملاقاتی ۔"ہمایوں" کے سالگرہ نمبر کی تیاری کا وقت ہے اور مجھے ڈر ہے کہ شاید آپ پھر اُس میں کچھ اُسی قسم کے پریشان فقرے لکھ دیں گے جن سے دُنیا اُکتا چکی ہے۔

میں۔ (چونک کر) حضرت کیسے فقرے؟

ملاقاتی۔ جناب آپ کے سر پر صنفِ نازک کی پرستش کا بھوت سوار ہے۔ عورت نہ ہوئی کم بخت الف لیلہ کی داستان ہوئی کہ ختم ہونے میں نہیں آتی۔

میں۔ سنئے جنوری نمبر کے لئے یہ ایک پرانی چیز بھیجنے کا خیال کر رہا تھا۔

ملاقاتی۔ سنایئے۔

میں پڑھ کر سُناتا ہوں:-

"اے میرے اچھے سے دل! اے میرے منچلے سے دل! تُو جا! تُو جا مگر وہ آرزوئیں جن سے تجھے سجا یا تھا چھوڑ جا۔ آرزوئیں میری ہیں تیری نہیں۔ اے دل تو محض خالی کمرہ ہے۔ محض ننگی دیواریں۔ بن ڈھکی چھت اور بے فرش کی زمین۔ یہ صرف میری آرزوؤں کی بدولت تیری دیواروں پر طرح طرح کی تصویریں ہیں۔ نیچے قیمتی قالینوں کا فرش ہے۔ چھت پر گلکاری ہے اور عشق کی بجلی کی روشنی ہے۔

ہاں تو تُو جا، جہاں تُو جا رہا ہے۔ وہ مکان میرا دیکھا ہوا ہے۔ وہاں کے مکین میرے دیکھے ہوئے ہیں۔ نہیں میں تجھے سمجھا نہیں رہا۔ اچھے دل! میں اُن پرانے احمق ناصحوں میں سے ہرگز نہیں کہ تجھ پر نیک و بد واضح کروں۔ نہ تو نیک و بد کا قائل نہ میں ناصح بننے کے قابل۔ آنا جانا خوشی کا۔ قسمت آزمائی کوئی گناہ نہیں۔ جا اور شوق سے جا مگر میری آرزوئیں چھوڑ جا۔

"وہ کیا کرتی ہوگی؟" "نہیں۔ میں تیرے قصّے نہیں سنتا تو کہاں کا ایسا دلی ہے کہ رعنائی حسن کے کرشمے تجھ پر کشف ہوں؟"

اے دل! مجھ سے بحث نہ کر۔ تُو اپنا علمی سرکس رہنے دے۔ مانا کہ تیرے بیان میں فلسفے کے شیر اور مذہب کے ہاتھی لڑتے نظر آتے ہیں۔ یہ بھی مانا کہ تُو ایسا گرا پڑا نہیں کہ تیری آؤ بھگت نہ ہو مگر کہاں تُو کہاں وہ!

تُو نہیں مانتا! اچھا تُو جا، مگر میری ایک آرزو چھوڑ جا۔ کون سی آرزو؟ وہی کہ وقت اور حسن کی جنگ میں اُس کا حسن غالب نکلے۔

یہ آرزو تجھ سے لے لوں تو تُو نہ جائے گا؟ میری بلا سے۔ اے بزدل دل! میں تیری گھاتوں سے خوب واقف ہوں۔ اس کی عدالت میں تُو الو کھا بن کر پیش ہونا چاہتا ہے۔

جا تجھ میں کچھ بھی نہیں۔

ملاقاتی۔ لاحول ولاقوۃ۔ آخر اس کا مطلب؟

میں ۔ حضرت! مطلب خاک نہیں ۔ دل کو آباد کر کے اُجاڑنا میرا کھیل ہے ۔ مجھے اپنے آپ پر ڈاکا ڈالنے میں وہ لطف حاصل ہوتا ہے جو سکندرِ اعظم کو سلطنتیں زیر کر کے نہ ہُوا تھا ۔ میرے دل میں اور مجھ میں جو باتیں ہوئی ہیں وہ بجائے خود انسانی تاریخ ہیں ۔

میرے دل میں کبھی طوفِ حرم کی بھول بھلّیاں تھیں ۔ سجدوں کے شوق سے چپہ چپہ محراب تھا ۔ خطبوں کے ہُرش سے دل کے کونے کونے میں منبر تھے ۔

اور پھر جو ہوا بدلی تو دل کی وہ مسجدیں اُجڑ گئیں ۔ خدا کی بجائے قوم سر پر سوار ہوئی اور وہ وہ قوم کے ماتم ہوئے ، کبھی ترقی کے نام پر ، کبھی وفا کے نام پر اور کبھی دُنیاوی عزّ وجاہ کے نام پر کہ فرشتے جگہ تھام کر بیٹھ گئے ۔ مگر حضرت تم سے یہ قصّے کہنے فضول ہیں ۔ تم سے خدا نہ چھٹا ۔ تم اسے رٹے جاتے ہو ، تمہیں وہ کچھ نہ کچھ ضرور دے دے گا ۔ فرق تم میں اور مجھ میں بس اتنا ہے کہ تم اس سے کچھ کہنا چاہتے ہو میں اپنا آپ اُسے دینا چاہتا تھا ۔ مگر نہ میں اس کے کام کا نکلا نہ وہ میرے کام آیا اور یہ قصّہ بھی ختم ہُوا ۔

میں اب صرف قزاق ہوں ۔ جونہی دل میں کوئی خیال جاگزیں ہوتا ہُوا محسوس ہوتا ہے فوراً اس پر بالقصد ڈاکا ڈالتا ہوں اور اُسے لُوٹ کھسوٹ کے باہر کرتا ہوں ۔ معقولیت پسند ہونے سے کس قدر مجھے عار ہے !

ملاقاتی ۔ آپ کو معقول ہونے سے عار ہو یا معقولیت کو آپ سے نفرت ہو دنیا کو کیا مصیبت ہے کہ وہ یہ سب کچھ پڑھے ۔

میں ۔ تم خاک نہیں سمجھتے ۔ یہ میرا قصّہ نہیں ہر ایک کا ہے ۔ ہم سب دم بدم بدلتے رہتے ہیں صرف لوگوں کو یہ جرأت نہیں کہ اس تبدیلی کو محسوس کریں ۔

ملاقاتی ۔ قطعی غلط ۔ اگر ہم اس قدر بدلیں تو پھر پہچانے کیسے جائیں ؛ خدا کے لئے "ہمایوں" کو اس قسم کے خرافات سے محفوظ رکھیے ۔

میں۔ اچھا اسے جانے دو۔ یہ اور ایک پرانی چیز سُنو۔

ملاقاتی۔ کہو۔

میں پڑھ کر سُناتا ہوں:۔

دُنیا ہزارہا سال سے ایک ہی قسم کے بے شمار انسان پیدا کرتی چلی جا رہی ہے یعنی وہ ردّی قسم جس کی خواہش یہ ہے کہ عشق کا عیش ہو، شہرت کے ڈھول ہوں یا وہ دوسری کثیر التعداد قسم جو ہل چلا چلا کر یا نوکری ڈھوڈھو کر یا دوسروں کے فائدے کے لئے دوسروں کا کہا مان کر بے گہوارہ کی پیدائش سے، بے کفن کی موت تک کا سارا رستہ نیم برہنگی اور نیم فاقے میں طے کرلیتی ہے۔ کیا دنیا اس اپنے کرتوت سے کبھی نہ شرمائے گی؟ کاش دُنیا کے یہ پرانے سانچے ٹوٹ جائیں شکلیں نئی ہوں تو شاید عقلیں بھی کچھ طرح دار ہوں . . . . . .

ملاقاتی۔ (کانوں میں انگلیاں دے کر) خدا کے لئے اس کو بند کرو۔ حضرت کیا آپ کو جنون ہے کہ آپ دُنیا غریب کے پیچھے یوں لاٹھی لئے پھرتے ہیں۔

میں۔ اچھا ایک علمی مضمون سنو۔

ملاقاتی۔ بہتر سناؤ۔

میں پڑھ کر سناتا ہوں:۔

اخلاق کی اقلیدس

بسم اللہ الحکیم والجبار والقہار

جن لوگوں کی اردو کو پنجابی سے پردہ ہے اُن کی اطلاع کے لئے صرف اس قدر گزارش ہے کہ جس پنجابی سکول میں اینجانب نے اقلیدس کو دماغی ستیاناسی کی اجازت دی وہاں کے ریاضی

کے مدرّس کے طریقِ تعلیم سے ہم نے یہی نتیجہ نکالا کہ مسماۃ اقلیدس میاں الجبرا کی گھر والی ہے اور اسی دن سے ہمارے ذہن میں اقلیدس کا شمار صیغۂ مؤنث میں ہے۔ یہ تو ہمیں برسوں بعد پتا چلا کہ یوکلڈ ایک یونانی مرد کا نام تھا۔ مگر ہماری بلا سے اگر عرب والے یوکلڈ کو اقلیدس کر سکتے ہیں تو پنجاب والے اسی بھوت کو بھتنی سمجھ لیں تو کیا گناہ!

آمدم بر سرِ مطلب

"اقلیدس نقطے سے شروع ہوتی ہے اور نقطے کی قطعی صحیح تعریف یہ ہے کہ نقطہ وہ چیز ہے جو سمجھ میں آئے مگر موجود نہ ہو اسی طرح خطِ مستقیم کی اقلیدس میں صحیح تعریف یہ ہے کہ خطِ مستقیم کسی نقطے کا وہ نقشِ پا ہے جب کہ وہ نقطہ سفر کرتا ہوا ادھر اُدھر نہ بھٹکے۔ دائرہ کی تعریف یہ ہے کہ دائرہ اس مجبور نقطہ کا نقشِ پا ہے جو لاکھ چکّر کھائے مگر ایک اور نقطے سے جس کا نام مرکز ہے مساوی فاصلے پر رہے۔ ان تین تعریفوں پر تمام اقلیدس کا دارومدار ہے۔ جب یہ تین تعریفیں ہماری سمجھ میں آگئیں تو کمبخت اقلیدس نے بیسیوں اور باتیں ہمارے دماغ میں ٹھونس دیں یعنی یہ کہ مثلث کے تین زاویے ہر حالت میں دو قائم الزاویوں کے برابر ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

چونکہ اخلاقیات سے ہمیں خاص شغف ہے اس لئے ہم اسے اقلیدس کے طریقے پر مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ جسے ہماری تعریفوں یا نتائج سے اتفاق نہ ہو وہ اگر نیم کافر نہیں تو کج بحث ضرور ہوگا۔

اخلاق کی ابتدا زندگی سے ہے، جہاں زندگی نہیں وہاں اخلاق ناممکن۔ گویا اخلاقیات میں زندگی کا وہی پایہ ہے جو اقلیدس میں نقطے کا۔ مگر اقلیدس کے نقطے کے برعکس زندگی وہ چیز ہے جو موجود ہے مگر سمجھ میں نہیں آتی۔ اسی طرح صراطِ مستقیم زندگی کا وہ نقشِ پا ہے جس کی نسبت یہ کہا جا سکے کہ جو جتنا بھٹکے اسی قدر راہِ راست پر ہو۔ مثال کے طور پر عرب کی تاریخ پر غور کر لیجئے۔ جب عرب والے فسق و فجور و جہالت و ظلم کے رستوں پر بے حد بھٹک چکے تو وہاں رحمتِ الٰہی سے ایسا پیغمبر نازل ہوا کہ تمام دنیا کو اس کی

ذات پر ہمیشہ کے لئے فخر کرنا واجب ہے۔ عربوں کے لئے بھٹکنا ہی صراطِ مستقیم تھا۔ اگر وہ کم بھٹکتے تو انہیں یہ فخر نہ حاصل ہوتا۔ بھٹکتے بھٹکتے انہوں نے اس شاندار کمال کو حاصل کر لیا جس کے لئے زوال ناممکن ہے۔ اسی بات کا ایک نفی کا پہلو بھی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں ایک شخص اورنگ زیب کا ذکر ہے۔ اس شخص کی نسبت یہ امر مسلم ہے کہ اسے تمام عمر ذرا سی غلطی کرنے کی جرأت نہ ہوئی نتیجہ یہ ہؤا کہ اور تو اور تمام عمر باوجود "زندہ پیر" ہونے کے اسے ایک بھی سچا دوست نہ ملا "آہ از مرد ماں کار!" چلا تا چلا تا مر گیا۔ نہ وہ بھٹکا نہ اُس نے کچھ پایا +

اخلاقیات میں دائرے کی تعریف سخت مشکل ہے اگر ناممکن نہیں۔ تمام اخلاق کا مرکز گناہ ہے۔ زندگی کا نقطہ تبھی ایک مکمل دائرہ تیار کر سکتا ہے جب گناہ سے ہر وقت مساوی فاصلہ رکھنے کی طاقت اس میں موجود ہو۔ جہاں گناہ سے نفرت ہوئی اور زندگی بہک کر کسی ایک طرف چلی وہیں دائرہ ٹوٹا۔ اور جب کسی دائرے میں ذرا سی بھی شکن آ گئی تو یہ یقینی ہے کہ کوئی طاقت اسے دائرہ نہیں بنا سکتی۔ گویا گناہ کی طرف برابر کھینچتے رہنے پر برابر کامیابی کا مدار ہے۔

ملاقاتی۔ (بے حد طیش سے) ایسی مضمون نگاری پر ہزار لعنت (غصہ میں آکر اُٹھ بیٹھتا ہے)

میں۔ حضرت تشریف رکھیئے۔

ملاقاتی۔ کیا تمہیں عشقِ حقیقی سے ذرا بھی مس نہیں؟

میں۔ عشقِ حقیقی سے تو کوسوں بھاگتا ہوں۔

ملاقاتی۔ وہ کیوں؟

میں۔ لمبی بات ہے سنو تو کہوں۔

ملاقاتی۔ کہیئے۔

میں۔ انگریزی عقیدہ یہ ہے کہ دنیا میں بدترین چیز وعظ ہے اور یہ کہنا بھی وعظ ہے۔ چنانچہ اسی لئے انگریز

وعظ سُن لیتے ہیں مگر ایسی طرح کہ اِس کان سے سُنا اُس کان سے نکالا۔ انگریز عام طور پر پسند یہ کرتے ہیں کہ ان کا پادری وعظ اچھا کہے یا بُرا یا نہ کہے مگر مستعد ضرور ہو۔ چند ہی دن کا ذکر ہے کہ ایک مشہور پادری کی نسبت فخریہ اخباروں میں لکھا گیا تھا کہ وہ Muscular christianity (یعنی پہلوانی عیسائیت) کا نہایت شاندار نمونہ تھا۔

ایک پادری سے جب اس کی چلبلی بیٹی نے کہہ ہی دیا کہ" ابا آج کا آپ کا وعظ تو خوب رہا" تو پادری صاحب نہایت بے تکلفی سے فرمانے لگے کہ" بیٹی ہمیشہ چھ پنس میں خرید تا تھا اس پر پورے ڈھائی شلنگ صرف کر ڈالے۔ کیا کرتا چندہ بھی تو جمع کرنا تھا۔" یہ ہے انگریزی قوم کی موقع شناسی کا ادنٰے ثبوت۔

جس طرح انگریزی قوم کا یہ یقین ہے کہ وعظ (Preaching) دنیا کی بدترین حرکت ہے (چنانچہ وہ اُس نظم یا ناول کو بھی چنداں پسند نہیں کرتے جس میں وعظ ہو) اسی طرح اس قوم کا یہ بھی مسلک ہے کہ دُنیا کی بہترین چیز عشق ہے۔ ان کے نزدیک خدا خود عشق ہے اور وہ اس شوق میں اس قدر ماہر ہیں کہ اُنہوں نے عشق کی تمام قسموں کو سر سے پاؤں تک چھان ڈالا ہے۔ عشق ان کی کتابوں میں بالکل اس ترتیب سے مقفل موجود اور محفوظ ہے جیسے ہسپتالوں میں ٹکٹ لگی ہوئی مختلف قسم کے زہر کی بوتلیں جس شخص کو جتنا عشق اور جس قسم کا عشق درکار ہو اسے اتنی ہی بوندیں (دن میں تین دفعہ کھانے کے بعد) دستیاب ہو سکتی ہیں۔ اس مفہوم کو واضح کرنے کے لئے مناسب یہ ہے کہ عشق کی چند مشہور قسمیں گنوا دی جائیں مثلاً اول عشقِ حقیقی۔ انگریزی اخلاقی فرا بادین میں عشقِ حقیقی وہ ہے جس کا پول نہ کھلا ہو۔ اب اس کے نمونے ملاحظہ ہوں:۔

(۱) کسی بڑے مشہور انسان کا عشق اپنے بڑے خدا کے ساتھ یا اپنی چھوٹی بکری کے ساتھ۔ دُنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے مگر اس میں فرق نہ آئے کہ آسمان پر خدا زمین پر بکری۔ خدا بکری کو پالتا ہے بکری

انسان کو پالتی ہے۔ انسان اپنی ضد کو پالتا ہے۔

(ب) کسی سفید گورنمنٹ کا عشق اپنی سیاہ پولیس سے۔ دُنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے مگر اس میں فرق نہ آئے کہ اوپر گورنمنٹ نیچے پولیس۔ گورنمنٹ پولیس کو پالتی ہے۔ پولیس داروغہ جیل کو پالتی ہے۔ داروغہ جیل جرم پالتا ہے۔

(ج) کسی وفادار مولانا کا اپنی مفقود الخبر خلافت سے عشق۔ دُنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے مگر اس میں فرق نہ آئے کہ . . . .

ملاقاتی غصہ سے لال پیلا، میری طرف جھپٹنے کو تھا کہ میں ایک طرف ہٹ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میرے ڈریسنگ روم میں داخل ہو کر ان حضرت نے میرا اچھے سے اچھا سوٹ پہنا بہتر سے بہتر میری نکٹائی ڈانٹی اور میری نئی چھڑی ہاتھ میں لے یہ جا وہ جا۔ پھر تو کمرے میں نہ میں تھا نہ وہ تھا۔ مگر واللہ باللہ یہ باتیں ضرور ہوئیں۔

نالدیرہ

شملے سے مشوبرہ ، مشوبرے سے نالدیرہ کسی زمانہ میں کافی کٹھن منزل تھی۔ موٹر نے (جسے شملہ میں میسر ہوسکے) اس کٹھن گھاٹی کو کھیل بنا دیا ہے۔

مشوبرے داخل ہوتے ہی وہ خوشنما باغیچے نظر آتے ہیں جن پر جا بجا شد و مد سے اعلان ہے ، "Private Grounds" بعض دلفریب کونوں پر جلی حروف سے پک نک (Pic Nic) کرنے والوں کو قانونی دھمکیاں ہیں۔ اف رے غرورِ ملکیت ! زر ہو کہ زمین ہو کہ زن ہو مالک پھولا نہیں سماتا "میری چیز ہے ، خبردار کوئی ہاتھ نہ لگائے" ، یہ ہے شخصی ملکیت کا آئین و مذہب۔ Private Grounds کے ناپرائیویٹ حسن سے مسحور نالدیرہ کی طرف انسان بڑھا چلا جاتا ہے۔ رستے میں ایک خطّہ ہے جہاں خزاں کی ملکہ نے سبز پتوں سے زمردی وردی اُتروا کر سنہری اور ارغوانی وردی کی شان دکھائی ہے۔ ہائے خزاں کی بہار ! انسان دیکھتے کا دیکھتا رہ جائے۔ خدا سمجھے ان جفا پیشہ ادیبوں سے جو محض زورِ قلم سے خزاں جیسی پری کو بدنام کرتے ہیں۔ میں خزاں کو کبھی بُرا نہیں کہتا۔ اس جادو کی ملکہ کا میرے سر احسان ہے۔ سیاہی لے گئی ہے سفیدی دے گئی ہے۔ لوہے کے بدلے چاندی۔

موٹر جوں جوں آگے بڑھتی ہے خوف کے مارے دل میں دعائیں یوں چمکتی ہیں جیسے ریت میں ذرّے ! تنگ سڑک جب کسی منکڑ پر بائیں ہاتھ کو اوجھل ہو جاتی ہے اور سامنے ایک عمیق کھڈ منہ پھیلائے موٹر کو ہڑپ کرنے کے لئے تیار دکھائی دیتا ہے تو خواہ مخواہ منہ سے نکلتا ہے "آہستہ ، روکو" جو ذرا اس سے بھی زیادہ دل کو دہلانے والا موقع ہو یعنی سڑک تنگ ہو ، پہاڑ بائیں ہاتھ ہو اور نا دائیں

طرف کھڈ کی جانب ہو اور عین وہیں کھڈ کی طرف نہ جنگلا نہ پتھر کی دیوار اور ہو باریک سا کونا تو زبان کہے یا نہ کہے دل کہتا ہے

"اے خدا بچانا"

دعا کی ایجاد غالباً کشتی کے سفر سے ہوئی۔ کشتی کھینتے وقت ہر ناخدا خدا کو یاد کرتا ہے۔ جو زیادہ خوش عقیدہ ہیں وہ پیر دستگیر کا نام لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جب تک سفر ہے اور سفر ہے دعا زبانوں سے مٹ جائے تو مٹ جائے دلوں میں ضرور گونجتی رہے گی۔

نالدیرہ آ گیا۔ بنگلہ پہاڑ کے پہلو میں ہے۔ مختصر سا ٹیلا ہے۔ درخت البتہ شاندار ہیں اور خصوصیت یہ ہے کہ پتھر کہیں نظر نہیں آتا۔ درختوں کے نیچے ہری ہری دوب کی عجب بہار ہے۔ چوٹی پر ایک دوسرے سے ملے ہوئے کئی تنگ کئی فراخ ناہموار سے مرغزار ہیں۔ پانی نہیں ہے ورنہ یہ خیال ہوتا کہ قدرت شالامار بناتے بناتے کسی اور کام میں لگ گئی۔ علاوہ ڈاک بنگلے کے ایک چھوٹا سا خوشنما Pavilian ہے۔ انگریزوں نے یہاں Golf course بنایا ہے شوخ وشنگ میں بانکے بانکے گھوڑوں پر سوار شملہ سے اڑتی ہیں یہاں آنکلتی ہیں۔ کھیلتی ہیں کھاتی ہیں۔ حسینوں کی شوخی کے لئے نالدیرہ مقناطیس ہے۔

میں نالدیرے کیوں آنکلا؟ دنیا میں دو چیزیں عنقا ہیں، ایک تنہائی دوسرے خموشی۔ ان کی تلاش میں موٹر، نوکر نیچے رہ گئے۔ میں اس فراخ چوٹی کی سیر میں مصروف ہوا۔ ایک پہاڑی لڑکا آنکلا۔ مجھے اور موٹر کو دیکھ کر آیا۔ غالباً وہ Golf کھیلنے والوں کے ساتھ Gaddy کا کام کرتا ہوگا۔ اسے ایک دونی دی اور کہا کہ بھاگو وہ چلا گیا۔ تنہائی تھی مگر خموشی نہ تھی۔ پہاڑی کوّے چلّا چلّا کر چیختے تو کمبخت جھینگر اپنی نہ تھمنے والی سیٹی شروع کر دیتا۔ خدا خدا کر کے دو ثانیے کامل خموشی نصیب ہوئی۔ کان جب مایوس ہو گئے تو آنکھوں کی باری آئی۔ دُور بہت دُور سر بفلک برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ نظر آئے۔ برف سے لدے پھندے

پہاڑوں پر پھرا ہوں ۔ برسوں سے دیکھنے کا عادی ہوں مگر یہ نظارہ کچھ اور تھا ۔ ابر کا نام ونشان نہ تھا ۔ سورج کی شعاعیں اپنی پوری طاقت سے برف کو سیماب بنا رہی تھیں ۔ برف پوری دلی محبت سے ان شعاعوں کو سمیٹ رہی تھی پھیلا رہی تھی ۔ دنگ رہ گیا ۔ خدا جانے فطرت نے کیوں یہ کئی سو میل لمبا تین میل بلند شاندار بجلی کے لیمپوں کو مات کرنے والا لیمپ دن کے وقت روشن کر رکھا تھا ۔ کیا فطرت کو بھی عشق کا مرض ہے ؛ کہاں آفتاب کہاں برف مگر فطرت ان دونوں کا عقد کر کے مزہ لے رہی ہے ۔

جن لوگوں کو پہاڑوں سے عشق ہے وہ آبادیوں سے بھاگتے ہیں اور ہونا بھی یوں ہی چاہئے ۔ آبادیوں کے رہنے والے زمین کے شیدائی ۔ ان میں جو سب سے بڑا وہ سب سے بڑا زمیندار ۔ پہاڑ زمین سے باغی ۔ آبادیوں میں رہنے والے ترتیب کے متوالے ۔ اُن کے ہر بات کے متعلق قاعدے ہیں ۔ سڑکیں سیدھی گھر چوکونے ، کمرے گول ، چارپائیاں مستطیل ۔ پہاڑ بے ترتیبی کی زندہ تصویر ، اونچے ، نیچے ، ٹیڑھے ، کہیں پتھر کہیں پھول کہیں بے پھل کے درخت اور کہیں بے پانی کی ندی ۔

اے باغی پہاڑو ! تمہارے طفیل نالدیرے میں مجھ سے دو نیک کام ہوئے ایک یہ کہ بنگلہ میں قلم نہ رکھا اور دوسرا یہ کہ نالدیرے کی چوٹی پر سگرٹ نہ جلایا ۔ اس لطیف پاکیزہ ہوا کو سگرٹ کے دھوئیں سے زخمی کرنا میری حسن پرست طبیعت کے لئے قتل سے بدتر جرم تھا ۔ آبادیوں میں جہاں ہوا کثیف ہے اور دل پتھر ہیں کافی سگرٹ جلاتا ہوں ۔ نالدیرے میں نہ سگرٹ جلایا نہ خود جلا ۔ زمین سے دور تھا آسمان کے قریب تھا ۔

ایک تصویر

مصوّر۔ کیا تم بہت مصروف ہو؟

شریر۔ نہیں، کیا کوئی نئی تصویر دکھانا چاہتے ہو؟

مصوّر۔ ایک نہیں دس مگر شرط یہ ہے کہ تم کسی سے ذکر نہ کرنا۔

شریر۔ یہ کیوں؟

مصوّر۔ یہ دس تصویریں میری تمام زندگی کا شاہکار ہی نہیں میری زندگی ہیں۔ جن تصویروں کو فروخت کرکے روزی کماتا ہوں وہ نقلی ہیں یہ اصلی ہیں۔ میری مشہور تصویریں اندھوں کے لئے ہیں۔ میری یہ تصویریں جواب تمہیں دکھاؤں گا صرف ان کے لئے ہیں جن کی آنکھیں سطح سے نیچے کی چیزیں دیکھ سکتی ہیں۔

شریر۔ تصویر کو سطح کے نیچے سے کیا تعلق؟

مصوّر۔ یہی تو بات ہے۔ یہ تصویریں کسی شخص کی نہیں، کسی مکان کی نہیں، کسی باغ کی نہیں شخص، مکان باغ سب کچھ ان تصویروں میں موجود ہے مگر مکان یا باغ کی حیثیت سے نہیں۔ یہ تصویریں وقت کی تصویریں ہیں۔ دُنیا میں کوئی نہیں جو وقت کو دیکھ سکے۔ مگر میرا دعوےٰ ہے کہ میں نہ صرف وقت کو دیکھ سکتا ہوں بلکہ اوروں کو بھی دکھا سکتا ہوں۔ آؤ اب تصویریں دیکھو۔

(دونوں اندر ایک کمرے میں جاتے ہیں)

کمرہ بالکل تاریک ہے۔ مصوّر کے پاس ایک بجلی کی مشعل (Torch) ہے۔ اس کی روشنی زمین

پر پاؤں کے آگے آگے پڑتی جاتی ہے۔ یک لخت مصوّر ایک طرف مُڑ کر مشعل کی روشنی بند کر دیتا ہے۔

مصوّر۔ لو اب پہلی تصویر تمہیں دکھاتا ہوں۔

(مصور ایک پردہ ہٹا کر ایک تصویر والے چوکھٹے پر روشنی ڈالتا ہے)

شہریار۔ اف، غضب، ستم۔ یہ وقت کس پر گزرا؟

مصوّر۔ ایک حسین عورت پر جس کا شوہر مالدار تھا۔

شہریار۔ کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ حسن اور دولت نے اس عورت کو یوں مقیّد کر لیا جیسے پنجرے میں کوئی طوطا ہو اور "میاں مٹھو" "میاں مٹھو" کہتا کہتا اسی پنجرے میں مرجائے یعنی انسان سے یہ عورت طوطا بن گئی؛ کس قدر تم بے رحم ہو۔

مصوّر۔ بے رحم ضرور ہوں مگر کس قدر سچا ہوں اور تم نے ابھی پورا مطلب نہیں سمجھا۔ ذرا اور غور سے دیکھو۔

شہریار۔ ہاں سچ کہتے ہو۔ یہ حسن و دولت کی قید نہیں بلکہ ان سے سخت تر قید ہے۔ سب سے کڑی زنجیر ایک مقررہ طرزِ زندگی ہے یعنی مقرّرہ معمول کہ نوکروں سے کام لیا جا رہا ہے۔ کھانے پر مہمان آ رہے ہیں، کہیں جا رہے ہیں، کسی کو بُلا رہے ہیں۔ عزت کی آرزو ہے، دولت کے کم ہونے کا ڈر ہے اُف ظالم یہ خیال تمہیں کیسے آیا کہ مقرّرہ معمول روحِ انسانی کو کچا کھا جانے والی ڈائن ہے؛

مصوّر۔ یہ نہ پوچھو۔ ابھی تم تصویر کو ذرا اور غور سے دیکھو۔

شہریار۔ دیکھا، خوب دیکھا، او بے رحم ظالم خدا کے لئے اس تصویر کو پھاڑ۔ میں تو چند منٹ اگر اور دیکھوں گا (حالانکہ کافی سنگدل ہوں) تو پاگل ہو جاؤں گا۔ یہی مطلب ہے نا کہ چالیس سال کا ایک مقرّرہ معمول اور وہی ایک گھر اور تھوڑی سی ردّ و بدل سے وہی ایک فرنیچر؛

مصوّر۔ ہاں کسی حد تک تم سمجھ چلے ہو کہ اس معمول کی باقاعدگی، اور ایک مکان کے روز انہ تواردسے روحِ انسانی میں کیا تنزّل پیدا ہوتا ہے مگر ذرا اور دیکھو۔

شہریار۔ دیکھ رہا ہوں۔ چالیس سال تک وہی دولت، وہی نوکر، وہی مکان، وہی مقررہ روز کی نشست و برخاست، وہی اکل و شرب، وہی پرانے دقیانوسی قہقہے، ارے ارے غضب۔ اب سمجھ میں آیا اور وہی ایک شوہر۔ اف اف میں بھاگتا ہوں۔ یہ تصویر نہیں بلا ہے۔ یہ وقت نہیں جام مرگ ہے۔

مصوّر۔ تم نے دیکھا کہ یہ کیوں ہے؟

شہریار۔ خوب دیکھا۔ سب اس لئے کہ اس گھر میں بچہ نہیں ہے۔

مصوّر۔ آؤ اور دیکھو۔

شہریار۔ نہیں دوست، معاف کرو۔ مجھ میں دل گردہ نہیں ہے کہ تمہاری اصلی تصویریں دیکھوں۔
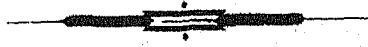
راگ کا جادو

گانا ہو رہا تھا یعنی سروں کا وہ لیا جو گول کمروں میں نکیلی شکلیں رسیلے نینوں کی مدد سے تیار کرنے میں ماہر ہیں پک رہا تھا۔ یوں تو آواز بھی تھی، ساز بھی تھا مگر راگ کچھ ایسی گہری نیند سو یا تھا کہ بیدار نہ ہوا پر نہ ہوا اور پھر..........

جس طرح کسی رشکِ گل کی آمد سے مجلس کا رنگ بدل جاتا ہے یعنی باچھیں کھلتی ہیں قہقہے اڑتے ہیں، فقروں میں شعریت اور آنکھوں میں تبسم رواں ہوتا ہے اسی طرح مسز مکرجی (یہ نام اصلی ہے) کے دو بول ابھی ہوئے ہی تھے کہ محفل بدل گئی جو جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ گر سر تھے کہ جھوم رہے تھے، دل تھے کہ تڑپ رہے تھے۔

اصرار میں، بالخصوص غیر ضروری پرتکلف اصرار میں اہلِ ہند ماہر ہیں مگر واہ رے راگ کے جادو! دیر تک کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ مسز مکرجی سے "ایک اور" کی فرمائش کرتا۔ اور واہ رے راگ کے جادو! وہ عورتیں جن کی زبان پل بھر کے لئے برسوں سے نہ تھمی تھی وہ بھی دم بخود تھیں۔

سحرِ بنگالہ کا یہ اُلٹا اثر ہوا کہ میں ہند میں بیٹھا تھا پیرس پہنچا۔ آنکھوں کے سامنے وہ تمام سین پھر گیا جب پیرس کی ایک مشہور فتنہ زا تنہا سٹیج پر گا رہی تھی اور چار ہزار سامعین

"سر خود نہادہ بر کف"

دنگ تھے۔

دریائے لطف

مغربی اور مشرقی تہذیب میں جو فرق ہے وہ قطعی ایک لفظ میں بیان کیا جا سکتا ہے یعنی اُس قسم کا ایک لفظ نہیں جو پادری صاحبان کے وعظ کے خاتمے پر یوں شروع ہوتا ہے۔

"ایک آخری لفظ۔ دنیا و مافیہا کی ذمہ داریوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے قومی بہبودی کے زریں اصُول کو نہ ہمارے بزرگوں نے بھلایا ہے نہ ہمیں بھلانا چاہئے"۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایک آخری لفظ کئی صفحوں پر دراز ہوتا ہے سننے والے انگڑائیاں لیتے ہیں کہ خدا کرے کہ اس ایک آخری لفظ کی جان نکلے اور ہم چندہ دے کر گھر کو سدھائیں۔

سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ جہاں اور بہت کچھ لکھ گئے ہیں اس ایک لفظ کو بھی استعمال کر گئے ہیں وہ لفظ

لُطف

ہے اور سعدی جیسا ناصح ضد کرتا ہے کہ ؎

لطف کن لطف، کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

اہلِ چین نے تو اس پر یہاں تک عمل کیا کہ مخاطب کے جوتے کا ذکر کرنا مقصود ہو تو اس سے کم نہ کہتے تھے کہ "آنجناب کا آنریبل بوٗٹ" اور اپنے گھر کو بدیں الفاظ یاد کرتے تھے کہ اس ذرّہ بے مقدار اور ہیچ ابن ہیچ کی تنگ شہر جھونپڑی یعنی مخاطب کے جوتے اور بولنے والے کے گھر کا نقشہ غالب مرحوم کے اس شعر میں کھینچا ہے

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

کیا جوتا ہوگا کیا گھر ہوگا مگر "لطف" میں شک نہیں۔ یہ لطف اہلِ مغرب کو نصیب نہیں۔

کاغذاتِ مال کی بعض اصطلاحیں نہایت پُر لطف ہیں۔ یورپ والوں کے ہاں کسی جدول کا کوئی خانہ

خالی ہو تو اُسے (Blank) لکھ دیتے ہیں۔ اس قدر کم بخت اکھڑ ہیں کہ (Blank) کو (Blank) ہی لکھتے ہیں۔ ایشیائی ایسا اکھڑ کیوں ہونے لگا کہ خالی کو خالی لکھے یا کہے۔ چنانچہ کاغذاتِ مال میں اگر کوئی خانہ خالی ہو تو اس میں لفظ "معمور" لکھا جاتا ہے۔ ایسے خانوں کی ہستی نیستی سے آباد ہوتی ہے۔ لطف ہُوا نا کہ خلا کو آباد کر دیا۔ اسی طرح غیر آباد دیہہ کو محض بے مذاقی سے "غیر آباد" نہیں لکھا جاتا بلکہ مقررہ اصطلاح ہے کہ "بے چراغ" لکھا جائے۔ اس "لطف" میں شاعری بھی ہے۔ لاہور کا میلہ چراغاں مشہور ہے۔ ایک شاعر کا مصرعہ

"اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

زندۂ جاوید ہے اور مرزا غالب کا مصرعہ:۔

"جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کئے ہوئے"

تو بجائے خود ایک نہ مٹنے والا ہنگامہ ہے اگر پٹواری کا کسی گاؤں کو "بے چراغ" کہنا اور لکھنا ایشیائی تہذیب "لطف" کا کمال ہے۔ نہ انسان ہوں گے نہ چراغ جلیں گے مگر یہ نہیں کہا کہ گاؤں میں باشندے نہیں۔

اس قسم کے لُطف کی کوئی حد نہیں۔ ایشیا میں کبھی کوئی بیمار ہی نہیں ہوتا ہمیشہ دشمنوں کی طبیعت علیل رہتی ہے۔ ہر قسم کے حوادث نصیبِ اعدا ہوتے ہیں کبھی کسی قسم کا گھاٹا نہیں ہوتا "دل گیا ہاتھ سے لوگوں نے کہا دل آیا"۔

زندگی کے ہر شعبے میں اس لطف کا ظہور ہے۔ اولاد کو والدین کا سایہ عزیز ہے۔ ماتحت کے لئے افسر "حضور" "خداوند" سے کم نہیں۔ بادشاہ "جہاں پناہ ظلِّ الٰہی" ہے۔ درزی "خلیفہ" ہے۔ حجام "راجہ" ہے۔ بھنگی "مہتر" ہے۔

اس لطف کی داستان طویل ہے ایشیائی زندگی قلیل ہے۔ کاش ہمارے بزرگ اس لطف کے سمندر کے علاوہ کچھ اور بھی چھوڑ جاتے۔ فارسی میں "دریا" سمندر کو کہتے ہیں اور فلک پیما سعدی کے اس شعر پر اس تحریر کو ختم کرتا ہے ؎

بہ دریا در منافع بے شمار است — وگر خواہی سلامت بر کنار است

بلبلہ ہے پانی کا

کیا بُلبلے کا ماضی کیا اس کا مستقبل مگر پانی میں بُلبلے بنتے رہتے ہیں ٹوٹتے رہتے ہیں بعض فوراً ٹوٹ جاتے ہیں بعض کچھ دیر تیز سے تیز لہر پر سواری کا لُطف اُٹھاتے ہیں، سورج کی کرنوں کا رنگین جام بنتے ہیں دیکھنے والی نگاہوں کے لئے مقناطیس بن کر شاعری کرتے ہیں اور یہ سلسلہ جب تک کہ پانی ہے، سورج ہے اور نگاہیں ہیں غیر فانی ہے۔ دُنیا میں بُلبلوں کا کال نہ ہُوا ہے نہ ہوگا۔

خود پانی کو کچھ علم نہیں۔ مطلقاً پروا نہیں کہ کتنے بُلبلے بنے، کہاں بنے اور کیسے رہے، کتنی دور چلے اور کیونکر مٹے مگر بلبلہ مجبور ہے کہ یہ سمجھے کہ یہ دریا اس کے لئے بنایا گیا ہے۔ اس سرنگوں تہی مغز کی زندگی کے سحر کا مدار اسی اُلٹی سمجھ پر ہے۔ اس اُلٹی سمجھ، اس تاریک روشنئ طبع، اس بلا کا ترجمان بننے کی ہوس بھی اسی بُلبلے میں ہے۔

ہاں تو اے اپنے آپ کو معیار مقرر کر کے سمندروں اور آسمانوں کو ناپ ڈالنے والے بُلبلے سُن! تیری غلطیوں پر، تیری اُلٹی سمجھ پر ہزار راستی نثار ہے۔ تو دنیا کی آنکھ ہے، تو نہ ہو تو دنیا اندھی بانجھ ہے اور کیوں تو یہ سب کچھ نہ ہو؟ کیا یہ مسلمہ نہیں کہ ہر راستی کا مورث اعلےٰ کوئی نہ کوئی بہتان ہے۔ اے بُلبلے! تو خود اپنے آپ پر بہتان ہے اور یہی تیری شان ہے۔

سُن! سرنگوں تہی مغزوں کی ذاتیں گن۔ ایک ذات وہ ہے جسے جوگن کہتے ہیں۔ جوانی میں حسین اور اگر اصلی ہو نقلی نہ ہو تو بڑھاپے میں بھی حسین اور خوش ادا۔ اس بُلبلے کو راکھ سے اور راگ سے پیار ہے۔ جو اسے چاہے وہ پہلے راکھ بنے پھر اچھے راگ کی طرح خاموشی میں ختم ہو جائے۔ یہ بُلبلہ اب کمیاب ہے۔

وہ دریا نہیں بہتے جن میں یہ بُلبلہ بنتا تھا، بہتا تھا اور ٹوٹتا تھا۔ ایک ذات وہ ہے جیسے ہیلن رہومر کے یونان والی (Helen) کہتے ہیں۔ یہ ہمہ تن تبسم بلبلہ اب عام ہے۔ گھر گھر اس رانی کا راج ہے یہ بُلبلہ بھی مٹتا رہتا ہے مگر یہ ذات مٹائے نہیں مٹتی۔ سمندر میں، دریا میں، ندی میں، موری میں سب جگہ اس ذات کا زور ہے۔ جو نہیں ہیں وہ بھی ہیلن بننا چاہتے ہیں۔ نازک بُلبلوں کی طرح بڑے بُلبلوں میں بھی ایک ذات بُدھ ہے اور ایک ذات بائرن۔ آج کل بُدھ کمیاب ہیں بائرن ٹکے سیر بکتے ہیں۔

اے بُلبلے! تو اپنی ذاتیں نہیں گنواتا؟ تیری خوشی مگر ابھی تو اور بہت تھیں مثلاً چنگیز، ملک التجار، ڈاکو، پیر، درندے، حاکم، سانپ، ایڈیٹر۔ یہ ذاتوں کا قصہ چھوڑا تیرے رنگ بھی چھوڑے مگر تیری رنگ رلیاں کیسے محو ہوں۔ اے بُلبلے! بیزار نہ ہو۔ تُو ہزار بُرا ہو مگر اپنے دریا سے بہتر ہے کیونکہ تجھے کہانی کہنے اور سننے کا شوق ہے۔ لے ایک ہلکے سے بُلبلے کی سوانحعمری سُن۔ خود اپنے خط میں لکھتا ہے:۔

"پیاری!

مجھے آزادمنش کے لئے ہر وقت زندہ رہنا بھی اِک گونہ مجبوری ہے اس لئے کبھی کبھی مَیں مر بھی جاتا ہوں یعنی جان بوجھ کر تجھے یاد نہیں کرتا، تیرا خیال نہیں کرتا اور وہ کرتا ہوں جو تجھے ناپسند ہے۔ یہ میرا مردہ بے انتہا خوار ہوتا ہے عقل کی باتیں کرتا ہے دُوراندیشی کے سوانگ بھرتا ہے، لوگوں کو نیک مشورے کبھی قومی خدمت کے، کبھی علمی وقار کے کچھ تحریروں میں کچھ تقریروں میں پیش کرتا رہتا ہے۔ اگر اس حالتِ مرگ کی سوانح نگاری شروع کر دوں تو تُو سمجھے کہ روزانہ اخبار ہے۔ قصہ مختصر اس میرے مُردے سے وہ وہ کام ہوتے ہیں جن کا ہر مسلمان کو دعوےٰ ہے اور کسی مسلمان کو توفیق نہیں مگر پیاری جب ہم اور تم دونوں ہوتے ہیں تو یہ دقیانوسی دُنیا ایک نرالی دُنیا بن جاتی ہے۔ تم نئی سے نئی بات کہتی ہو میں پُرانی سے پُرانی ہاں ملا دیتا ہوں۔ تم کہتی ہو کہ love ہے (محبت)

بیہودگی ہے میں کہتا ہوں کہ اس میں کیا شک ہے۔ تم کہتی ہو کہ مذہب ایک قطعی غیر ضروری وبال ہے میں کہتا ہوں کہ مذہب ایک ضروری وبا ہے۔ اگر دُنیا میں ایک ہی خدا کو پوجنے والے ایک دوسرے کے لہو سے یوں ہاتھ نہ رنگتے تو ہم بُرا کسے کہتے شکر کرو کہ ابھی تک مذہب کا سرکس چل رہا ہے۔ جب تم چُپ ہوتی ہو تو تمہیں چھیڑنے کے لئے وہی پرانی بات کہہ دیتا ہوں کہ اگر قدرت سے جُوا کھیلنا ہے اور اسے ہرانا ہے تو صبح سویرے اُٹھو اور نماز پڑھو۔ نماز تمہاری جبلی کمزوری ہے۔ نہ مانتے ہوئے بیسیوں پڑھ ڈالتی ہو۔ جب تمہاری طبیعت حاضر ہوتی ہے تو تم کہتی ہو کہ شیطان کو نماز کا حامی اب پہلی دفعہ پایا۔ میں کہہ دیتا ہوں کہ پیاری یہی تو میری جدّت ہے کہ شیطان انسانوں کو گمراہ کرتا ہے میں شیطان کو گمراہ کرتا ہوں اور اُسے مجبور کرتا ہوں کہ وہ لوگوں سے نیک کام کرائے۔"

اے بُلبلے! اور کیا سناؤں؛ یہ قصّہ یہیں تک ہے، یہ دونوں بُلبلے مِٹ گئے۔ اے بُلبلے اب کیا میں تیری خاطر جھُوٹ بولوں؛ واقعی یہ دونوں بُلبلے مِٹ گئے۔ ان کو بُرا کہنے والے بھی مِٹ گئے بعض غصّہ سے پھٹ گئے بعض رشک سے مِٹ گئے۔ یہ دونوں تو ایک دوسرے کو دیکھنے بھی نہ پائے تھے کہ ختم ہو گئے۔ اے بُلبلے یہ مانا کہ جھوٹی کہانی دلچسپ ہو تو غیر دلچسپ سچی کہانی سے بہتر ہے مگر میں اس سچ کو جھُوٹ کیسے کر دوں۔

اے بُلبلے التعجب تو یہی ہے کہ بشری نوع کے قصّے لمبے ہیں عمریں چھوٹی ہیں۔ پیدا ہونا گویا مرنے کے برابر ہے اور اس پر یہ لمبے لمبے قصّے اور قصّوں سے دراز تر غصے۔ کیا تو نے وہ غیظ و غضب کی استان سنی ہے جو ایک خود پسند خود پرست بُلبلے کے متعلق ہے۔ یوں تو سب بُلبلے خود پسند خود پرست ہوتے ہیں مگر یہ جوشیلا بُلبلہ مذہب کے نشہ میں چور فصاحت کا پُتلا تھا جس سے اختلاف ہُوا اسے بدنام کر

کے چھوڑا۔ جب بدنام ہونے پر بھی بعض بُلبُلے چلتے پھرتے رہے تو اس جوشیلے بُلبلے کے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہی۔ پانی سے آگ ہو گیا۔

پھر کیا؟ وہی ہُوا جو بُلبلے کی قسمت میں روزِ ازل سے لکھا ہے۔

"آدمی بُلبلہ ہے پانی کا" جس شاعر نے یہ مصرع لکھا محض آدمی کی خوشامد کی ورنہ کہاں بُلبلہ کہاں آدمی۔ مٹنے میں دونوں برابر ہیں۔ "اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے"۔ مگر بُلبلہ بُلبلے کو کاٹتا نہیں، ڈستا نہیں، لوٹتا نہیں، مارتا نہیں۔ آدمی یہ سب کچھ کرتا ہے۔ کیا یہی اس کا شرف ہے؟ "آدمی بُلبلہ ہے دوزخ کا" اگر کہا ہوتا تو قدرے تسلی کم ہوتی۔

اے پانی کے بُلبلے! تیری معصومیت سے متاثر ہو کر وہ شُبہ جو میرے دل میں ہے زبان پہ لاتا ہوں۔ مجھے یہ شُبہ ہے کہ ناری ہوتے ہوئے بھی یہ دوزخ کا بُلبلہ ناری نہ رہے گا نوری بن جائے کیونکہ تیری کچھ کچھ جھلک اس میں ضرور ہے۔ جو تجھے دیکھے گا جو تجھے چاہے گا۔ وہ میرے ان الفاظ کو کبھی نہ بھولے گا۔

(بُلبُلہ)

اچھے سے پڑھنے والے

کیا میں سچ کہتا ہوں ؟

ع میں نے اس کا فیصلہ موقوف تجھ پر کر دیا

لفظ بھی کیا ساحر ہیں ؛ موقوف ؛ فیصلہ موقوف ؛ اہلکار موقوف ہُوا کرتے تھے ، عمارتیں وقف ہُوا کرتی تھیں ، اردو سے سوائے دلّی والوں کے اور سب ناواقف تھے ۔ کچھ وقوف والے چند بے وقوفوں سے اوقافِ اسلام کے مسائل بیان کرتے تھے مگر بچارے لفظ "موقوف" پر کیا موقوف ہے اور بہت سے ایسے لفظ ہیں جن کے حسب نسب کو دیکھو تو انسان کہاں سے کہاں جا نکلتا ہے ۔ بات کرتے کرتے یہ وقفہ بیچ میں یونہی آن پڑا ۔ ہاں تو کیا میں سچ کہتا ہوں ؟ پہلے معیارِ صداقت سمجھ لو ۔ صرف ایک معیار ہے اور وہ اٹل ہے ۔

وہ تحریر کس کام کی جس سے دماغ مہک نہ اُٹھیں

باغ میں اپنے اپنے موسم میں بیسیوں پھول ہوتے ہیں ۔ موتیا ، چنبیلی ، گلاب ، ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر ۔ اچھے پھولوں کی صورت بھی اچھی سیرت بھی اچھی ۔ اچھے لفظ مگر نہ صرف خوبصورت خوب سیرت ہوتے ہیں بلکہ ایک معشوقانہ ادا سے کچھ ایسے مالامال ہوتے ہیں کہ پھول کا تبسم اچھے لفظ کی رعنائی کے پیچھے لنگڑا لنگڑا کر چلتا ہے ۔ یہ اصل میں اچھے لفظ کے لئے ہی کہا گیا ہے ۔

ع تو از پری چابک تری وز برگِ گل نازک تری

ہاں تو اچھے سے پڑھنے والے میرے ان چند جملوں میں سے اپنے لئے کوئی نازک ادا مطلب

انتخاب کر لے۔ کیا ہوگا؛

ع غنچۂ باغ دل ما زیب دستارے شود،

سچ کہتا ہوں کہ لفظ میرے ہونگے خوشبو تمہاری اپنی ہوگی۔ آؤ اور ایک ایسے باغ کی سیر کرو جس کی دیواریں بلند ہیں، دروازہ بند ہے۔

کیا تم مجبور ہو؛ جانِ من مجبوری کے قفل کی ایک ہی کلید ہے اور اس کا نام ہے پریت یعنی عشق کے نشے میں ایسے سرشار ہو کہ پھر کبھی ہوش نہ آئے" وہ لے اُفتاد مشکلہا" والا مضمون ہے مگر مجبوری سے رہائی کی اور سب ترکیبیں غلط ہیں۔ زمین کو چاہو، آسمان کو چاہو ان کے اندر اور باہر اور درمیان جو کچھ بھی ہے اُسے چاہو اور اس قدر چاہو کہ خود اپنے آپ کو سچے دل سے چاہنے لگو۔

کیا تم آزاد ہو یعنی وقت سے اور اس غیر متحرک منجمد زمانہ سے جس کا انگریزی نام space ہے؛ اس قدر آزاد ہو کہ تمہیں اتنی بھی اپنی خبر نہیں آتی کہ کب کہاں ہوتے ہو؛ جانِ من اس پابہ زنجیر آزادی سے چھٹکارا بھی صرف پریت پر ہی موقوف ہے۔ سچی، اصلی، پیاری پریت ہی وہ خوشبو ہے جو آزادی کے مکروہ تعفّن کو مٹا دیتی ہے۔

کیا تم مجبوری اور آزادی کے بین بین ڈانوا ڈول ہو؛ کیا تم نہ گھر کے ہوتے ہو نہ گھاٹ کے؛ جانِ من پریت کی مضبوط کڑی اپنے گلے میں ڈالو اور جدھر پریت کھینچ لے اُدھر کھنچ جاؤ؛ کیا تم لائق ہو، نیک ہو مگر غریب ہو؛ اور کیا غربت کے جنجال نے تمہارا قافیہ ایسا تنگ کر رکھا ہے کہ نہ نیکی کام آتی ہے نہ لیاقت؛ جانِ من! اس بے چارگی کا درماں بھی صرف پریت ہی ہے۔ ناداری کو اس قدر عزیز جانو کہ زمین کچھ نہ رہے آسمان کچھ نہ رہے۔ سنو جانِ من! ہم تمہاری قوم میں سے ہوں۔ خاندانی ناداروں میں سے ایک کثیر العیال نادار گھر کا بجھا سا چراغ ہوں۔ وہ شعر یاد کر لو۔ شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے۔ دل ہے گویا چراغ مفلس کا۔ کیا یہ کم رتبہ ہے؛ غریب ابن غریب ابنِ غریب تا بہ وقت آدم۔ میری جان غریبوں

کی دُنیا کو اشد ضرورت ہے ۔ امیر مٹتے رہتے ہیں غریب قائم ہیں ۔ غریب قائم ہیں تو دنیا قائم ہے دو رنگی عالم غریب پر موقوف ہے ۔ اے میرے غریب بھائی! تو خدائی کا شاندار ستون ہے تو لاثانی ہے ۔ خاکم بدہن مگر یا خدا بے نیاز ہے یا تو ضرورت کی چیزوں سے آزاد ہے ۔ کیا اب بھی تو اپنے آپ سے پریت نہ کرے گا ۔ کیا تو عالم ہے اور تجھے سب خبر ہے کہ یہ کیا بنا ہُوا ہے اور کیوں بنا ہُوا ہے اور نیک و بد کی میزان کا بھی تجھے علم ہے کہ کون زیادہ ہے اور کون کم ہے؛ جی چاہتا ہے، بہت چاہتا ہے کہ تجھے بھی جانِ من کہہ کر گلے سے لگا لوں مگر تو مجھے ٹھکرا دے گا ۔ علم کا نشہ پریت کے نشے سے کہیں زیادہ تیز ہے، مگر اے عالم تیرے مرض کا علاج بھی مجھے آتا ہے ۔ اپنے آپ سے اور اپنے علم سے نفرت کر ۔ اس قدر نفرت کر کہ علم کی سیاہی تیرے قلب سے دُھل جائے اور تو فردا کا اجارہ دار نہ رہے ۔ اے عالم تو پھُولوں میں سے کانٹے چُنتا ہے ۔ تجھے پریت کی خوشبو سے سروکار ہی نہیں ۔ اے عالم علم کو موقوف کر دے ۔

اچھے سے پڑھنے والے! میرے باغ سے تیرا اپنا محصُور مقفل باغ کہیں زیادہ آراستہ ہے سُن، سُن، سُن ۔ روز تجھ سے نہ کہوں گا سُن ۔

در دل کشا بہ چمن درآ

اور کسی کا نہیں اپنے دل کا دروازہ کھول ۔ جو قفل برسوں بند رہیں وہ دیر سے کھلتے ہیں مشکل سے کھلتے ہیں پریت کی کلید بھی رُک رُک کے پھرتی ہے جلدی کرو اور بہت جلدی کرو ۔ یہ نہ ہو کہ تم قفل ہی کھولتے رہو اور خزاں آجائے ۔ اس بہارستان سے ایسے بےنصیب نہ جانا کہ خود دنیا کا باغ بھی نہ دیکھو ۔ باغ بہت ہیں باغوں میں پھُول ہزاروں ہیں ۔ پھولوں میں مہک فراواں ہے مگر عطّار کم ہیں ۔ کیا تم اپنے بھی عطار نہ بنو گے؟ کیا اب دُنیا میں بخیلوں کا راج ہے؛ نہیں تم بخیل نہیں ہو، تم عالم نہیں ہو، تم لیڈر نہیں ہو ۔

اچھے سے پڑھنے والے! تم صرف بھُولے ہو ۔

انگلستان سے ایک دلچسپ لفظی بلوے کی خبر آئی ہے۔ جس طرح بعض حضرات زن مرید ہوتے ہیں۔ اسی طرح بعض لکھنے والے گرام مرید ہوتے ہیں اور ان گرام مریدوں نے یہ ظلم ڈھانا چاہا کہ انگریزی زبان میں جو لاطینی لفظ ہیں۔ ان کی صیغۂ جمع کی آواز اور صورت لاطینی گرامر کے تحت ہو۔ مثلاً Pendulam کی جمع Pendula ہو اور automaton کی جمع بجائے automatons کے automata ہو اس ظلم کی برداشت انگلستان میں کہاں! جیتی جاگتی زبان بھلا مردہ گرامر کے کیا پاؤں دھو دھو کر پیئے گی؟ زبانیں ان انسانوں کی طرح ہیں جو قرض لے کر قرض کی رقم کو خود اپنی مرضی اور تدبیر سے استعمال کرتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ زبان سیکھنے اور بولنے والے بچوں پر یہ بے جا سختی ہے کہ وہ کسی لاطینی الاصل لفظ کی جمع بناتے وقت اسے اس کا پرانا لاطینی کفن پہنائیں۔ زبان خیالات کا لباس ہے، اور لباس ایسا ہونا چاہیئے کہ خیالات آسانی سے چل پھر سکیں، نہ ایسا کہ قدم قدم پر ٹھوکر کھائیں۔

کیا اُردو لکھنے والے اور پڑھنے والے (قارئین کے لفظ سے مجھے نفرت ہے) اس قسم کے بلوے کے لئے تیار ہیں کہ "لفظوں" کے بجائے غیر ضروری طریقے سے جو "الفاظ" لکھے "قبروں" کی بجائے جو "قبور" لکھے اور "جاہلوں" جیسی عام چیز کی بجائے جو "جہلا" بروزن "علما" لکھے اس سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دیں کہ یہ تکلف ایک بیہودہ تکلف ہے۔ نوجوان لکھنے والوں میں بیسیوں ایسے ہوں گے جنہیں اردو جیسی شوخ و شنگ پری کو زبردستی عرب کے گھر ڈالنے پر غصہ آتا ہوگا وہی کچھ کریں۔

مُصلحانِ قوم

مصلحانِ قوم میں ہزاروں خوبیاں ہیں اور ایک سے ایک بڑھ کر ہے مگر ایک خوبی اُن میں ایسی ہے (اور یہ سب میں ہے) کہ باقی سب خوبیاں بقر عید کے بکرے (گائے نہیں بکرے، اس ملک میں بقر عید بکرا عید ہے) کی طرح حلال ہو کر (نہیں، حرام ہو کر) رہ جاتی ہیں۔ مگر اس خوبی کو بیان کرنے سے پہلے یہ بقر عید کا قصّہ ختم کر لوں۔ بقر کی یا بکرے کی تو عید ہوتی نہیں جہاں تک ان بے زبانوں کا تعلق ہے اس تہوار کا نام بقر قتل ہونا چاہیئے۔ عید تو ان کی ہوتی ہے جو بکرے بیچتے ہیں، یا جو نمازیں پڑھاتے ہیں یا جو مفت کا گوشت کھاتے ہیں۔ آمدم برسرِ مطلب۔ وہ کیا خوبی ہے جو باقی خوبیوں کو ڈائن بن کر کھا جاتی ہے، بیسیوں ننھی ننھی نیکیوں کا کلیجہ نکال لیتی ہے؛ وہ خوبی یہ ہے کہ ہر مصلح قوم کو یقین ہے کہ اس کے بھائی کا تجویز کردہ فلاحِ قوم کا نسخہ غلط ہے اور اس کا اپنا جوشاندہ دوامی طور پر شفا بخش ہے۔ مصلح، چاہے وہ ہجرت کا بندہ ہو کہ تنظیم کا آقا اس یقین کے بغیر مصلح ہو نہیں سکتا کہ اس کا اپنا رستہ ہی واحد صراط المستقیم ہے اور باقی سب لوگ جپالباز ہیں۔ قوم باری باری سب پر ایمان لے آتی ہے یعنی باری باری قوم کو ہر ایک مُصلح سے انحراف کرنا پڑتا ہے اور تجربہ یہ بتاتا ہے کہ مصلحانِ قوم راستی پر ہیں اگر وہ یہ گلہ کریں کہ ان کی تجاویز پر پورا عمل نہیں ہوتا۔

کیا قوم اپنے مصلحان کو اس منتشر کُن فلاحی پروگرام سے روک سکتی ہے؛ مجھے یقین ہے کہ قوم کامیاب ہو سکتی ہے۔ اگر مصلحانِ قوم یہ کہنا شروع کر دیں کہ تعلیم مت حاصل کرو، دولت مت جمع کرو، قرض خوب لو اور ادامت کرو تو ممکن ہے کہ قوم کی انحراف کی عادت اسے مجبور کر دے

کہ وہ شائستہ متمول اور نادار زندگی میں جا گھسے اس ترکیب میں دو فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مصلحانِ قوم
کے آبائی پیشہ میں فرق نہ آئے گا اور دوسرے یہ کہ قوم غلط رستے چل کر صراط المستقیم سے نہ بھٹکے گی گویا
سانپ بھی مرجائے گا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی۔
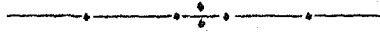
"نیک بخت" اور "ڈارلنگ"

(جادو نگار افسانہ نگاروں کے دور دَورہ میں اردو پڑھنے والے کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ شہزادہ جواں بخت کی اولاد میں سے کسی بلند بخت کے چھوٹے بھائی کا نام نیک بخت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ زمانہ حال کی صنفِ نازک کی اماں، نانی، پرنانی کا یہ ایک گھریلو لقب تھا۔ شوہر کو جب رفیقِ زندگی سے مجبوراً کوئی بات کرنی ہوتی تھی اور اس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرنے والے معمولی جملے مثلاً "سُنو تو"۔ "دیکھو تو"۔ "ہم کیا کہہ رہے ہیں"۔ "تمہاری رام کہانی ختم بھی ہوگی یا چرخہ یونہی چلے گا" ختم ہو جاتے تو کبھی کبھی ازراہِ لطف ہمارے بزرگ گھروالی کو "نیک بخت" کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ یہ تمام وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ آج کل لوگ تقریباً بھولے بیٹھے ہیں کہ شرفا کی مائیں، نانیاں، دادیاں، بیاہی ہوئی پھوپھیاں اور اپنے گھروں میں آباد خالائیں سب نیک بخت ہوتی تھیں اور خصوصیت یہ تھی کہ صرف شوہر اپنی بیوی کو نیک بخت کہہ سکتا تھا۔ غیر کی کیا مجال کہ کسی کی بیوی کو نیک بخت کہہ ڈالے۔ شوہر کے سوائے باقی سب کے لئے گویا اس لفظ کا استعمال تقریباً حرام تھا۔ بہت ہوتا تو دوست دوست آپس میں یہ فقرہ استعمال کر لیتے تھے "تمہاری نیک بخت کی ہماری نیک بخت سے چل گئی"۔

(یہ جتلا دینا غالباً غیر ضروری ہے کہ جس بیوی کا شوہر نہ ہو یا ہو کر چل دیا ہو وہ "نیک بختی" سے گویا مبرا تھی)

بزرگوں کی نیکیوں کا اور اپنی کوتاہیوں کا جس قدر ذکر کیا جائے کم ہے۔ زندگی عقل، مذہب، شرافت اسی لئے عطا ہوئے ہیں کہ موجودہ نسل اسلاف کی خوبیاں یاد کر کے اپنے ناخلف ہونے پر زور

دے اور یہ اصرار یہ ثابت کرے کہ بزرگ سب کے سب بادن گز کے تھے اور ہم سب بالشتئے ہیں یہانتک کہ ہم سے پہلے بادشاہ اور شہزادے بھی سب انصاف پسند سخاوت کے پُتلے تھے۔ عالم بھی بڑے تھے، اور بہادروں کا تو کیا کہنا۔ یکہ وتنہا قلعے ڈھاتے تھے، لاکھوں کو محصُور کر لیتے تھے اور فتح حاصل کر کے غنیم کے ساتھ اس لطف سے پیش آتے کہ وہ ساری عمر کے لئے بیدام کا غلام بن جاتا۔ یہ بالکل غلط ہے کہ مفتوحین کی کھوپریوں کے مینار بنائے جاتے تھے۔ اپنی چار دیواری کے اندر کی زندگی میں بھی بزرگوں کی شان نرالی تھی۔ شوہر اگر کبھی کبھار زنانخانے میں آرام فرمانے کی عشرت گوارا فرماتے تو نیک بخت وہی ذکر چھیڑتی جو شوہر کے باپ اور دادا اپنے اپنے وقت پر انہی حالات میں سُن چکے تھے۔ مثلاً یہ کہ "آپ تو کبھی سنتے نہیں۔ اللہ رکھے میری چھمو اب گیارھویں سال میں ہے۔ کب تک گھر میں بٹھائے رکھو گے! میں تو کل ہی بُوا نفیس خانم کا مُنہ میٹھا کراتی ہوں۔ دو سال سے بیچاری مرادیں مان رہی ہے کہ چھمو کو دُلہن بنا کر اپنا گھر آباد کرے اور لڑکا بھی بُرا نہیں۔ سولھویں سال میں ہے۔ ایک دو سال منگنی رہے پھر بیاہ ہوجائے۔ جہیز تو تقریباً تیار ہے۔ بس آپ زیور بننے کا حکم دے دیں۔ کچھ کپڑا برتن درکار ہیں۔ یہ فرض اپنے سر سے اُتاریں۔"

بزرگوں کی باتیں دُہرانے میں جو لُطف ہے اس سے آج کل کے جدت پسند بھی انکاری نہیں۔ مثلاً نیک بخت کا یہ لکیچر پی کر شوہر صاحب کبھی یہ نہ پوچھتے کہ لڑکا کرتا کیا ہے! بہت فرماتے تو یہ "نیک بخت ہم تو ہڈی کو دیکھتے ہیں۔" نیک بخت یہ سُن کر فوراً سمجھ جاتی کہ نفیس خانم کے سوال سے انکار نہیں۔ یہ اتنا سا جملہ دو سال کی خوشیوں کا پیش خیمہ بن جاتا۔ تہواروں پر جوڑے آتے۔ شب برات پر آتشبازی آتی۔ مٹھائیوں کا پھلوں کا اس گھر سے اس گھر اور اس گھر سے اس گھر ایک تانتا بندھ جاتا۔ "اللہ رکھے" "ماشاء اللہ" "نظر نہ لگے" یہ استعمال کرتے کرتے باچھیں پھٹتیں۔ کیا برکت تھی اس زمانے میں! ۔ لڑکا چاہے بعد میں بیمار نکلے یا نالائق ثابت ہو مگر مردوں کی بات مردوں

کی بات ہے چھوصر ور نفیس خانم کے ہاں دُلھن بن کر رہ جاتی۔ ثابت ہو گیا نا کہ ہم ناخلف ہیں مگر۔۔ مگر۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔

ایک بات اکثر مصلحانِ قوم بھول جاتے ہیں اور وہ یہ ہے آخر ہماری نسل منقطع نہیں ہو رہی اور ہم بھی ہونے والے ناخلفوں کے لائق اسلاف ہیں۔ وہ ہمیں کیسے یاد کریں گے؛ لگے ہاتھوں اس کی بھی ایک جھلک دیکھ لیں۔ سنئے ہمارے پوتوں کے پڑپوتے کیا فرماتے ہیں: "بیسویں صدی کے آغاز میں بزرگانِ قوم نے جس ہمت سے کام لیا وہ تاریخ میں ایک بے مثال یادگار ہے۔ بزرگوں کے ایثار کا کیا کہنا اور آج کل کوئی کر کے دکھائے تب جانیں۔ نام تو اب کچھ ٹھیک یاد نہیں مگر سب سے پہلے شمالی ہند میں کسی بزرگ نے اپنی گھروالی کو بجائے نیک بخت کے ڈارلنگ کہنا شروع کیا۔ اس لفظ سے وہ سوشل انقلاب ہوا کہ دُنیا دنگ رہ گئی۔ کم فہم نقاد جب اوّل اوّل بیوی کے لئے اس لفظ کا چرچا ہوا تو کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے کہ "بیوی" اور "ڈارلنگ"؟ لاحول ولا قوۃ اِلّا باللہ۔ مگر بڑوں کی باتیں بڑی ہوتی ہیں۔ اپنی بات کو ایسا نبھایا کہ نیک بخت تو اور کسی کی نیک بخت بنتی نہ تھی۔ "ڈارلنگ" سب کی ڈارلنگ ہو گئی۔ ماں کو ڈارلنگ بنے دیر نہ ہوئی تھی کہ بیٹی queen بن کر گھومی smart بن کر ناچی اور fast ہو کر اڑی۔ اللہ اللہ! کیا جادو اس ایک لفظ میں بزرگوں نے بھر دیا تھا۔"

رشتہ دار

حاجی صاحب کی باتیں سننے کے قابل ہوتی ہیں۔ مگر آج کل مجھ سے وہ کچھ ناراض ہیں کسی کم بخت نے انہیں بہکا دیا ہے کہ میں اخباروں میں مضمون لکھتا ہوں۔ قسمیں کھائیں کہ جو کبھی کسی اخبار میں کوئی بات لکھی ہو تو منہ کالا ہو مگر حاجی صاحب کو یقین نہیں آتا۔ ڈرتے ڈرتے میری زبان سے یہ نکلا کہ حاجی صاحب کبھی کبھی کسی رسالے میں ایک آدھ چیز میری شائع ہو جاتی ہے لیکن وہ بھی مہینوں ایڈیٹر صاحب کی منت خوشامد کرنے کے بعد۔ مگر حاجی صاحب کو اطمینان نہ ہوا۔ فرمانے لگے "اخبار اور رسالے میں کیا فرق ہے؟ اخبار روز کا روز جھوٹ بولتا ہے اور رسالہ مہینے بھر کا جھوٹ ایک ہی دفعہ لکھ ڈالتا ہے! "لعنت اللہ علی الکاذبین"۔ یہ "لعنۃ اللہ" حاجی صاحب کا تکیہ کلام ہے۔ ہاں مگر پہلے یہ تو بتا دوں کہ حاجی صاحب ہیں کون؟ ہماری گلی میں "حاجی جی" کی مسجد مشہور ہے اور حاجی صاحب کا گھر بھی مسجد کے پہلو میں ہے۔ سینکڑوں سال کی پرانی چھوٹی سی مسجد ہے اور اب حاجی صاحب ہی اس مسجد اور مکان کے مالک ہیں۔ نہایت باوضع ایماندار بزرگ ہیں۔ اہلِ محلہ کو مسئلے مسائل نہایت شوق سے سکھاتے ہیں۔ مجھ سے اک گونہ انہیں انس بھی ہے کیونکہ میری بسم اللہ انہیں نے کرائی اور والد مرحوم کی خاطر وہ اس سے زیادہ کبھی کچھ نہیں کہتے کہ انگریزی پڑھ کر کافر ہو گئے ہو!" غالباً حاجی صاحب کے والد بزرگوار حاجی تھے مگر اہلِ محلہ جس طرح نواب کے بیٹے کو بھی نواب کہتے ہیں اسی طرح تبرکاً حاجی صاحب کہے اللہ کا اعزاز ان کی طرف شروع سے منسوب ہے۔ ایک دن شرارت سے میں نے پوچھا کہ حاجی صاحب کیا یہ بزرگوں کا قول ہے یا یونہی غلط العام ہے۔ فرمانے لگے کونسی بات؟ میں نے عرض کیا:-

فاعتبروا یا اولی الاشکام

پہلے تو کچھ چکرائے پھر سمجھ گئے اور فرمانے لگے "مردود! تو تمسخر سے باز نہیں آتا۔" اس پر تو مجھے بھی غصہ آیا۔

میں۔ حاجی صاحب آپ ہی نے پڑھایا تھا کہ صنم کی جمع اصنام۔ میں نے "شکم" کی جمع اشکام کر کے فاعتبروا یا اولی الابصار کی جگہ فاعتبروا یا اولی الاشکام کہہ دیا۔ آنکھوں والے کم ہیں موٹے پیٹ والے بہت ہیں۔ کیا بڑی بات ہوئی اگر الفرب خواہ مخواہ معتبر کو اولو الاشکام کر دیا۔

حاجی صاحب۔ چپ رہو مردود۔ حیوان شیطان۔

میں۔ قبلہ میں تو مسئلہ پوچھنے آیا تھا اب آپ کے ہاں نہیں آؤں گا۔

حاجی صاحب۔ (فوراً رحمدل ہو کر) نہیں نہیں۔ تم مسئلہ ضرور پوچھو۔

میں۔ کیا گالی دینے سے زبان پلید ہوتی ہے؟

حاجی صاحب۔ زبان بھی پلید ہوتی ہے دل بھی پلید ہوتا ہے۔ یہ مشہور مسئلہ ہے تمہیں اتنا بھی پتہ نہیں!

میں۔ اچھا تو مجھے سالے کی عربی بتا دیجئے۔

حاجی صاحب۔ کیوں؟

میں۔ حاجی صاحب وہ چھوٹو کا بیٹا اب اپنے آپ کو ذوالقدر علی اندرابی کہتا ہے اسے کہنا چاہتا ہوں کہ تو کہاں کا بڑا ارانی خاں کا سالا ہے مگر عربی میں کہنا چاہتا ہوں تاکہ زبان پلید ہو تو عربی میں ہو۔

حاجی صاحب۔ لعنۃ اللہ۔ تم عربی بھی سیکھتے ہو تو گالی دینے کے لئے۔ تم قطعی کافر ہو۔

میں۔ اچھا غلطی ہوئی معاف کیجئے۔ رشتہ داروں کے متعلق شرع شریف کا حکم مجھ پر واضح کر دیجئے۔

اس میری درخواست پر حاجی صاحب بہت خوش ہوئے اور نہایت وضاحت سے آدھ گھنٹہ انہوں نے وصیت اور ہبہ کے متعلق احکام کی تشریح کی۔ پھر جو میں نے عرض کیا کہ حضرت نہ میں مر رہا ہوں نہ جائداد بانٹ رہا ہوں۔ مجھے تو وہ احکام ذہن نشین کرائیے جو روزمرہ کی زندگی میں سود مند ہوں تو حاجی صاحب

بگڑ کر بولے :-

حاجی صاحب :- "سود مند" "سود مند"۔ تم سے سَو دفعہ کہا ہے کہ سُود کے لفظ سے بھی اجتناب کرو "مفید" کہو۔

میں :- بہت اچھا قبلہ مفید ہی سہی مگر . . . .

حاجی صاحب :- اب بیچ میں مت بولو۔ پُوری توجّہ سے سنو۔

حاجی صاحب نے آدھ گھنٹہ میں اس مشکل مضمون پر وہ وہ روشنی ڈالی کہ میں نے عہد کیا کہ گھر پہنچتے ہی اپنی ڈائری میں اس تقریر کا لب لباب لکھ لوں گا۔ چنانچہ جو کچھ اس دن کی ڈائری میں (اس کو عرصہ ہوا) لکھا تھا وہ نقل کرتا ہوں :-

شرع شریف میں رشتہ دار نہیں ہوتے۔ صرف اقربا و یتامے و مساکین ہوتے ہیں۔ اقربا وہ ہوتے ہیں جو دُور رہنے پر، دُور رکھے جانے پر بھی دُکھ دیتے ہیں اور توقعات رکھتے ہیں۔ یتامے وہ ہوتے ہیں جن کا کوئی نہیں ہوتا مگر بعض اقربا بھی یتامے کی مد میں گھس سکتے ہیں۔ مساکین وہ ہوتے ہیں جو چلتے پھرتے ہوں مگر جنہیں کوئی نہ جانے۔ مساکین کو روٹی دینا فرض اولے ہے۔ یتامے کو کپڑا دینا کارِ ثواب ہے۔ اقربا صرف شادی بیاہ یا دُکھ درد کے موقع پر یا کسی مقدمے کے دَوران میں حملہ کر سکتے ہیں۔ مساکین و یتامیٰ کا حملہ عام ہے۔ اقربا کو اپنے جنازے کے وقت کی اطلاع دینی چاہیئے۔ یتامیٰ و مساکین کو نذر نیاز کے وقت سے باخبر رکھا جائے۔ زکوٰۃ میں اول حق یتامیٰ کا ہے پھر مسجد کا یا مسجد کے مساکین کا۔ اگر اقربا میں سے کوئی یتامے ہو تو اس کا حق ہر تسیم انجمن سے فائق ہے۔ عید قرباں پر اقربا کا حق بقدر یک ثلث سب سے فائق ہے۔ کھال مسجد میں جانی چاہیئے انجمنیں سب غاصب ہیں۔ جو انجمن کرائے پر واعظ لا سکتی

ہے اور ان کی چرب زبانی سے یا شاعروں کی شعر خوانی سے چندہ جمع کرسکتی ہے ۔ وہ انجمن ہرگز یتیم کہلانے کی مستحق نہیں ۔ کسی مسلمان کا حق نہیں کہ وہ اپنے بھتیجے یا داماد کو متبنّٰے بنا لے یہ مشرکوں کی رسم ہے ۔ اسی طرح کسی انجمن یا یونیورسٹی یا کالج کو متبنّٰے بنانا بھی بدعت ہے جائز وارثوں کے حق کا غصب ہے ۔

اقربا میں سے قیامت کے دن کوئی کام نہیں آئے گا ۔ قیامت سے پہلے بھی کام نہیں آئے گا ۔ البتہ خاندانی قبرستان میں ان کے ساتھ رہنا ہوگا اس لئے مروّت اور خلوص کا سلوک ہونا چاہیئے ۔

. . . .

حاجی صاحب کی ہزاروں باتیں اور یاد ہیں مگر یہ آخری بات آب زر سے لکھنے کے قابل ہے ۔ اقربا آگے پیچھے قریب ہوں کہ نہ ہوں قبروں میں بہت قریب ہوتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ رشتہ داروں کے ساتھ مر کر ہی گزارہ ہوتا ہے ۔

———— ... ———— ❁ ———— ... ————

نئی دکان

انسان بیمار ہو تو قسم قسم کے غیر ضروری سوالوں پر ضرورت سے زیادہ غور کر لیتا ہے مثلاً اسی سوال پر کہ زندگی کیا ہے؟

تندرست آدمی کو غور کی فرصت کہاں؟ وہ تو عملی طور پر زندہ جواب یہ دیتا ہے کہ اگر انسان ایڈیٹر ہو تو زندگی یہ ہے کہ ہر روز کسی بھائی ایڈیٹر کو یا کم از کم گورنمنٹ کو دو چار گرما گرم سنا دیں، کسی خود سر لیڈر کی مرمت کر دیں، اپنی من بھاتی روحانی غذا کے دوہرے لگا دیں اور جو اس رائے سے متفق نہ ہوں انہیں زندہ در گور کر دیں۔

اگر انسان تاجر ہو تو زندگی یہ ہے کہ سستا خریدیں۔ مہنگا بیچیں اور بچت سے کوڑوں پر کوڑے اور محلوں پر محل بنواتے چلے جائیں اور لوگوں سے بھی سنیں، خود بھی کہیں کہ "محنت کا پھل ہے"، "اللہ کا فضل ہے"۔

اگر انسان معلم ہو تو زندگی یہ ہے کہ کوڑ مغز کا ہاتھ اور ماسٹر صاحب کا بید۔ آئے دن اور ہر سال یہاں تک کہ کتابیں دھڑا دھڑ بکیں، امتحانوں کے پرچے دیکھنے کی فیس آئے۔ ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم تعریف کریں اور صوبے بھر میں نام ہو۔

گویا تندرستی کو اس سوال سے کہ زندگی کیا ہے کوئی خاص حکیمانہ دلچسپی نہیں یا یوں کہئے کہ حکمت (فلسفہ) بیماروں کا مشغلہ ہے۔ مگر حال میں علم النفسیات کے ایک ماہر کی کتاب نظر سے گزری ہے جو اس زریں اصول کو ٹھکراتی نظر آتی ہے۔ یہ ماہر سچے معنوں میں شفاء الملک ہیں۔ بیمار جسموں کا علاج خیالات کی مرہم پٹی سے کرتے ہیں اور بے انتہا کامیاب ہیں۔ یوں سمجھئے کہ پوشیدہ اور فراموش شدہ حسیات کے

دھوبی ہیں۔ پہلے چھپے انسانی احساسات کو سرنگ لگا کر باہر نکال لاتے ہیں پھر ان کو جمع شدہ کثافت و غلاظت سے الگ کرتے ہیں اور جب یہ نکھرے ہوئے احساسات اپنا عکس خود دیکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو مریض سے کہتے ہیں کہ چلو چھٹی اور واقعی مریض اچھا ہو جاتا ہے۔ ان کے اس طرزِ عمل پر تو اعتراض نہیں مگر جب ان ماہر صاحب کے علاج کے فلسفے پر غور کرتا ہوں (آج کل طبیعت کچھ نادرست ہے) تو حیران ہوتا ہوں کہ دنیا کہاں سے کہاں جا نکلی اور ہم محض اردو خواں ابھی تک اپنی پرانی ادھیڑ بن میں ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے کے اصول پر ان ماہر صاحب کا صرف ایک نظریہ پیش کرتا ہوں اگلے دقتوں کے لوگ (یعنی ہم محض اردو خواں) تو یہ سوچا کرتے تھے کہ کیا جھوٹ بولنا کبھی جائز ہو سکتا ہے مگر ان ماہر صاحب کا خیال اس کے لگ بھگ ہے کہ بعض خاص حالات میں سچ بولنا چنداں قابلِ اعتراض نہیں۔ راستی موجبِ رضائے خداست کا پتنگ اس نفاست سے انہوں نے کاٹا کہ واہ واہ واہ واہ کرتے چچا سعدی کے دروغ مصلحت آمیز کا گلا بیٹھ گیا ہے۔

حضرت ماہر صاحب فرماتے ہیں کہ بقاء بعد از مرگ (روح انسانی کے غیر فانی ہونے کا مسئلہ) کو یوں تو کون باور کرے گا مگر آج کل یورپ میں جو سینکڑوں پیرانِ نود سالہ و صد سالہ موجود ہیں وہ موت کے انتظار میں کیا سوچیں؟ کیا ان کے لئے یہ بہترین خوش رکھنے والا طریقہ نہیں کہ وہ یہ باور کر لیں کہ صرف جسم ہی مرے گا۔ روح کو ہمیشہ بقا رہے گی اور اگر یہ بہتر طریقہ ہے تو پھر کیوں اس پر اصرار نہ کیا جائے کہ یہ اعتقاد نہایت لابدی ہے۔ دوسرے لفظوں میں حکیم صاحب کا ارشاد گویا یہ ہے کہ مذاہب کا پہلا آخری اور تمام تر مقصد یہ ہے کہ وہ دِل خوش کن فریبوں کا خوبصورت مجموعہ ہوں۔ لاحول ولا قوۃ۔ اگر حضرت اسی پر اکتفا کرتے تو خیر گزرتی مگر آپ ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ شباب کے مذہب سے ایامِ پختہ کاری کا مذہب قطعی الگ ہونا چاہیئے اور علیٰ ہذا القیاس۔ یعنی عمر کے مختلف مدارج کے لئے مذاہب کا فرض ہے کہ مختلف پیرایوں میں فریب کاری کی خدمت سر انجام دیں۔ ان حضرت کی کتاب

پڑھتے پڑھتے مجھے شبہ ہونے لگا کہ کیا یورپ میں مذاہب کی کوئی نئی دکان تو کھلنے والی نہیں کہ ہر نوع، ہر قد، ہر رنگ، ہر قابلیت اور ہر عمر کے لئے مذہب کا تن زیب وہاں مہیا کردیں۔ اگر یہ دکان چل نکلی تو پھر فیشن کی ستم کاریاں غضب ڈھائیں گی۔

کاش ہندوستان کوئی ایسا سودیشی سورما (مہاتما کی دکان بند ہونے والی ہے) پیدا کردے جو یورپ کی اس نئی دکان کے کھلنے سے پہلے ہی ہندوستان میں یہ کاروبار چلا کر دکھلا دے۔ ہر قسم کے مذہبی تفرقے مٹ جائیں۔ مختلف مذاہب والے لڑتے اسی لئے ہیں کہ ہر شخص بجائے خود سچے دل سے یقین رکھتا ہے کہ میرا رہنما راستی کا واحد ٹھیکہ دار تھا اور جو مجھ سے متفق نہیں ان کا راستہ غلط ہے۔ مگر یہ ماہر صاحب تو فرماتے ہیں کہ ہر شخص کے لئے اس کے حسب حال دروغ راستی نما کی ضرورت ہے گویا اب انا الحق کی بجائے یہ نئی معرفت نکلنے والی ہے کہ

انا الکذب

اور ہر شخص دوسرے سے کہہ سکتا ہے کہ جھوٹ بولنے میں ہم سب حاتم ہیں۔ اخوت انسانی کا یہ نیا سبق یورپ ہی کو مبارک ہو ہم پنجابی اُردو خوانوں کے لئے تو اپنے پرانے پیر اچھے ہیں کہ کھاتے ہیں مگر کم از کم کبھی کبھار یہ بھی تو کہہ دیتے ہیں کہ خدا کو یاد کرو اور بزرگوں کی ارواح کو ثواب پہنچاؤ۔ یہ کیا یورپ کا مسخرہ ہے کہ خود فریبی کا لطف اُٹھاؤ؟ حضرت اکبر تو فرما گئے کہ اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں مگر میں تو درگاہِ الٰہی میں دن رات یہ دُعا کرتا ہوں کہ یوروپین دماغ میں یوروپین بم پھٹیں۔ کہاں ہم غریب صدقِ دل سے پارسائی پر مرنے والے اور کہاں یہ خراباتی کہ جامۂ پارسائی کو بازاری گرضروری پہناوا بیان کرتے ہیں۔

اگلے وقتوں کے لوگ علم کی اور عالم کی سچے دل سے عزت کرتے تھے مگر یورپ والے علم کو اور عالم کو جسمانی خوشی کا غلام تصور کرتے ہیں اور وہاں کے عالم خود اس نئی طرز کے موید ہیں۔ لعنت

بہ کارِ شیطان!

مکرر

مگر کہیں یہ نہ ہو کہ یورپ والے ہی سچے ہوں؟ واللہ اعلم بالصواب۔

"سہ کرر"

کچھ بھی ہو۔ مگر یہ خیال دل سے نہیں نکلتا کہ کاش یہ نئی دکان سب سے پہلے ہندوستان میں ہی جاری ہو۔ غیرتِ ہندی اور حب الوطنی کا زبردست تقاضا ہے کہ بجائے اس کے کہ آواگون موت کے بعد ہو یہ صورت ہو جائے کہ اس زندگی کے اندر ہی اندر جو آج بنگالی اور برہمو ہے وہ کل سکھ اور پنجابی ہو اور جو کل پارسی اور بمبئی کا سیٹھ تھا وہ آج سرحد کا پٹھان ہو اور یہ تغیر و تبدل اس سرعت سے ہو کہ میاں بیوی کو اور بچے ماں باپ کو نہ پہچان سکیں۔ انگریز زبانیں سیکھتے سیکھتے عاجز آجائیں اور گھبرا کر یہاں سے چل نکلیں۔ کیا ہی لطف رہے کہ جو ایک دن پنڈت ہو وہ دوسرے دن چمار اور تیسرے دن والیِ ریاست کے رُوپ میں نظر آئے۔ پھر تو کسی کو شبہ کی گنجائش نہ رہے کہ ہندوستانی اصل میں سب ایک ہیں۔
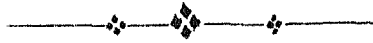
چینی نظم کا تتبّع

اگر تم شاعری کے نشہ میں چور نہ ہوئے یعنی تمہارا دماغ بحر و قوافی کی قیود سے آزاد ہوا تو شاید تم میری مندرجہ ذیل کوشش کو ناپسند نہ کرو۔ میں خوب سمجھتا ہوں کہ یہی چیز تم نہایت خوبصورت الفاظ اور بندشوں سے کہہ سکتے ہو مگر وہ الفاظ اور بندشیں اب رسمی ہو گئی ہیں۔

(۱)

کل شب
مری مہ پارہ
شاداں، رقصاں
آنکلی کہیں سے

(۲)

بولی
"چاند کی سیر کو چل تو
بیگانہ نہ بن تو
مجھے ہے الفت
تجھے ہے فرصت
موڑ نہ میرا کہنا"

(۳)

اور
لپٹی ہوئی مجھ سے
وہ ناز کی پُتلی
صحنِ باغ میں ٹہلی +

(۴)

صبح دم
ہوں میں پریشاں
غالب ہے گماں
افسانہ تھا یہ سب

(۵)

کون
کہہ سکتا ہے
ماجرا سارا
یہ تھا کہ نہ تھا؛

پھوہڑ بیوی کی اکیاونؔ لاکھ علامتیں

(۱) شوہر سے پیار کرتی ہے۔

(۲) شوہر کے علاوہ اور کسی مرد کا بھول کر بھی خیال نہیں کرتی۔

(۳) اگر کامل پھوہڑ نہ ہو تو غلطی نمبر ۲ کا احساس بہت دیر سے اسے ہوتا ہے اور پھر فخریہ اس عیب کو یوں چھپاتی ہے "قسم لے لو جو ساری عمر آنکھ اُٹھا کر کسی کو دیکھا ہو"۔ کامل پھوہڑ کو یہ کہنے کا کبھی موقع ہی نہیں ہوتا۔

(۴) علامت نمبر (۱) اور علامت نمبر (۲) اس خوردبین کے دو لینز ہیں جن سے شوہر کے عیب دس کروڑ گنا بڑے نظر آتے ہیں۔ پھوہڑ اگر شرافت سے دو چار کو بھی دیکھ لیتی تو اس خوردبین کے دونوں نہیں تو ایک لینز ضرور بے کار ہو جاتا۔ مگر وہ پھوہڑ ہی کیا جس کی خوردبین کی طاقت وسعت روزانہ ترقی نہ کرے۔

(۵) پھوہڑ کی خوردبین میں فوٹو لینے کی طاقت (ENLARGED SIZE) قدرتی طور پر موجود ہوتی ہے۔

(۶) پھوہڑ کا حافظہ بوعلی سینا کے حافظہ کو مات کرتا ہے۔ ہر بات کا پس و پیش ہر لفظ کی شان نزول اسے ازبر رہتی ہے۔

(۷) پھوہڑ کے ذہنی فوٹو اور طاقت گویائی کے متعلق سو انتیس لاکھ علامتیں اور ہیں جن کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ بات بات پر پچھلے سے پچھلے سال کے سوشل نقشے کھنچتے ہیں۔ تقریروں کی خاموشیوں کی تصویریں دکھائی جاتی ہیں۔ ماضی گویا پھوہڑ کا لازوال خزانہ ہے۔

(۳۷۲۵۰۰۸) پھوہڑ ہمیشہ صحیح بات کہتی ہے اور ہمیشہ بے موقع نوکروں کی بدتمیزی۔ بے پروائی، بد دیانتی کا قصہ عین اس وقت شروع کرے گی جب شوہر کو خاص طور پر آرام کی ضرورت ہو۔ نوکروں کے متعلق پھوہڑ کی ایک سو بہتر لاکھ علامتیں اور ہیں جن میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔ (افسوس ہے کہ حساب غلط ہو گیا۔ پھوہڑ کی اکاون لاکھ کروڑ علامتیں ہیں)

۳۷۲۵۰۰۸ شوہر کی موجودگی میں بھلی صورت والی نوکرانی پر ضرور سختی کرے گی تاکہ شوہر کا دل اس
+
(۱۷۲۰۰۰۰) کی طرف مائل نہ ہو۔ جس شوہر کو کبھی اس بات کا خیال بھی نہ ہو وہ بھی ہمدردی کرنے لگتا ہے۔

+
۱
شوہر کو پانی کی پیاس ہو تو بہ تکلف شربت پینے پر مجبور کرتی ہے۔ شربت جلدی سے (۲۰۹۲۵۰۱۰) طیار کرانے میں نوکرانیوں کا زبان کی قینچی سے وہ قتیہ کرتی ہے کہ شربت زہر ہو جاتا ہے۔ اگر بھول کر خود شربت پیش کرے تو لطف سے پاس نہیں بیٹھتی۔ باقی شربت بانٹنے کے ادھم میں گھر بھر سر پر اٹھا لیتی ہے اور عین اسی وقت "ارے گلاس تو اٹھاؤ" "خوانچہ تو لائے ہوتے" "صراحی تو ڈھانکی ہوتی" کے وہ نعرے لگاتی ہے کہ عرش معلٰی کے فرشتے تک کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں۔ گھر کے انتظام میں چیخ پکار کے متعلق ایک سو ایک ارب علامتیں اور ہیں جن میں سے چند کا ذکر ضروری ہے۔ (حساب پر لعنت! پھر غلط ہو گیا۔ پھوہڑ کی اکاون لاکھ ارب سنکھ علامتیں ہیں۔ اب بھی غلط ہو جائے تو اللہ کرے کہ "ہمایوں" کے مدیر صاحب کی کسی بیٹے سے دوستی ہو جائے)

(کئی ارب سنکھ) پھوہڑ کا شوہر جب گھر میں داخل ہوتا ہے تو پھوہڑ ہمیشہ کسی ضروری کام میں مصروف ہوتی ہے مگر جہاں ہو وہیں سے بآواز بلند ہانک لگاتی ہے "ارے کمبختو! صاحب آ گئے اور چائے نہ شربت" بدحواسی میں تن بدن کا ہوش نہیں ہوتا اور بھٹکے مارے شوہر کی دلجوئی کے بجائے ایک قیامت صغریٰ کا نمونہ روزانہ ان کی نذر ہوتا ہے۔ اس طویل داستان کے کئی لاکھ ارب سنکھ باب ہیں۔ شوہر گھر سے نکلے تو

فرمائشیں یا دوہانیاں۔ فراموشیوں کے گلے شکوے۔ گھر میں آئے تو وہ ہو و ہائے کہ الامان۔ اس قصے کے لئے عمر نوح چاہئے۔

(اب یہ حساب نہ مجھ سے سنبھلے، نہ کسی بنئے کے باپ سے۔ پھر نئے سرے سے شروع کرتا ہوں)

(۱) پھوہڑ شوہر کے خوش کرنے کے لئے سستا اور پرانا کپڑا استعمال کرتی ہے۔ اچھے اور نفیس کپڑے کو سنبھال کر رکھتی ہے۔ گوٹا ماند پڑ جائے۔ ریشم کو کیڑے چاٹ جائیں۔ مگر پھوہڑ کے سلیقہ میں فرق نہیں آتا۔

(۲) پھوہڑ مروجہ فیشن سے سوا لاکھ میل پیچھے ہوتی ہے۔

(۳) پھوہڑ ہر کپڑے کے متعلق شوہر سے بیسیوں پیشگی مشورے کر کے عین اس کی رائے کے برعکس کپڑا بنواتی ہے اور پہنتی ہے۔ بے موقع نمائش کی موجد اور سہیلیوں کے گنوں کی مداح (لاحول ولاقوۃ! پھوہڑ کی صرف سہیلیوں سہیلیوں کے متعلق کئی کروڑ سنکھ علامتیں ہیں۔ اس کے متعلق کوئی نئی گنتی ایجاد ہونی چاہئے،

(نئی گنتی ۱ سے ی تک
اور A سے Z تک)

پھوہڑ سہیلیوں کی شکل وصورت کی کبھی تعریف نہیں کرتی۔ مگر ان کے کپڑے کی۔ زیور کی۔ روپیہ جوڑنے کی تعریف میں پل باندھ دیتی ہے سہیلی اور سہیلی کے شوہر کی لڑائی میں ہمیشہ سہیلی کے شوہر کو جھوٹا قرار دیتی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتی ہے "پھر بھی بیچارا بہتوں سے اچھا ہے۔ اور لوگوں کی طرح بات کا بتنگڑ تو نہیں بناتا"!

پھوہڑ کی سہیلی گھر میں وارد ہو تو گھر میں شوہر کا حقہ پانی بند۔ "آخر تم جانتے ہو کہ گھر میں مہمان ہیں۔ ذرا دیر ہو گئی تو کیا قیامت آ گئی کہ گھر بھر سر پر اٹھا لیا۔ مجھے تو دیکھو کہ دن رات کام میں مرتی ہوں کبھی شکایت کی؛ کمبخت دھوبی کو آٹھ دن سے کہہ رکھا تھا کہ چاندنی دے جانا۔ آج تک نہ لایا۔ ایسی شرم آ رہی ہے کہ کیا کہوں تمہاری بلا سے! تم کو میرے دل کا کیا حال معلوم؛ علیٰ ہذا القیاس طلسم ہوش ربا کی سات جلدیں ختم ہو جائیں یہ تقریر ختم نہ ہو۔

(ہر قسم کی گنتی ختم ہو گئی۔ مگر علامتیں ابھی بہت ہیں۔ سنتے ہیں کہ جاپان کی ہر چیز سستی ہے۔ گنتی

بھی وہیں سے خرید یں گے۔ بل آئے گا تو دام ادا کر دیں گے۔ فی الحال استعمال کر لیتے ہیں)

(۸) پھوہڑ بیوی بچے دیتی ہے۔

(۹) پھوہڑ بیوی بہت بچے دیتی ہے۔

(۱۰) بچوں کے ساتھ شکایتیں بھی پیدا کرتی ہے۔

بچوں کی شکایتیں۔ اپنی شکایتیں۔ دنیا جہان کی شکایتیں۔ ہر موقع محل کے لئے اور بے موقع بے محل ہزار ہا شکایتیں اور شوہر سے فوری فیصلہ کی طلبگار رہتی ہے۔

(۱۱) پھوہڑ بیوی صبر کرتی ہے اور بے انتہا صبر کرتی ہے اور اس صبر کا بے انتہا ذکر کرتی ہے کہا جاتا ہے کہ پھوہڑ بیویوں کے صبر کے حساب کتاب کے لئے ایک نئی قیامت کا اجراء کیا جائے گا۔

(۱۲) پھوہڑ بیویوں کی ماؤں کی شفقتِ مادرانہ کے سیلابِ عظیم کا مقابلہ سدِ سکندری سے ہو تو ہو چین کی دیوار تو اس کو روک نہ سکی۔

آخری نوٹ:۔

(اصلی پھوہڑ بیویاں آج کل کمیاب ہیں۔ شادی کی منڈیوں میں نقلی مال کا زور ہے خاندان ہی مٹ گئے تو اب وہ خاندانی وضعداریاں کہاں؛ شوہر کے منہ پر شوہر کے دوستوں کو کوسنا اب محض خواب و خیال ہے۔ ممکن ہے دِلّی، لکھنؤ کی راکھ کریدنے سے یہ زرِ گم گشتہ دستیاب ہو جائے مگر امید کم ہے۔)

از کجا است تا بہ کجا

یہ ذکر لندن کا ہے۔

شام کے پونے آٹھ بجے کے قریب لندن کے مشہور چوک پکیڈلی کے ایک طرف الگ کھڑے چند ہندوستانی نوجوان خود اپنی جیبیں ٹٹول ٹٹول کر ہتیلی پر شلنگ اور پنس جمع کر کرکے حساب لگا رہے تھے کہ شامِ خوش دلی کے لئے کل مشترکہ سرمایہ کیا ہے؟ آخر بے اختیار ہنس دیئے کہ ٹھنیٹر تو کجا کل جمع پونجی متوسط ترین اکل و شرب کے لئے بھی کافی نہ نکلی۔ مگر وعدہ کر چکے تھے کہ جو کچھ کریں گے اکٹھا کریں گے۔ اِس لئے ہر پیش شدہ تجویز کی دو لوٹوں سے چھان بین کر رہے تھے۔ پکیڈلی کی دو چار چھوکریاں ان کی طرف معنی خیز مسکراہٹ اور شوق افزا نگاہیں پھینکتی ہوئی گزر گئیں۔ مگر یہاں تو "یاراں فراموش کردند عشق" والا معاملہ تھا کسی کی آنکھ نہ ہلی کسی کا قدم نہ اُٹھا۔ جب ایک منچلے نے یہ تجویز کی کہ نہ کھانا نہ تماشا یہ شام محض Beer اور Sandwich کی نذر کی جائے تو بحث پھر پوری پارلیمنٹری آب و تاب سے چھک نکلی۔ ایک نے کہا کہ Sandwich کو محذوف کر دو۔ دوسرے نے کہا کہ یہ آنریبل ہوس ہندوستان کی لازوال گزشتہ شان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرے کہ انسان پیئے تو خوب پیئے ورنہ برت رکھ لے اور اس لئے میرا ووٹ ہے کہ Beer کو وعلیکم السلام کہا جائے تیسرے نے کہا کہ میں پو رہا ہوں Beer سے ہونٹ تر کر لینگے نشہ اندر سے نکالیں گے اور شام گزر جائے گی۔ اس لئے Beer ضرور ہو مگر تھوڑی ہو۔ یہ سب ابھی اسی بحث میں تھے کہ ایک خوش رو ہندوستانی نوجوان تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا ان کی طرف عازم ہوا اور پہنچتے ہی کہنے لگا:۔

نووارد۔ کیا شیطان تمہاری کچھ مدد کر رہا ہے؟

ایک۔ کیوں؟

نووارد۔ اس لئے کہ اگر کر رہا ہے تو ضرور تم سے کسی کے پاس ایک دو پونڈ فالتو ہوں گے وہ مجھے دے دو۔

دوسرا۔ شیطان صاحب نے تو دیوالہ کی درخواست دے رکھی ہے۔

نووارد۔ مجھے پہلے ہی یہ توقع تھی۔ خدا ہم غریبوں کی سنتا نہیں "And The Devil fails You."

تیسرا۔ پھر اب کریں تو کیا کریں؟

نووارد۔ کچھ نہ کرو میرے ساتھ چلو۔ مگر اس شرط پر کہ گیارہ بجے سب فقرو ہو جاؤ۔ میری بھٹیاری ذرا تلخ مزاج ہے۔

سب۔ منظور۔ مگر دو شرطیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ سینما سٹار یا ایکٹرس کا تذکرہ نہ ہو اور سیاسیات خارج از بحث رہیں۔ اور دوم یہ کہ خرچ سب مشترکہ ہو۔

نووارد۔ O.K

(۲)

ہندوستانی گھروں میں ان نوجوانوں کی بہنیں، بھابیاں، خالائیں، پھوپھیاں، مائیں، نانیاں سب خیال کرتی ہوں گی کہ ہمارا بیچارا ننھا ضرور کسی مس کا شکار ہو گیا ہوگا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ ہزاروں ذہنی تصویریں ان کے پیشِ نظر ہوں گی کہ بس کسی چڑیل مس نے شراب پلا پلا کر اپنا دیوانہ بنا رکھا ہے تبھی تو خط دیر میں آتا ہے اور وہ کبھی چار سطروں کا منتیں مانگتی ہوں گی کہ بچ کر چلا آئے تو اجمیر شریف چڑھاوا چڑھائیں۔ چچا کو رہ رہ کر خیال آتا ہوگا کہ اب اپنی بیٹی کا کسی اور جگہ ارادہ کروں (ہندوستانی والدین بیٹیوں کے لئے جگہ تلاش کرتے ہیں شوہر چاہے کیسا ہی ہو) یا اگر قمر کے گھر میں ہوئے تو صاف کہتے

ہوں گے "عجب پاجی ہے کہ خرچ اُٹھائے جا رہا ہے اور امتحان پاس کرنے کا نام نہیں لیتا"۔ اور اگر مزاج کا پارہ ذرا کم تیز ہؤا تو دبی زبان سے یوں بھی فرما دیتے ہوں گے۔ "بھئی آخر کیا کرے۔ لندن نئی جگہ۔ مہنگی جگہ۔ انتشار کا گھر۔ خرچ نہ کرے۔ فیل نہ ہو تو اور کیا کرے"!

۳

یہ نوجوان ایک سستی سی جگہ سے کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے کر نووارد کے گھر پہنچے۔ لینڈ لیڈی (Land Lady) کی بیٹی نے ان کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر اپنا فرض سمجھا کہ کرایہ دار (یعنی مسٹر نووارد) سے دریافت کرے کہ کیا یہ لوگ کچھ supper کے متلاشی ہوں گے؟

نووارد۔ لوسی۔ تھینک یو۔ مگر سپر ہمارے ساتھ ہے اور ہم تو محض باتوں سے پیٹ بھریں گے۔ ان سب شاہزادوں کے پاس آج کل ٹین (یعنی نقدہ، وحرمتہ) کی عارضی کمی ہے۔

لوسی۔ (دلفریبی سے مسکرا کر) یوں تو نہ کہئے کہ یہ ان Princes کا قصور ہے۔ یوں فرمایئے کہ وہ کھیت جس کا نام باپ ہے۔ آج کل زرخیز نہیں۔

نووارد۔ تصحیح کا شکریہ! اسی لئے تو میں کہتا رہتا ہوں کہ مجھے تم سے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔

لوسی۔ گڈ نائٹ۔

اس مس کے پیٹھ موڑنے پر گفتگو یوں شروع ہوئی۔

ایک۔ غنیمت ہے اس سے تو جان بچی۔

دوسرا۔ کس کی؟

تیسرا۔ یہ سلسلۂ گفتگو قطعی ممنوع ہے۔ آج شام زبان کے لئے عورت اور شراب دونوں حرام ہیں۔

نووارد۔ یہ بتاؤ کہ کھاؤ گے کس وقت؟

سب۔ جب آنتیں بالکل قل ہو اللہ پڑھیں گی۔ اس سے پہلے ہرگز نہیں۔

نووارد۔ میرا قرآن تو قریباً ختم ہے۔
ایک۔ میرا بھی
دوسرا۔ میرا بھی۔
تیسرا۔ علیٰ ہذا القیاس۔

اس پر سب کے سب خوب ہنسے اور خوشی خوشی ماحضر کو گھٹنوں پر ٹکی ہوئی طشتریوں میں رکھتے گئے اور کھاتے گئے۔ تھا ہی کیا؛ دس منٹ میں چاروں میں وہ دو Beer کی بوتلیں اور کافی مزہ دار Sandwich گویا اونٹ کے منہ میں زیرہ ہو کر رہ گئیں۔ مگر ان لوگوں کی بشاشت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ سب کے سب صحت کی دولت سے مالا مال تھے اور اس سے بڑھ کر یہ تھا کہ خداداد ذہانت کی روشنی سے چہرے تمتما رہے تھے۔ باتیں کرتے کرتے ایک نے فارسی شاعری کا ذکر چھیڑ دیا۔

نووارد۔ واہ حضرت! کس بیابان میں جا گھسے!

ایک۔ بیابان تو ضرور ہے مگر اس میں بلا کے ساحر آباد ہیں۔ سچ پوچھو تو خدا کی بنائی ہوئی دنیا کو ردی کر کے جو خیالی دنیا فارسی شاعروں نے کھڑی کر دی ہے وہ قطعی بے مثل ہے۔

دوسرا۔ یہ کیسے؛ کیا یونانیوں کے اور ہندوؤں کے دیوی، دیوتاؤں کے قصے کچھ کم حیرت خیز ہیں۔ حالاتِ موجودہ کو کس خوبی سے منسوخ کر کے ان لوگوں نے محض زبان آوری کے جادو سے ایک مفروضہ دنیا کو انسانی دلوں پر حکمران کر دیا۔ اور فارسی والوں میں اصلی تخیل کتنا نحیف و نزار ہے۔ "ہمہ اوست" اور "ہمہ ازوست" کے دو عامیانہ جملوں کو فصاحت کی شراب پلا پلا کر ان لوگوں نے متوالے پن کی شان میں اضافہ ضرور کیا ہے۔ مگر غائر نظر سے دیکھو تو اور کچھ بھی نہیں۔ پل میں فنا ہوتے ہیں۔ پل میں بقائے دوام کے دعوے دار بنتے ہیں اور عمر بھر اسی فنا و بقا کی بے معنی ترشی کو بینائے فراست سے انڈیلتے ہیں اور پھر اسی میں ڈال دیتے ہیں۔ ایک آدھ نے خُم شکنی بھی کی ہے۔ مگر

فارسی شاعری میں تصوف کا سومناتھ جوں کا توں موجود ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ فارسی والوں کے پاس خدا، عشق اور مے کے علاوہ صرف آئینۂ حیرت، جبر و اختیار اور فنا و بقا کا دماغی سرمایہ تھا اور باقی خیر سلّا۔ جہاں تک ان سے ممکن ہو سکا ان چند تانوں کو وہ لمبا کرتے رہے مگر۔ ۔ ۔ ۔ ۔

تیسرا۔ اب بس بھی کرو کہ لکچر دیتے چلے جاؤ گے؟ اس بحث میں میں بھی حصہ لینا چاہتا ہوں؟

ایک۔ (گاتے ہوئے) میں پڑوں تورے پیاں۔

معاف کر دے

تیسرا۔ معاف کیا۔ اچھا اب میری سنو۔ کیا شعر کو اس کے معنی کے لئے پڑھنا اور پرکھنا خالص گدھاپن نہیں؟ ایشیائی سسٹم کی انتہائی ذلت یہ ہے کہ حسن کو اور حسن آفرین فنِ انسانی کو نیک و بد کی ترازو میں تولا جاتا ہے۔ اور مزید براں یہ کہ شاعر خود اس ہمہ دانی ہمہ فہمی کے دھوکے میں مبتلا ہو کر گویا واعظ بن جاتے ہیں اور بعض دفعہ واعظ سے بڑھ کر عین معرفت کے ترجمان ہونے کے دعوے ار۔ شاعر تو خیر تھا ہی لن ترانیوں کے لئے مگر لوگوں کی عقل کا کیا کہئے کہ ان ابلہ فریبوں کو حقیقت کا کامیاب شکاری سمجھتے ہیں۔ میری رائے میں شعر کو پرکھنے اور اس سے لطف اُٹھانے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا شاعر نے الفاظ کے سنگریزوں کو یوں جڑا ہے کہ وہ الماس و زمرد کو مات کر دیں؟ شاعر لفظوں کا صناع ہے جیسے جوہری ہیرے اور یاقوت کا۔ دونوں اپنے اپنے فن کے کاریگر ہیں۔ کاریگر کی لیاقت کا معیار اس خیال سے کرنا کہ چیز قیمتی ہے گویا اس کی کاریگری کا خون کرنا ہے۔ آپ لوگ جو مضمون پر مرتے ہیں گویا یہ کہتے ہیں کہ قطب صاحب کی لاٹ اگر سونے چاندی کی ہوتی تو بہت زیادہ پسندیدہ ہوتی۔ قطب صاحب کی لاٹ کی قدر و منزلت اس لئے کم نہیں ہو جاتی کہ در اصل وہ محض اینٹ، پتھر، چونے اور گارے کا مجموعہ ہے۔ اس کی اصلی شان یہ ہے کہ کاریگر نے اینٹ پتھر کو اپنی حسن آفریں طبیعت سے وہ مرتبہ دے دیا ہے جو کروڑ من سونے

کو حاصل ہونا ناممکن ہے۔ یہی حال شاعر کا ہے۔ اپنی کیمیاگری سے مٹی کو سونا کرتا ہے۔

درسایہ مجو دل عراقی
کاں ذرہ بآفتاب پیوست

نووارد ۔ بھئی سنو۔ بحث نہ کرو۔ تم سب جانتے ہو کہ اس مضمون میں مجھے بھی کچھ تُنَدُبُر ہے اور وہ مبالغہ جو ابھی (ایک کی طرف مخاطب ہو کر) تم نے کیا ہے دانستہ کیا ہے۔ مجھے خوب علم ہے کہ تم چاہتے تو شاعری کی Technique کی ہجو کر دیتے اور مضمون کی خوبی کی مدح میں قصیدے کے قصیدے لکھ ڈالتے۔ مگر ایک شعر مجھ سے بھی سن لو عرفی کا ہے:۔

مراز چشم تو ہر شیوۂ کہ باید ہست
ہمیں نہفتہ نگہ ہائے آشناست کہ نیست

یہ ہے شاعری کا کمال کہ کتنے مختصر لفظوں میں کتنی خوبصورت داستان لکھ دی ہے۔ کیا ہست و نیست کا تلازمہ ہے۔ سب کچھ ہے اور پھر کچھ بھی نہیں اور محض اس لئے کہ شریر آنکھیں شرارت سے باز رہیں تو بھی ستم کر جاتی ہیں۔

سب ۔ واللہ لاجواب شعر ہے۔ پھر کہو۔

نووارد پھر وہی شعر دہراتا ہے۔ سب کے سب اسے لہرا لہرا کے گنگناتے ہیں۔ گویا مبہوت سے ہو جاتے ہیں اور یہ عالم کچھ دیر تک طاری رہتا ہے۔ پھر سب کے سب بے اختیار ہنس دیتے ہیں۔

نووارد ۔ واللہ ہمارے سب کے دماغ کیا ایک سانچے میں ڈھلے ہیں؟ یا تو اس شعر کا لطف لے رہے تھے اور یا یہ خیال آگیا کہ عرفی بھی کس دنیا میں رہتا ہو گا؟ "تغافل ہائے تمکیں آزما" والی دنیا کے رہنے والے بیچاروں کے لئے نگاہِ بے محابا بڑی دولت تھی۔ لندن میں کوئی ایسا مفلس نہیں جسے یہ امیری میسر نہ ہو۔ واقعی ہندوستان سخت نادار ہے۔

سب ۔ تو گویا یورپ کا یہ سبق ہمارے دلوں میں سب سے زیادہ پائدار ہے؛

نو وارد ۔ بیہودہ مت بکو۔ تم جانتے ہو کہ میرا نظریہ یہ ہے کہ ہم زندگی سے سیکھنے کچھ نہیں آئے بلکہ زندگی کو کچھ سکھانے آئے ہیں۔ یہاں ہم پارسائی کی تلقین کریں گے۔ جب گھر جا نکلیں گے تو رندی کا درس دیں گے۔

سب ۔ اپنا فضول فلسفہ رہنے دو۔ لو اب چلتے ہیں بھئی تمہاری بدولت خوب شام گزاری۔

ایک ۔ ہاں بھئی شکریہ۔ پیسے بچ گئے وقت کٹ گیا۔

دوسرا ۔ یوں کہو کہ وقت زندہ ہو گیا۔

تیسرا ۔ واللہ اس تفریح سے کل کے کام کے لئے جان میں جان آگئی۔

ایک ۔ ضرور تم تو کل رستم بن کر ریاضی کے اسفندیار کو زیر کر لو گے۔ مگر ہمارا اقتصادی پہلوان ہم سے نہیں پچھڑتا۔ خدا ستیاناس کرے اس گول چاندی کی ٹکیہ کا جس کا نام روپیہ ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ روپیہ آدمی کے لئے ہے یا آدمی روپیہ کے لئے؛

سب ۔ بھئی ایک شعر اور سنا دو تب جائیں گے۔

نو وارد ۔ سنو

ادب زمن طلب و شرح آشنا روئے
کہ از تبسم ادبے شود حجاب گستاخ

سب ۔ واللہ کیا موتی پروئے ہیں۔

دوسرے مصرع کو سب بار بار پڑھتے ہیں اور جھومتے ہوئے خدا حافظ خدا حافظ کہہ کر ہشاش بشاش رخصت ہونے کو تھے کہ نو وارد بولا:۔

نو وارد ۔ ایک شعر اور سنتے جاؤ۔

درخواب غلط بماند خسرو
کایں حال مرا نہ بود یا بود

سب چلے جاتے ہیں۔

۴

لوسی۔ میں آسکتی ہوں؛
نو وارد۔ آیئے۔ کیوں خیر ہے؛
لوسی۔ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ معاف کیجئے۔
نو وارد۔ کیا؛
لوسی۔ مجھے نیند نہ آرہی تھی۔ اس لئے میں پڑھنے لگ گئی۔ اتفاقاً اس پردہ کے پیچھے سے گزری تو آپ لوگوں کو دیکھا۔ عجب حالت تھی۔ آپ کچھ کہہ رہے تھے۔ آپ کے دوست اس بات کو جھوم جھوم کر دہرا رہے تھے۔ میں اس SCENE کو دیکھ کر ہل نہ سکی۔ گویا پاؤں زمین میں گڑ گئے۔ آپ اپنی زبان بول رہے تھے اس لئے یہ تو آپ کو شبہ نہ کرنا چاہئے کہ مجھ میں پرائی بات سننے کی ذلیل جستجو تھی۔ مگر پھر بھی میں معافی مانگتی ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ بُرا نہ مانیں گے۔
نو وارد۔ لوسی۔ تم کیسی باتیں کرتی ہو۔ معافی کا اور بُرا ماننے کا کیا سوال۔ ہم تو ایسے منہمک تھے کہ ہم میں سے قطعی کسی نے محسوس نہیں کیا کہ پسِ پردہ بھی کوئی ہے۔
لوسی۔ یہی تو میں تعجب کرتی ہوں کہ وہ کیا چیز تھی جس نے آپ کو اس قدر بے خود کر رکھا تھا۔ آپ لوگوں کے چہروں پر اس وقت ایسی Spiritual - light تھی جو اپنے وطن میں مجھے کبھی شگفتہ سے شگفتہ رُخ دل کش میں نظر نہیں آتی۔ دوسروں کو خوش دیکھ کر کتنی خوشی ہوتی ہے۔
نو وارد۔ لوسی ہم فارسی زبان کے اشعار کو پڑھ کر ان کا لطف لے رہے تھے۔

لوسی۔ کیا عمر خیام کے اشعار تھے؟

نووارد۔ عمر خیام بیچارا کیا شعر لکھتا۔ ایک شعر عراقی کا تھا۔ دو عرفی کے۔ اور ایک امیر خسرو کا۔

لوسی۔ آپ کو نیند نہ آرہی ہو تو مجھے ترجمہ سنا دیجئے۔ مجھے سخت بے تابی ہے۔

نووارد۔ نیند تو نہیں آرہی مگر ان اشعار کا ترجمہ ہو نہیں سکتا۔ البتہ تم کہو تو دو ایک اور کا ترجمہ سنا دیتا ہوں۔

لوسی۔ ضرور سنائیے۔ کوئی شراب کا یا گلاب کا شعر ہو۔

نووارد۔ کیا تمہیں نیند نہیں آرہی؟

لوسی۔ ہرگز نہیں۔ لائیے آپ کا کوٹ اتار دوں۔ آپ ڈریسنگ گون پہن لیجئے۔

نووارد۔ ٹھیک ہے۔

لوسی نہایت بے تکلفی سے کوٹ واسکٹ اتار لیتی ہے۔ گرم ڈریسنگ گون اٹھا لاتی ہے اور نوجوان اپنے گلے کو کالر نکٹائی کی قید سے آزاد کرتا ہے۔

نووارد۔ سنو ایک شعر یہ ہے

ترسا بچۂ، شوخے۔ شنگے۔ شکرستانے
در ہر خم زلفش۔ او گمراہ مسلمانے

(شعر سنا کر ترجمہ بھی کرتا جاتا ہے اور اس کے بالوں سے بھی کھیلتا جاتا ہے)

از دیر بروں آمد، بر خوبیٔ خود سرمست
ہر کس کہ بدید او را والہ شد و حیرانے

پھر ترجمہ کرتا ہے) ایک اور غزل میں ایک شعر یہ ہے:۔

شکر ز لبش می چیں، تا چند ز کفر و دیں

دردِ زلف و رُخ ادیبں، گبری و مسلمانی

(پھر ترجمہ کرتا ہے)

لوسی ۔ یہ شعر تو ایکٹنگ کے قابل ہے ۔

چنانچہ ایکٹنگ ہوتا ہے ۔ مگر وہ نہیں جس کا ہندوستان میں بیٹھی بچاری ماؤں کو بہنوں کو ڈر لگا رہتا ہے ۔ کیونکہ زمانہ ترقی پذیر ہے ۔ نہ دل آتا ہے نہ دل جاتا ہے ۔ جو ہوتا ہے وہ فطری سادہ دلی اور ایسی بھولی طرح کہ ملال کا ۔ گناہ کا گمان تک نہ ہو ۔

لوسی ۔ کاش کہ میں آپ کا کافی شکریہ ادا کرسکوں (جمائی لے کر) نیند بھی کیا فضول چیز ہے ۔ کاش جاگتے چلے جائیں ، تم شعر پڑھتے ہو تو بچوں سے بڑھ کر بھولے معلوم ہوتے ہو ۔ گڈ نائٹ ۔

نو وارد ۔ گڈ نائٹ ۔

۵

اجمیر شریف چڑھاوا چڑھے کو کئی سال گزر گئے ۔ چچا کی بیٹی کے لئے جگہ کی تلاش کا سوال پیدا ہی نہ ہوا ۔ گھر کا کام گھر ہی میں ختم ہوا ۔ باوا کی تمکین میں فارغ البالی کے آثار رہیں ۔ کیونکہ گو کماؤ بیٹے نے الگ کوٹھی میں رہنا پسند کیا ۔ مگر صاحبیت نے سعادت مندی کو کچا نہ نگلا ۔ باپ کی ، ماں بہنوں کی آؤ بھگت میں توقع سے زیادہ خلوص تھا ۔ چھوٹی بہن البتہ کبھی کبھی کہہ اٹھتی کہ خدا جانے شادی کے بعد آ کا میاں کے مزاج میں وہ چلبلا پن کیوں کم ہو رہا ہے جو ولایت سے واپس آنے پر ہونٹوں اور آنکھوں سے فوارے کی طرح اچھلتا دکھائی دیتا تھا ۔ مگر اور سب کو کامل اطمینان تھا کہ سلیم طبائع پر لندن کا جادو کارگر نہیں ہوتا ۔ سمجھنے والے خوب سمجھ رہے تھے کہ ہندوستانی سوشل گرد و غبار اپنا کام کر رہے ہیں ۔ مگر اس معاملہ میں کوئی کر کیا سکتا ہے جس طرح گول کمرے کی ولایتی چاندی کی چیزیں روزانہ جھاڑ پونچھ کے باوجود ماند پڑ جاتی ہیں ۔ اسی طرح وہ ذہین خوش رُو چہرے جن پر چار پانچ سال لندن

نے محنت سے جلادی ہو۔ ہندوستانی گھروں میں ہندوستانی حالات کے دباؤ کے افسردہ کن اثر سے بچ نہیں سکتے۔ سب سے پہلے بوٹ مدھم ہونے شروع ہوتے ہیں اور پھر مانگ تک نوبت پہنچتی ہے کہ کبھی ہے اور کبھی ندارد۔ بوٹ، سوٹ، دل، دماغ سب کو ہند کی معاشرتی پھپھوندی کھا کر چھوڑتی ہے۔

ہاں مگر کبھی کبھی اگر دوست مل بیٹھیں تو . . . . . .

۶

یہ ذکر ہندوستان کے ایک شہر کا ہے۔

(نام نہ شہر کا لکھا جائے گا نہ کسی شخص کا۔ نام ان کے ہوتے ہیں جو کچھ ہوں اور جو کر سکیں۔ یہ جو وطن سے باہر کبھی زندہ رہے ہوں مگر وطن میں محض چلتی پھرتی لاشیں ہوں۔ کیا ان کا نام۔ کیا ان کے شہر کا پتہ؟ مگر یہ داستان سینکڑوں گھروں کی زندہ تاریخ ہے)۔

تار آنے پر مسٹر نو وارد معمول سے قدرے زیادہ نستعلیق طرز میں شام سے ذرا پہلے موٹر میں سٹیشن پر جانے کے لئے تیار ہیں کہ چھوٹی بہن آ نکلتی ہے۔

چھوٹی بہن۔ آ کا میاں! آج تو آپ بہت بشاش معلوم ہوتے ہیں۔ کیا بات ہے؟

نو وارد۔ منّی۔ میرے تین دوست آ رہے ہیں۔ صرف ایک رات کے لئے۔ لندن میں ہم چاروں بہت دیر یک جا رہے۔ سب کے سب لائق تھے اور اب کامیاب ہیں۔ مجھے بے انتہا شوق ہے کہ ان سے مل کر گپ بازی ہو گی۔

بیوی۔ کھانے کے لئے میں نے کہہ دیا ہے۔ پلاؤ ہو گا اور دو ایک سالن، مچھلی اور کباب تو خیر ہوں گے ہی۔ اور کچھ چاہیں تو بنوا دوں؟

نو وارد۔ سنئے میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ کھانا وہ لوگ شاید ہی کھائیں اور تکلف کا کھانا اگر آپ میری سنیں تو ہرگز طیار نہ کرایئے۔ سینڈوچ کافی رکھوا دیجئے۔

بیوی۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ کے دوست آئیں اور کھانا نہ بناؤں؛ سینڈوِچ بھی بھلا کوئی کھانے کی چیز ہے۔ مگر آپ اصرار کرتے ہیں تو ضرور تیار ہو جائیں گے۔

چھوٹی بہن۔ بھابی! کیا آپ آغا میاں کے دوستوں سے بھی پردہ کریں گی؛

بیوی۔ مُنی! پردہ ہے تو سب سے ہے۔

نووارد کے چہرے پر ایک غیر معلوم ثانیئے کے لئے بشاشت مفقود ہو جاتی ہے۔ مگر چھوٹی بہن اور بیوی کی طرف ہاتھ ہلاتا ہُوا موٹر میں سوار ہو جاتا ہے۔

سٹیشن پر چار دلی دوستوں کا ملنا، عرصے کے بعد ملنا اور تھوڑے عرصے کے لئے ملنا!!! "ہیلو" "ڈیم یو" "ابے ہیبڑ!" "ابے رنڈی فیل" "ابے شیطان کے گرو" اور اسی قسم کی بے تکی صلواتوں کے گویا طوفان کا بپا ہونا تھا۔ کہاں پُرانی تہذیب کہ دیر کے بعد ملو تو آب دیدہ ہو کر ملو۔ کہاں یہ نیا طریقہ کہ دلی مسرّت کو بدتمیزی کا برقع پہنا دو۔ ہاتھ بھی چلے۔ زبان بھی چلی۔ مگر اس تڑاق پڑاق اور گالی گلوچ میں طبیعتوں سے ہندوستان کا رنگ دُھل گیا۔ سامان ملازموں کے حوالہ کرکے موٹر کے پاس پہنچے بھلا نووارد کو خود اپنی موٹر کون چلانے دیے! ایک کر ایک نے WHEEL کو تھاما۔ دوسرے نے نووارد کو پچھلی سیٹ میں دھکیلا۔ جو موٹر چلانے بیٹھا وہ خوشی سے بولا PETROL بہت ہے پہلے بیس پچیس میل کا چکر لگائیں گے۔ یہ جا وہ جا۔ مضافات کے باغ دیکھے۔ رات ہو گئی تو شہر کی سڑکوں پر گھومے۔ ایک RESTAURANT سے BEER کی دو بوتلیں اُٹھا لائے اور پھر رات کے نو بجے گھر پہنچے۔ خدمت گار نے عرض کیا کہ حضور کھانا لاؤں کہ ایک کہنے لگا نہیں کھانا نہیں صرف سینڈوِچ لاؤ۔ دوسرا کہنے لگا ہاں دوست آج لندن کی رات مناؤ۔ کھانے کو GOOD BYE۔ تیسرا چہکا کہ یہ ہو جائے تو کیا کہنے مگر یار وہی شرط کہ عورت کا لفظ زبان پر نہ آئے۔ خوش طبعی کے اس ہُلڑ میں میزبان بھی بھول گیا کہ زندگی میں سوائے دوستوں سے مل کر خوش ہونے کے کوئی اور فرائض بھی ہوتے ہیں اور یہ چاروں گویا

طالب علم ہو گئے۔ نہ کوئی قائم مقام کلکٹر رہا، نہ کوئی کامیاب بیرسٹر۔ نہ انجنیئر، نہ ڈاکٹر، سینڈوچ Beer کا گلاس اور باتیں۔ کرکٹ میچ کی باتیں۔ جہاز کے سفر کی باتیں۔ اُستادوں کی باتیں۔ بچھڑے ہوئے ہم سبق کسی مدراسی۔ کسی بنگالی کی باتیں۔ باتیں اور بات بات پر قہقہے۔

ایک۔ ارے وہ مرہٹا چندر کہاں ہے جو انگریزی میں نظم لکھا کرتا تھا۔

دوسرا۔ سُنتا ہوں کہ اس کی دو چار نظمیں انگریزی رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں مگر یہ بھی سنا کہ وہ بیوی سے بھاگ نکلا۔

تیسرا۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ شاعری اور بیوی متضاد چیزیں ہیں۔

نوواردو۔ سچ کہتے ہو اسی لئے میں TENNYSON کو بڑے شاعروں میں شمار نہیں کرتا۔

دوسرا۔ یہ تمہارا ظلم ہے۔ ٹینی سن لاجواب چیزیں لکھ گیا ہے۔

نوواردو۔ (جلدی سے لعنت بھیجو اس کی لاجواب بجواس پر۔ جو شخص یہ لکھ سکتا ہے "Let more and more of reverence in us dwell" وہ کبھی شاعر ہو ہی نہیں سکتا۔

ایک۔ آج تو تم بہت مبالغے پر تلے ہوئے ہو۔

نوواردو۔ اچھا بحث کو جانے دو۔ کیا وہ تمہیں یاد ہے جس میں حُسن کا دعویٰ ہے کہ خدا اپنے ستارے سے اُترے "And bow before the wonder of my eyes"

اس کے بعد کی انگریزی گفتگو کا لطف اُردو میں بیان ہونا ناممکن ہے، انگریزی شاعری کا طوفان اُمنڈ پڑا۔ طالب علمی اور شباب! کسی نے کچھ پڑھا کسی نے کچھ۔ پورے دو گھنٹے گزر گئے اور خیال تک نہ ہُوا کہ رات آدھی جا چکی ہے۔ آخر ایک نے فرانسیسی شاعر BAUDLAIRE کا ذکر چھیڑا تو نوواردو بولا:۔

نوواردو۔ عرفی نے "خندۂ گلہائے بدنامی" کی ترکیب باندھی ہے مگر BAUDLAIRE کے FLOWERS OF EVIL کی گرد تک کو نہ پہنچ سکا۔

دوسرا۔ اچھا نواب یہ گلِ بدکرداری کاشت کرو کہ پاؤں پھیلا کر سو جاؤ۔

سب مل کر نووارد کو تو گھر کے اندر دھکیلتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ تم سوتے رہنا ہم صبح چل دینگے "نائٹ نائٹ اولڈ بوائے" اور "DAMN GOOD TIME WE HAVE HAD" کا شور مچ گیا۔

نووارد دوستوں کی خوشی کی شراب سے مخمور پلنگ کمرے میں داخل ہوتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ بیگم بیدار ہیں۔

نووارد:۔ ایسے۔ تم جاگتی ہو!

بیوی:۔ کون سو سکتا ہے۔ پکا پکایا کھانا آپ لوگوں نے غارت کیا نہ یہ بھی کوئی طریقہ ہے کہ کھانا برباد کیا نیند گنوائی اور پوری دو بوتلیں تم لوگ چٹ کر گئے۔ لندن میں یہی سیکھا ہوگا ان سب نے۔ مجھ سے تو رہا نہ گیا۔ پردے کے پیچھے سے جھانکا تو کیا دیکھتی ہوں کہ اچک اچک کر انگریزی میں سب کے سب کچھ بکے جا رہے ہیں۔ مجھے تو دیوانے معلوم ہوتے تھے۔ کسی اور کا بھی خیال کیا ہوتا۔ تم لوگ تو بچوں سے بدتر ہو گئے۔

انسانی دماغ کا گراموفون بعض وقت عجب طرح بجتا ہے۔ بیگم کی یہ عقل کی باتیں رہندوستانی عقل ہندوستانی غصہ سے کہیں زیادہ زہر آلود ہوتی ہے، سنتا جاتا تھا مگر اس کے دماغ میں وہ بالکل بھولے ہوئے فقرے گونجنے لگے "دوسروں کو خوش دیکھ کر کتنی خوشی ہوتی ہے"، "نیند بھی کیا فضول چیز ہے" "آپ کے چہرے پر SPIRITUAL LIGHT تھی"۔

نووارد کچھ نہ بولا۔ بیوی کچھ نہ سمجھی۔ متعجب ہو کر رہ گئی کہ شوہر یہ گنگنا رہا ہے:۔

ترسا بچۂ شوخے، شنگے شکرستانے

اِسے کیا پتہ کہ صنفِ نازک کی ایک دُور بیٹھی مغربی کلی اپنی مشرقی بہن کے آڑے آرہی ہے۔

شملے میں گفتگو کا خون

(۱)

سطح زمینِ ہند کا وہ حصّہ جہاں زمین کے چہرے پر بے شمار جھریاں ہیں اور ساتھ ہی سنگ صفت بڑے بڑے مہاسے ہیں جہاں خط نہ بنوانے کے باعث زمین کے چہرے کے بال گویا جنگل ہیں جن میں جوں کی بجائے بندر پھدکتے پھرتے ہیں سلسلۂ کوہ ہمالیہ کہلاتا ہے۔ بڑی جھریوں سے بچ کر چھوٹی جھریوں میں انگریزوں نے جن کی ہر بات الٹی ہے اپنی نئی پرانی البیلیوں کے لئے ایک تفریح گاہ بنا رکھی ہے، جس کا نام شملہ ہے۔ اس تفریح گاہ کے قواعد بھی اُلٹے ہیں۔ مشترکہ کھانا ہو تو شوہر بیوی سے بچ کر دُور کہیں بیٹھتا ہے۔ ناچ ہو اور شوہر اپنی ہی بیوی کے ساتھ ناچتا چلا جائے تو میم صاحب بدنام ہو جاتی ہیں کہ انہیں کوئی پوچھتا نہیں۔ تاش کا کھیل ہو تو خاص انتظام کیا جاتا ہے کہ مسٹر اور مسز ایک ہی میز پر نہ کھیلیں۔ گویا خود اپنی جورو سے میل جول بات چیت ہنسی مذاق حرام ہیں۔

اس تہ و بالا اُس نیم صاحب نگری میں کچھ عرصے سے ہندوستانی فصلی ٹڈیاں بھی چگنے چلی آتی ہیں اور بغیر شملہ کے مرکزی اصول کو سمجھے یہ لوگ رکشاؤں پر آفت ڈھا دیتے ہیں۔ مگر جب دیکھو تو یہ دیکھو کہ آگے بیوی پیچھے شوہر۔ صبح اکٹھے، دوپہرا کٹھے، چاء پر پہلو بہ پہلو اور کھانے پر بھی قریب قریب۔ کبھی کسی لالہ یا میاں کو موقع ہی نہیں ہوتا کہ گھر والی سے پوچھے کہ آج تم کہاں رہیں، کس سے ملیں۔ جو لوگ گفتگو کی دلچسپی کا گلا اس بے دردی سے گھونٹ دیں ان سے کوئی پوچھے کہ آپ خواہ مخواہ شملہ کو ناپاک کرنے کیوں مُنہ اُٹھائے چلے آتے ہیں۔

(۲)

نوجوان ۔ مس ناچار! کیا کل آپ پردہ پارٹی میں شریک ہوئیں۔

مس ناچار ۔ جی ہاں ۔ بڑا لطف رہا ۔ لیڈی بلینک جو ہماری معزز مہمان تھیں ہر ایک سے بے تکلف ملتی تھیں
دل موہ لینے میں لیڈی بلینک کو کمال حاصل ہے ۔

نوجوان ۔ بڑی شاندار ساڑھیاں دیکھنے میں آئی ہوں گی؟

مس ناچار ۔ ساڑھیاں ۔ زیور اور ان سب سے بڑھ کر نرالی وضع کے کمخواب و اطلس کے جوتے اور
چپلیاں ۔ خاصی نمائش تھی ۔ MOTHER کہتی تھیں کہ موتیوں کے ہاروں کی تو حد ہوگئی تھی ۔

نوجوان ۔ مگر تم تو پھر بھی سب سے ممتاز ہی نظر آتی ہوگی؟

عین اس موقع پر MOTHER صاحبہ بول اٹھتی ہیں کہ بیٹا جا تو ان کے لئے کچھ پھل لاؤ (گفتگو کا خون ہوگیا)
شملہ اس لئے نہیں بنایا گیا تھا کہ بیٹی بات کرتی ہو اور ماں بیچ میں بول اُٹھے ۔ ایسی mother کو
جنابہ کہنا ہرگز اس کی توہین نہیں ۔ یورپین MOther ہوتی تو تھوڑی دیر کے لئے کہیں اِدھر اُدھر کھسک
جاتی مگر جنابہ قسم کی شملہ میں جتنی مائیں ہیں وہ اس قسم کے اخلاقی گناہ روز کرتی ہیں اور بے دریغ کرتی ہیں
نوجوان بیچارہ اتنا بھی نہ کہنے پایا کہ تمہاری نورانی صراحی دار گردن پر ہزار ہار قربان ۔

(۳)

شملہ میں ہندوستانی جیبوں میں چھپے ہوئے نوٹوں کو کھینچ لینے کی ایک مشین ہے جس کا نام
Devico Ball Room ہے ۔ اصل میں تو Ball room اس لئے ہوتا ہے کہ اُس پر
پاؤں نہ ٹکیں ۔ کمر میں ہاتھ ہوں ۔ کانوں میں راگ ہو اور خوش لباس پری وش ناز آفرینیاں کریں مگر ہندستانی
کھوپڑی Ball Room میں کرسی بچھا کر چار نوشی پر ہی خوش ہے ۔ کرسی بھی ایسی کہ انسان سارے کا سارا اس
میں دھنس جائے ۔ بھولے سے بھی پاس بیٹھنے والی سے مس کا شبہ نہ ہو ۔ دو دو سو تین تین سو

ہندوستانی درجنوں دفعہ ان کرسیوں میں محصور ہوئے اور دام دے کر چلتے بنے۔ یہ کسی سے نہیں ہوتا کہ اچھا کھایا ہے تو کھانے کے بعد ہی خوش خرامی سے (اور خوش خرامی میں خوش کلامی سے) اس کھائے پیئے کو حلال کرے۔ بال روم سے نکلتے ہی یہ جا وہ جا۔ یہ فصلی بٹیریں کیا بلا کی پیٹو ہیں۔

مرد۔ (اپنی کرسی سے اُٹھ کر ایک دوسری کرسی کے پاس کھڑا ہو کر) مسز صفدر۔ کیا اچھی پارٹی رہی۔

مسز صفدر۔ جی ہاں۔ دیکھئے تو سبھی موجود ہیں اور آرام کتنا ہے اور ان لوگوں کا انتظام کتنا اچھا ہے۔

مرد۔ کہئے تھوڑی دیر سیر کو تشریف لے چلیں گی مگر ٹھنڈی سڑک پر نہیں۔ آیئے جاکو کے اوپر چلیں۔ تازہ ہوا کھائیں۔

مسز صفدر۔ او ہو کتنا اچھا ہو۔ اوپر سے شملہ کا شام کا نظارہ بھی نہایت پُر لُطف ہو گا اور VIOLET HALL کا خود اپنا تاریک منظر کس قدر دلفریب ہے۔ جی تو بہت چاہتا ہے مگر ان سے پوچھتی ہوں۔

(شوہر کی طرف مخاطب ہوتی ہے) آپ سیر کو چلیں گے؟

مسٹر۔ ضرور چلتا مگر کھانے پر جانا ہے اور وقت تنگ ہے۔

گفتگو مر جاتی ہے۔ خود تنہا کھانے پر جانے والے اور بیوی کو سیر سے روک کر گھر بٹھا جانے والے اخلاق کُش لوگ ابھی تک شملہ میں کافی ہیں۔

(۴)

شملہ میں ایک خیابانِ دلدادگاں ہے جس میں یورپین جوڑے چہل قدمی کے لئے نکلتے ہیں۔ ان لوگوں کی تمیز کی جس قدر داد دی جائے کم ہے کہ اگر ایک سے زیادہ جوڑا ہو تو آپس میں مصلحت آمیز فاصلہ بالکل بلا تکلف قائم کئے رہتے ہیں۔ "کسے را با کسے کارے نباشد" کی عملی تہذیب زندہ کر کے دکھلا دیتے ہیں۔ جانتے ہوئے دیکھتے ہوئے اپنے آپ کو یقین دلا دیتے ہیں کہ کچھ نہیں دیکھا، کچھ نہیں سمجھا۔ اس خیابانِ دلدادگاں کا ہندوستانی جواب، وہ "نفرستانِ وارفتگاں" ہے جو ہنگی دُکانوں

کے سامنے سستا سا چار سو گز کا سڑک کا ٹکڑا ہے۔ اگر کسی نادر اتفاق سے دو ہستیاں پہلو بہ پہلو چل رہی ہوں تو تیسرا ضرور لپک کر ساتھ ہو لے گا۔ خدا جانے ہندوستانی کیوں اس قدر تثلیث کے گرویدہ ہیں؛ بہرحال تثلیث گفتگو کے لئے زہر قاتل ہے۔ دو باتیں کرتے ہیں تین بکتے ہیں۔

(۵)

اس سستے ہجوستان کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ دکانوں کے سامنے، سڑک کے بیچ، سڑک کی پرلی طرف چار چار، پانچ پانچ کی متعدد ٹولیاں بے ہنگم طریق سے ڈھیروں رکھی رہتی ہیں۔ بالکل اس طرح کہ جیسے مہتر نے کوڑا جمع کر کے ڈھیر لگا دیئے ہوں مگر لے جانا بھول گیا ہو۔ ان ٹولیوں میں کسی کی ٹانگ ٹوٹی کمان کی طرح خم کھائے ہے تو کسی کی دونوں ٹانگیں موری دروازے کا فوٹو ہیں۔ چلا جاتا نہیں۔ کھڑا ہوتا آتا نہیں مگر زبان رکتی نہیں۔ اِدھر کی اُدھر کی ہزاروں باتیں ان ٹولیوں میں ٹڈیوں کی طرح اچھلتی ہیں مگر گفتگو کا نام نہیں۔ اس لغرستان میں البتہ شاہکار چار یا پانچ آئیوں کا حصّہ ہے جو اکٹھی آٹھ دس سب ایک ہی وقت بلند آواز سے گفتگو کرتی ہوئی چیختے بچوں کو گھسیٹتے ہوئے رینگ رینگ کر سڑک سے گزر جاتی ہیں۔ اس وقت شملہ زبانِ حال سے کہتا ہے۔

بائیو بلا کے کیوں مری مٹی خراب کی

ایک خط

اسمبلی کے شاندار کتاب گھر میں نیلے نیلے سنگ مرمر کے خوبصورت ستونوں کے پہلو میں یہ خط لکھا جا رہا ہے۔ یہ عمارت کونسل ہوس کے مرکز میں جو گنبد ہے اس کو سنبھالے کھڑی ہے۔ اس گنبد میں تقریروں کی بازگشت صدا کم ہوتی ہے۔ پہلو کی گردش میں کتابوں کی الماریاں لکھنے کی میزیں ہیں عین گنبد کے نیچے تین میزوں پر ہندوستان بھر کے اخبار لدے ہیں۔ کچھ نشست کی سُرخ مخملی گدّے دار کرسیاں ہیں۔ اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ کے ممبر بیٹھے ہیں۔ اخبار پڑھتے ہیں۔ خط لکھتے ہیں۔ نیلے نیلے سنگ مرمر کے ستون خاموش کھڑے تعجب کرتے ہیں کہ یہ باشندے کیوں آتے جاتے کبھی پڑھتے ہیں کبھی لکھتے ہیں کبھی سوتے ہیں۔ شاہزادہ ویلز کی قدِ آدم تصویر اور دو تین بت (ایک گوکھلے کا) لارڈ چیمسفورڈ اور لارڈ ریڈنگ کی تصویر کبھی کبھی نگاہوں کو اسیر کرتی ہے۔ مگر زندہ انسان بتوں اور تصویروں سے نہیں بہلتا۔ لکھتا ہے، پڑھتا ہے، بولتا ہے اور پھر چلا جاتا ہے۔

کیا یہ ستون کبھی کچھ نہ کہیں گے؟ تم بتاؤ بشیر؟

میں تمہیں یاد کرتا ہوں یہ ستون کیا کھلا رہے ہیں؟
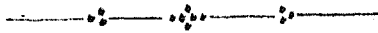
جَو کی روٹی، مٹی کا پیالہ

تاریخی واقعہ صرف اس قدر ہے کہ جب ایران سے شہنشاہ ہمایوں از سرِ نو قسمت آزمائی کے خیال سے روانہ ہونے کو تھے تو کسی غیر معمولی قلبی کشش سے متاثر ہو کر انہوں نے اپنی پھوپھی زاد بہن کو فرمانہ خط لکھا کہ آپ میرے ہمراہ ہندوستان چلیں۔ خانم جہاں اس خط کے پہنچتے ہی مع اپنی کمسن لڑکی کے ایران کی سرحد پر آ پہنچی۔ تیموری آداب کا تقاضا یہ تھا کہ ہمایوں خود ہمشیرہ کی خدمت میں حاضر ہو۔ ایرانی جاہ پرستوں کا مشورہ یہ تھا کہ خانم جہاں محل میں حاضر ہو کر درباداری کریں مگر تیموری غیرت غالب آئی اور ہمایوں ایک سعادت مند چغتائی کی حیثیت سے خانم جہاں کے خیمہ میں حاضر ہوا۔ ترکی بھولی تو نہ تھی مگر ایران میں دس سال کی آرام طلبی نے کچھ کچھ ترکی طرزِ تکلّم سے ناآشنا سا کر دیا تھا۔ خانم جہاں مسکرائی اور بھائی کی پیشانی پر خواہرانہ اظہارِ اُلفت کر کے بولی:۔

خانم جہاں۔ مرزا! زبان گئی تو گئی چغتائی تلوار نہ لڑکھڑائے!

ہمایوں۔ اکا۔ آپ ہمراہ ہوں گی تو بجلی کی طرح چمکے گی۔ افغان کھوپڑی کو کدو کی طرح کاٹے گی۔

خانم جہاں۔ انشاء اللہ۔ مرزا۔ میرے پاس یہ مٹی کا پیالہ ہے، جَو کی روٹی ہے۔ چنگیز اور تیمور کے گھرانے کی لڑکیاں بھائی کی اس سے بڑھ کر خدمت نہیں کر سکتیں کہ سمرقند کا پانی سمرقند کی مٹی میں پیش کریں۔ پانی پیو، جَو کی سوکھی روٹی کھاؤ اور یہاں سے کم از کم دس کوس پر جا کر دم لو۔ اگر ہندوستان فتح کرنا ہے تو رات کو دن کر دو۔

خانم جہاں کے الفاظ ہمایوں کی تیموری رگوں میں برقی اثر کر گئے۔ یا تو کچھ دن آرام کا خیال تھا

یا نوراً حکم دیا:-

"دم نہ لو - بڑھو - اُڑو"

یہ حکم ترُکی میں تھا۔

(۲)

ہندوستان فتح ہوگیا۔ ہمایوں جمنا کے کنارے ہند کی گود میں جا لیٹا۔ خانم جہاں خواب وخیال ہوگئی۔ اس کی کم سن لڑکی جس کی شادی خالص چغتائی خاندان میں ہوئی تھی کافی عمر پاکر سمرقند کی مٹی میں مٹی ہوگئی۔

(۳)

شاہنشاہِ جہانگیر ایک دن نور جہاں سے کچھ ناراض سے تھے۔ اس خفگی میں تیموری خون کا جو نصف حصہ باقی تھا وہ کچھ کھولا۔ دادا کی پھوپھی زاد بہن کا مٹی کا پیالہ۔ جو کی روٹی یاد آئی۔ ترُکی ابھی بھولی نہ تھی۔ ترُکی میں مراسلہ لکھا اور حکم دیا کہ مع تحائف خانم جہاں کی نواسی کی خدمت میں سمرقند جاکر پیش کرو۔

مُراسلہ نہ تھا روحانی تڑپ کا مرقع تھا۔ یعنی جہانگیر کا رُواں رُواں دُہائی دے رہا تھا کہ " اے میرے آبائی وطن میری فریاد سُن - سپاہی زادہ ہو کر قفسِ عیش میں بند ہوں مجھے رہا کر دے۔ راحت پسند کو پھر شمشیر زن کر دے۔ میں تجھ تک پہنچ نہیں سکتا تو مجھ تک کسی صورت میں آجا۔ اے کاش کہ کوئی تو میرا اپنا ہو!" گویا خط نہ تھا قلبی کشمکش کی بولتی ہوئی تصویر تھی اور کیوں نہ ہوتی؛ خون خون کو پکار رہا تھا۔

(۴)

خانم جہاں کی نواسی رشید جہاں خط دیکھ کر حیران ہوئی مگر تیموری فہم، تیموری عزم دونوں برقرار تھے۔ سمجھ گئی اور جہانگیر کے تحائف سمرقند میں تقسیم کر کے ایک گھوڑے پر آپ، دوسرے پر ایک چنگیزی جال نثار، سمرقند سے چل پڑی۔ لاہور عین اُس وقت پہنچی جب شاہنشاہ جہانگیر کشمیر کے سفر کی تیاری میں تھے شاہنشاہ

بھول بھی چکا تھا کہ کسی کو بلوایا ہے۔ نورجہاں سے جو عارضی ملال تھا مدت سے مٹ چکا تھا۔ اطلاع ہوئی کہ رشیدؔ جہاں سمرقند سے آپہنچی۔ نورجہاں کو اشارہ کیا کہ ہماری آپا ہے تم جا کر لوا لاؤ۔ وزیر بولا:۔

وزیر۔ جہاں پناہ! جاں بخشی ہو تو عرض کروں۔

شاہنشاہ۔ ہاں۔ کیا ہے۔

وزیر۔ شاہزادی رشید جہاں کا پیغام ہے کہ تیموری آداب کے مطابق مرزا خود ہماری خدمت میں حاضر ہو۔

شاہنشاہ۔ وہ ٹھیک فرماتی ہیں۔ شاہنشاہ اگر میں ہوں تو ہندوستان کے لئے ہوں۔ اُن کے لئے تو واقعی صرف مرزا ہوں۔ کہلا بھیجو کہ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔

اداشناس ایران بھلا کب چوکتا تھا۔ بادشاہ سلامت کا رُجحان دیکھتے ہی نورجہاں نے اشارہ کیا۔ سونے چاندی کے ظروف، اطلس کمخواب کے تھان، اشرفیوں کی تھیلیاں۔ پالکیاں۔ فرش فروش۔ خیمے غلام، لونڈیاں، خواجہ سرا، داروغہ، فوج کا دستہ رشیدؔ جہاں کے مختصر خیمہ کے سامنے آن کی آن میں موجود ہو گئے۔ ملکہ نورجہاں کی اس شاندار پیشکش نے شاہزادی رشیدؔ جہاں کے دل پر خاص اثر کیا، مگر ابھی کچھ کہنے نہ پائی تھی کہ بادشاہ سلامت تشریف لائے۔

رشید جہاں۔ مرزا! نانی مرحومہ کی وصیت تھی کہ وہ مٹی کا پیالہ جس میں ہمایوں نے پانی پیا محفوظ رہے۔ وہی لائی ہوں۔ لو سمرقند کا پانی پیو۔ سمرقند کے گُن گاؤ اور دس کوس پر جا کر دم لو۔

جہانگیر۔ زہے قسمت کہ داداجان کے استعمال شدہ پیالہ میں سمرقند کا پانی نصیب ہو۔ لائیے۔

رشید جہاں۔ بسم اللہ۔ مگر یہ نہ بھولے کہ دس کوس پر دم لینا ہوگا۔

جہانگیر۔ نہیں ہرگز نہیں۔

پانی پیتے ہی پھرتی کی میں حکم ہُوا:۔

"دم نہ لو۔ بڑھو۔ اُڑو"

(۵)

رشید جہاں نے چار مہینے دربار داری میں کشمیر میں کاٹے۔ شاہنشاہی جشن شبانہ، عیش جاودانہ سے خوگر نہ ہوئی۔ موقع پاتی تو اپنے چنگیزی جاں نثار کو ہمراہ لے کر کشمیر کے کوہستانی علاقوں میں کبھی سوار کبھی پیادہ خنجر آزمائی کرتی رہتی۔ تنیندوا۔ ریچھ۔ شیر جو مل جائے منہ نہ موڑتی۔ ایک شیر نے زخمی بھی کیا۔ مگر تیموری رگ و ریشہ زخم کی کیا پرواکرتا؟ بنا ہی زخموں سے اچھا ہونے کے لئے تھا۔ جہاں پناہ نے دو ایک دفعہ دبی زبان میں جرأت کی داد بھی دی مگر ڈرتے ڈرتے اس لئے کہ تیمور کی اولاد کے لئے مرد ہو یا عورت جرأت کوئی فخر نہ تھا۔ اشارۃً یہ بھی کہا کہ تنہا شیر کا مقابلہ ہو جائے تو مضائقہ بھی نہیں مگر ہر دفعہ نہیں۔ اس پر رشید جہاں نے یہ کہہ کر ٹال دیا "کیا کروں کہ ان جنگلوں میں ہاتھی نہیں۔"

(۶)

دربار ابھی کشمیر ہی میں تھا کہ افواہ پھیلی کہ شاہزادی رشید جہاں شاید جلد ہی سمرقند واپس جانا چاہتی ہیں۔ افواہ پھیلانے والوں کا خیال یہ تھا کہ شاید ملکہ عالم ملکہ نور جہاں یہ خبر سُن کر خوش ہوں۔ بلکہ دراصل چند رموز شناس درباردارں نے سازش کر کے یہ افواہ پھیلائی تھی۔ یہ منصوبہ بازی دربار کے لئے معمولی شغل تھا۔ نور جہاں سُن کر مُسکرائی، پھر ہنسی اور یہ کہہ کر کہ "خوب می شناسم" سیدھا جہاں پناہ کے حضور میں دست بستہ آ کھڑی ہوئی۔ تخلیہ ہو گیا۔

نور جہاں۔ جہاں پناہ خطا معاف ہو تو کچھ عرض کروں۔

جہانگیر۔ جانِ من! کیسی خطا کیسی معافی تم حکم کرو۔

نور جہاں۔ جہاں پناہ یہ معاملہ حکم کا نہیں محض ایک التجا ہے۔

جہانگیر۔ آخر کچھ کہو تو سمجھ میں آئے۔

نور جہاں۔ کیا جہاں پناہ کا خیال ہے کہ چغتائی شہزادی رشید جہاں سے مجھے کچھ کد ہے؟

جہانگیر۔ ہرگز نہیں بلکہ میرا خیال ہے کہ سارے ہندوستان میں تم ایک اس کی سچی قدر دان ہو۔
نور جہاں۔ ظل الٰہی کا یہ ارشاد القار ربانی سے کم نہیں۔ میں دل سے چاہتی ہوں کہ جہاں پناہ اُسے محلسرا
میں داخل کریں۔ میں آپ کی اور اُس کی کنیز بن کر رہوں گی۔
جہانگیر۔ تم بہت دانا ہو مگر اس معاملہ میں تم قطعی بے خبر ہو۔ آنجہانی دادا جان کی وصیت تھی کہ میری اولاد
کو جب کوئی مصیبت ہو تو خانم جہاں کی اولاد سے مشورہ لیا جائے۔ خانم جہاں کی اولاد چغتائیوں کی
محافظ ہے۔ ان کو بھی خانم جہاں کی پشت در پشت وصیت ہے کہ ظہیر الدین بابر کی اولاد کے کام
آسکو تو دریغ نہ کرنا۔
نور جہاں۔ اس سے بہتر وہ کیا مدد کر سکتی ہیں کہ محل میں داخل ہوں۔
جہانگیر۔ اصل چغتائی کے لئے محل قید ہے مگر چونکہ تم اکا کی قدر دان ہو تم خود اُن سے مل کر گفتگو کر
لو۔ تمہارا اطمینان ہو جائے گا کہ میری رائے صحیح ہے۔

(۷)

نور جہاں جب اکا کے خیمہ کی طرف بے تکلف بلا اطلاع کرائے اور بلا کسی شاہانہ جاہ و حشم کے روانہ
ہوئیں تو دربار انگشت بدنداں تھا کہ ملکۂ عالم اور اس سادگی سے ایک سمرقندی اجنبی کی طرف جا رہی
ہیں۔ دونوں بیگمات ملیں۔ قہوہ اور میوہ پیش ہوا۔ پھر تخلیہ۔
نور جہاں۔ اکا۔ میں آپ کی خدمت میں ایک خاص التجا لے کر آئی تھی لیکن مجھے پہلے یہ کہنا ہے کہ
گو میں بھی حسین ہوں مگر آپ کے قد کی رعنائی غضب ہے۔ اور آنکھوں والے تو تمہیں بے انتہا
حسین تصور کرتے ہوں گے۔
رشید جہاں۔ بیگم خفا نہ ہوں تو عرض کروں کہ خدا نہ کرے کہ میں حسین ہوں۔
نور جہاں۔ ایں۔ یہ کیا کہا؟

رشید جہاں۔ حسین ہو تو تم سا ہو ورنہ سادہ رو ہونا ہی اچھا ہے۔ اور قدرت کے کھیلوں میں یہ سب سے عجیب کھیل ہے کہ حسین عورت آج تک جب سے آسمان نے زمین کو ڈھانکا ہے کبھی اولاد کی طرف سے مطمئن نہیں ہوتی۔ میں سمرقند واپس جانا چاہتی ہوں وہاں جس میرے دل کے سردار کو میرا انتظار ہے اس کے بے رونق خیمہ میں اس کے بہادر بچوں کو پالوں گی۔ بیس تیس پشت کے بعد پھر شاید ہم سے کوئی تیمور اور بابر پیدا ہو۔ فی الحال تو ہندوستان نے ہماری ایک شاخ کو چٹ کر لیا ہے۔ بیگم تم اندازہ نہیں کر سکتی ہو کہ میں تمہارے شان دار دربار کو کس نظر سے دیکھتی ہوں۔ بارہا تعجب ہوا تو یہی ہوا کہ تیموری گھرانے کے دربار میں شاعر اور شہدے بہت اور سپاہی اور سرفروش کم۔ حیران ہوتی رہتی ہوں کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے کہ جس مرد کو دیکھو کمر میں تلوار ندارد، مگر گلے میں موتیوں کا کنٹھا۔ جہاں مرد زیور پہنتے ہیں وہاں عورتیں تو ضرور ننگی رہتی ہوں گی۔ کیا ان عیش کے پتلوں کو اتنا بھی علم نہیں کہ مرد کا زیور زخم ہیں نہ کہ موتی۔ بیسیوں دفعہ دربار میں غور سے دیکھا۔ اُمرا نے تحائف میں سونے اور موتیوں کے ڈھیر پیش کئے مگر ان نکموں میں سے سوائے چند راجپوت امرا کے کبھی کسی نے مرزا کو مفتوح دشمنوں کی تلواریں اور ڈھالیں نذر نہ کیں۔ آخر یہ سب کے سب نام کے مرد روز و شب، ماہ و سال دربار میں کرتے کیا ہیں؟ ہمارے ہاں تو فتح کے بعد جشن ہوتے ہیں۔ کامیاب شکار کے بعد جام چلتا ہے اور یہاں روز جشن اور صبح و شام دمبدم کے جام میں تو ہندوستان کی فضولیات سے اُکتا گئی۔ اتنا البتہ ضرور کہوں گی کہ چغتائیوں کا اگر کوئی سچا رفیق ہے تو چند بڑے گھرانوں کے راجپوت۔ وہی لوگ کچھ تلوار کے دھنی بھی ہیں۔ شاید جَو کی روٹی کھاتے ہوں گے!

نور جہاں۔ آپا آپ ٹھیک فرماتی ہیں اس ملک کے مسلمانوں میں بے انتہا آرام طلبی ہے۔ خود تو ایران دیکھا نہیں مگر سنتی ہوں کہ وہاں سے بھی یہاں کہیں زیادہ عیش پرستی ہے۔ یہاں تاتاری جرأت

کی، تیموری تُرکتازی کی تلاش عبث ہے۔

رشید جہاں۔ بیگم مجھے انتظار تھا کہ کبھی آپ بے تکلف تشریف لائیں تو آپ سے درخواست کروں کہ آپ میرے ناچیز تحفہ کو قبول فرمائیں۔ یہ لیجئے ایک سادہ دست بند۔ آپ کے لئے سمرقند سے لائی تھی۔ (نورجہاں بیگم اس دست بند کو آنکھوں سے لگاتی ہے) یہ ہے بھی اس قابل۔ شاہنشاہ بابر نے اپنی ہمشیرہ کو دیا تھا۔ حق بحقدار رسید۔

نورجہاں۔ میں آپ کی دریا دلی دیکھ کر تعجب کرتی ہوں۔ جہاں پناہ نے آپ کو تحائف دیئے وہ آپ نے سب بانٹ دیئے۔ اپنے لئے کچھ نہ رکھا۔

رشید جہاں۔ سنو بیگم، تیمور کی اولاد دُنیا میں اپنے آپ کو لٹوانے آتی ہے۔ جب ہم میں سے کوئی حساب کر کر کے جمع کرنے والا پیدا ہوگا تو یقیناً تیموری عزم مٹ جائے گا۔ ہم لوگوں کی سب سے بڑی دولت ہمارا خالص خون ہے۔ ہم اس کے بہانے اور لٹوانے میں دریغ نہیں کرتے تو اور کسی چیز کو کیا رکھیں گے؟

نورجہاں۔ خدا کے لئے آپ مجھے اپنا سچا قدردان سمجھیں اور کوئی ارشاد کریں جو میں پورا کرسکوں۔

رشید جہاں۔ مرزا سے مجھے سمرقند واپس جانے کی اجازت لے دیجئے۔ میں نانی مرحومہ کی وصیّت کی پابندی میں چلی آئی۔ جو اوربانی لائی تھی۔ وہ دے چلی۔ مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ خانم جہاں کی اولاد کے ذمہ آئندہ اب شاید ہی کوئی خدمت ان ہندی مرزاؤں کی طرف سے تفویض ہو۔

(۸)

جہانگیر۔ کہو جانِ من! تم کچھ متفکر سی ہو! خیر تو ہے؟

نورجہاں۔ جہاں پناہ! دیکھئے یہ دست بند مجھے آگا نے دیا۔ فرماتی تھیں کہ شاہنشاہ بابر نے اپنی ہمشیرہ کو دیا تھا اور مجھے رشید جہاں نے یہ کہہ کر دیا "حق بحقدار رسید"۔

جہانگیر۔ اور کیا باتیں ہوئیں؟

نورجہاں۔ جہاں پناہ وہ بات تو میں زبان پر بھی نہ لا سکی۔ رشید جہاں کو ہمارے دربار سے اپنے جنگلی خیمہ و خرگاہ زیادہ مرغوب ہیں۔ کس قدر اس چغتائی شہزادی کو اپنے صحیح النسب چغتائی ہونے پر فخر ہے، میں تو اُس کے سامنے جھینپ گئی۔

جہانگیر۔ وہ سچی ہے مگر ہند کا بھی ہم پر حق ہے۔ محمود غزنوی یہاں کی دولت لے گیا مگر اپنا ایاز یہاں چھوڑ گیا۔ موت کے اس ایک حملہ نے محمود کے سترہ حملوں کا کافی جواب دے دیا۔ ہم لوگ اب یہاں کے ہو چکے۔ سمرقند کا پانی یہاں خون بن کر بہا۔ تب جا کر یہ سلطنت نصیب ہوئی مگر یہ بھی چند پُشت کی بات ہے۔ تم کچھ خیال نہ کرو۔ قبلہ مرحوم کا شاعر کہہ گیا ہے ؎

جامِ مے در دست گیر و پا بہ گلشن نہ کہ باز
باد دست افشاں در آمد آب پا کوباں رسید

لاؤ تم مجھے ایک جامِ مے دو۔ پہلو میں بیٹھو اور سمرقند کو بھول جاؤ۔

جہاں پناہ جب ایک آدھ جام پی کر افکارِ سلطنت سے اِک گونہ آزاد ہوئے تو نہایت لُطف سے اپنی محبوبۂ دلنواز سے فرمانے لگے۔

جہانگیر۔ کہو جانِ من! میں اس تمہارے کھیل کو کہ تم مجھے مشورہ دو کہ رشید جہاں کو محلسرا میں لاؤں کیا سمجھوں؟ کیا تم میری وفا کا امتحان لے رہی تھیں یا کچھ اور مدِ نظر تھا؟

نورجہاں۔ جہاں پناہ۔ عورت، ہاں کوئی معمولی عورت کبھی اپنے شوہر سے اس قسم کی التجا نہ کرتی۔ مگر میں معمولی عورت نہیں۔ میں ملکہ ہوں اور آپ کے دل کی ملکہ ہوں مگر اس سے بھی بڑھ کر مجھے فخر یہ ہے کہ آپ کی جان نثار ہوں۔ آپ میرے ہیں میں آپ کی ہوں مگر سلطنت چغتائی ہے اور میں باوجود ایرانی ہونے کے دل سے چاہتی ہوں کہ چغتائی باغ ہرا بھرا رہے۔ آپ کی سلطنت کے

استحکام کے لئے میری خوشی، میری شان، میری آرزوئیں سب قربان ہو جائیں تو بھی کچھ پروا نہیں۔ جو تجویز پیش کی تھی وہ محض اس نیت سے تھی ورنہ کون عورت ہے جو تاج و تخت میں کسی دوسرے کو شریک ہوتے دیکھ سکے۔ اگر اس شہزادی کو آپ محل میں داخل کر لیتے تو ممکن تھا کہ سمرقند و بخارا سے بنگالہ اور لنکا تک صرف آپ کا سکہ چلتا۔

جہانگیر۔ خدا جانے تم باور کرو یا نہ کرو مگر جو بادشاہ ہوتے ہیں چاہے وہ مجھ جیسے گناہگار ہی کیوں نہ ہوں کبھی حد تک غیب دان ہوتے ہیں۔ مجھے ایک صدی کے بعد چغتائی چراغ گل ہوتا نظر آتا ہے۔

نورجہاں۔ قربانت شوم ایسی بات زبان سے نہ نکالئے۔

جہانگیر۔ اب تو نکل گئی۔ لاؤ ایک پیالہ اور۔

نورجہاں۔ میری سنیں تو میں یہی کہوں کہ شیرازی انگور سے سمرقند کے جو اچھے۔

(۹)

کہتے ہیں کہ شاہنشاہ فرخ سیر نے پنجاب کی ایک کٹھن مہم کے وقت ترکی میں خط لکھوا کر سمرقند قاصد روانہ کیا تو قاصد یہ جواب لایا:۔

”مرزا!

وہ جو سوکھ گئے۔ وہ پانی بہ گیا۔ وہ پیالہ ٹوٹ گیا“

نہ کھنچنے والی تصویر

(۱)

اے کاش ترے باجے پر
رکھا ہو ترا البم
وہ جس میں کہ چاہنے والے،
کانپتے ہاتھوں سے
لکھ دیتے ہیں افسانے
بیتاب دلوں کے
بے طور مچلنے کے

(۲)

تو راگ کی دُھن میں
سُن پائے نہ آہٹ
اُس میرے سکوں کی
جو دیکھ کے تجھ کو
آلیتا ہے مجھ کو
ایسے، کہ مرے پاؤں
گو لاکھ جتن کر لوں
بڑھنا تو بھلا کیا
ہل بھی نہیں سکتے

(۳)

بُت بن کے،
مَیں
بُت کے پیچھے
کچھ دیر تو ٹھیروں، پھر
پُرشوق نگاہیں
لپٹیں ترے البم سے
اور سحرِ تخیّل سے
لکھ ڈالیں یہ سطریں

(۴)

اِک عکس ہے دِل میں،
پیارا ابھی ہے بھولا بھی

اور حد سے زیادہ ضدی!
آتا ہے، چلا آتا ہے
بنتا ہے، بگڑتا ہے
ٹالے سے نہیں ٹلتا ہے
ہر شان ہے اس میں
حُسن کی رعنائی کی۔

(۵)

اس عکسِ دلآرا کے
روزانہ کے پھیروں کا
راز میں کیونکر کھولوں
کوئی بلائے تو میں بولوں
فی الحال تو قصّہ یہ ہے
اک عکس ہے
لاکھ اس کی جھلک ہے
تصویروں کا یہ تختِ رواں
مرکز ہے مری قسمت کا

(۶)

تنہائی کی تاریکی سے
ڈھانکے ہوئے رکھتا ہوں
اس عکسِ منوّر کو
گویا کہ یہ کعبہ ہے
کالا ہے غلاف اس کا

(۷)

میں یونہی اگر
پاس کبھی اس کے
جس کا یہ کرشمہ ہے
محفل میں کسی گھر کی
آنکھوں کہ گزر جاؤں
ہرگز نہیں وہ تکتی
کون آیا؟ گیا کیسے؟

(۸)

پہلو میں بھی اس کے
بیٹھا ہوں کئی بار
دھک دھک سے مگر دل کی
ہو کر کے میں ناچار
اُٹھ بیٹھا ہوں پر اس نے

ہرگز نہیں پوچھا
جاتے ہو کہاں ؟ بیٹھو

(۹)

ہوتا ہی نہیں اس کو
بھولے سے بھی ہرگز
اتنا سا گماں بھی
چھو جائے تلطف سے
گر ہاتھ مجھے اس کا
اس سادہ سے منتر سے
پھر جائیں مرے دن

(۱۰)

سحرِ تخیّل سے
یہ نقش بنے جب
اس شوخ کے البم پر
اور تو کھینچ کے اس کو
پڑھ ڈالے یہ سطریں
اور پھر پھینک کے اس کو
حیران سی ہو کر
ہلکے سے سروں میں
بیساختہ یوں گائے
یہ کس لڑکی کا قصہ ہے ؟
نہیں سمجھی ہیں کچھ بھی
بہت انجان ہو گی
نہ سمجھی ہو گی کچھ بھی

(۱۱)

گاتے ہوئے یونہی
مڑ کر مجھے دیکھے
اور بھولی ادا سے
ہنستے ہوئے کہہ دے ۔
"تم آئے کب سے ؟" "بیٹھو"۔
"سمجھ کر بھی
نہیں سمجھی ہیں کچھ بھی"۔

فلک پیما
۱۴ اکتوبر ۱۹۳۵ء

مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام لالہ گوپال داس مینیجر چھپی اور سید منظور حسین نے شائع کی ۔